جدید شعرائے اردو



مُتاخّرین

Ferozsons Limited

جدید
شعرائے اردو

تیسرا حصہ

متاخرین

اردو ادب میں جدید شاعری کے بانیوں کے
حالاتِ زندگی، کلام پر بے لاگ تبصرہ اور
انتخابِ کلام

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی منگلا پشاور حیدرآباد کراچی

پہلی بار ——— ۱۹۶۹ء
تعداد ——— ۲۵۰۰
قیمت ——— 12.00

مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ - لاہور • باہتمام: عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

ترتیب

زیر نظر کتاب ”جدید شعرائے اردو“ سالوں کی محنت اور ہزاروں روپے کی لاگت کے بعد چھپ کر دفتری خانے میں جلد بندی کے لئے پہنچی ہی تھی کہ ”فیروز سنز“ کا مطبع سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا، جس سے چھپی ہوئی کتاب کا اکثر و بیشتر ایڈیشن اس سے متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ ضائع ہو گیا۔ اس میں سے کچھ نسخے کافی تلاش و تجسس کے بعد جمع کئے گئے ہیں جو آپ کے پیش نظر ہیں۔ ان میں بھی آپ کو کہیں کہیں سیلاب زدگی کے اثرات نظر آئیں گے۔

اُمید ہے کہ آپ ان جبری کوتاھیوں کو نظر انداز فرماتے ہوئے اس کی افادیت کو پیش نظر رکھیں گے۔

عبدالوحید

تعداد ——— ۲۵۰۰

قیمت ——— 12.00

مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ - لاہور • باہتمام: عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

ترتیب

جگر مراد آبادی

علی سکندر نام - جگر تخلص - ۱۸۹۰ع میں مراد آباد میں پیدا ہوئے - والد علی نظر نظر شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی ، صاحب دیوان شاعر تھے - مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے اور شہنشاہ شاہ جہان کے اُستاد تھے - عتاب شاہی کے باعث ترک وطن کرکے مراد آباد میں آباد ہو گئے - وہیں جگر کی ولادت ہوئی - جگر کی ابتدائی تعلیم غیر مستقل طور پر ہوئی - فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں ، پھر میٹرک تک انگریزی پڑھی - البتہ ذوق سخن ترکہ میں پایا - ابتداً اپنے والد سے مشورہ سخن کیا - ان کے بعد داغ سے فیض پایا - کچھ غزلیں تسلیم کو بھی دکھائیں - ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ غالب ہے -

تین مجموعے ''داغ جگر'' ، ''شعلہ طور'' اور ''آتش گل'' شائع ہو چکے ہیں - ''شعلہ طور'' کا آخری ایڈیشن جگر صاحب کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۲ع میں دوبارہ شائع ہؤا اور نیا مجموعہ ''آتش گل'' ۱۹۵۴ع میں چھپا -

جگر عصر حاضر کے بڑے کامیاب غزل گو ہیں اور ان کی غزل قدیم رنگ تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا مخلوط نمونہ ہے، جس میں میر کا سوز، غالب کا تفکر، مومن کی رنگینی اور داغ کی زبان کی تمام کیفیات بہت ستھرے اور جامع انداز میں یکجا ہو گئی ہیں۔ یہی وہ خصوصیات کلام ہیں جن کی بدولت جگر حسرت، فانی اور اصغر جیسے باکمال اساتذہ کی موجودگی میں غزل کے اُفق پر اُبھرے اور نقادان فن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان چاروں شعرا کو اُردو غزل کے عصر حاضر کے عناصر اربعہ قرار دیں۔

جگر کو اصغر سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ نفاست خیال اور ایک حد تک رنگینی کے اعتبار سے جگر کے کلام کو اصغر سے مناسبت بھی ہے، مگر اصغر کے فلسفیانہ خیالات نے ان کی شاعری کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اصغر زندگی کے خوشگوار اور سنگین دونوں پہلو پیش کرتے ہیں۔ لیکن جگر زیادہ تر خوشگوار پہلو سے متاثر ہوئے ہیں۔

جہاں تک اسالیب بیان کا تعلق ہے جگر کے اسالیب اصغر سے زیادہ صاف اور سیدھے ہیں ۔ آنکی شاعری ایک ایسی تصویر ہے جو بنی تو سادہ رنگوں سے ہی ہے مگر ان رنگوں کی باہمی آمیزش میں مصور کی رنگینی طبع اور چابکدستی جھلکتی ہے ۔

جگر واردات حسن و عشق، کیف و سرور میں ڈوب کر بیان کرتے ہیں ۔ آنکی شاعری ''قال'' نہیں سراپا ''حال'' ہے اور اسی لئے اس میں زندگی کی تازگی و حرارت موجود ہے ۔ جگر کی غزلیات میں تغزل کی صحیح جان موجود ہے ۔ ان میں عشق کا تمام سرور و مستی اور حسن کی تمام رنگینی و رعنائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جگر نے ہماری غزل کو حافظ کی رنگینی و سر مستی عطا کی ۔ جگر کے یہاں ہمیں وہ تندی و تیزی بھی ملتی ہے جو بقول غالب آبگینہ کو تندئ صہبا سے پگھلا دیتی ہے ۔

جگر کے کلام کی سادگی، روانی اور نزاکت دراصل داغ جیسے یگانہ فن کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے ۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جگر کے کلام میں داغ کا رنگ زیادہ نکھر گیا ہے ۔ داغ بہت ہی پر گو شاعر تھے جنہیں ایک سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور اسکے مقابلے میں جگر کی شعری کائنات مختصر ہے جسے داغ مقطر کہا جا سکتا ہے ۔ داغ کے بعد ان کے رنگ میں بہت سے شاعروں نے کہا لیکن انفرادی حیثیت جگر ہی کو حاصل ہوئی ۔

جگر کی موجودہ مصروفیات اور احباب کی صحبتیں انہیں فکر سخن کا بہت کم موقعہ دیتی ہیں ۔ حتیٰ کہ اب مشکل سے سال میں وہ ۴ یا ۶ غزلیں کہہ پاتے ہیں بہر صورت اب وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں انتخاب ہوتا ہے ۔ ان کے رنگ میں متانت و پختگی بڑھتی جا رہی ہے ۔ تخیل میں رفعت اور جذبات میں جوش و صداقت کا اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ حقائق و معارف کی شاعرانہ رنگینی سے کلام میں گہرائی، گیرائی اور عمق بڑھ رہا ہے ۔ ان کی ایک تازہ غزل کے چند شعر دیکھئے :-

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن — لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کامل رہبر، قاتل رہزن — دل سا دوست نہ دل سا دشمن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے — عشق ہے کار شیشۂ و آہن
خیر مزاج حسن کی یا رب — تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے — ہجر کی رات اور اتنی روشن

قطعہ

کام ادھورا اور آزادی — نام بڑے اور چھوٹے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایۂ ہے لیکن روشن روشن

صرف ان چند اشعار سے ہی پتہ چل سکتا ہے کہ اب جگر کو صنف غزل پر کس درجہ عبور حاصل ہو چکا ہے ۔ اور وہ اس صنف کے حدود میں حسن و عشق کے

نغموں کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی تاثرات کو کیسے دل نشیں انداز میں سمونے پر قادر ہو چکے ہیں۔

انتخاب کلام

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ہر جنت نگاہ پہ مائل بنا دیا
میرا ہی مجھ کو مد مقابل بنا دیا

دکھلا کے ایک جلوہ سراپائے حسن کا
آنکھوں کو اعتبار کے قابل بنا دیا

اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار
اس نے بھی انداز دل پیدا کیا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کارفرما کا
وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشر در آغوش خیال
حسن کیا؟ خواب ہے اک چشم تماشائی کا

ایسا کہاں بہار میں رنگینوں کا جوش
شامل کسی کا خون تمنا ضرور تھا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبط حسن و عشق
شوق نارسا اپنا، ناز کامیاب ان کا

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا

عرض غم نہ کر اے دل، دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اُنہ" کر کے سن لیا جواب ان کا

تو جگر جو رسوا ہے، تو ہی آہ رسوا رہ
نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب ان کا

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر — نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں — کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

اب اُنکا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ ، اے غم محبت تجھ کو گلے لگائیں
اس سے بھی شوخ تر ہیں اُس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا ، لیکن نظر نہ آئیں
اُس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں ، دامن کو بھی بچائیں
عاشق خراب مستی ، زاہد خراب تمکیں
وہ بھی ترے کرشمے ، یہ بھی تری ادائیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
یہ ناز حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر — نظر ملاتے نہیں ، مسکرائے جاتے ہیں
میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی — تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

آ کہ تجھ بن اسطرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
میری ہستی شوق پیہم ، میری ہستی اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
ایک دل ہے اور طوفان حوداث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اوس پڑے بہار پر ، آگ لگے کنار میں — تم جو نہیں کنار میں خاک نہیں بہار میں
اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں — آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں
غیرت دل بجا سہی ، غیرت عشق کیا ہوئی — ہائے وہ کیف شبنمی دیدۂ اشکبار میں

میکشو ! مژدہ کہ باقی نہ رہی قید مکاں — آج اک موج بہا لے گئی مے خانے کو
غیر از دوست نہ تھا ہستئی عاشق کا وجود — کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

کوئی گناہ نہیں شوق دید و ذوق نظر
مگر جو فرصت نظارگی کو طول نہ ہو

تری چشم مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش، یہ سب جنوں، اسی ایک گردش جام سے
یہ کتاب دل کی ہیں آیتیں، میں بتاؤں کیا جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو، ترے نقش ہائے خرام سے
وہیں چشم حور پھڑک گئی، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بہ یک جو چھلک گئی کسی رند مست کے جام سے

عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے
حال بھی، ماورائے حال بھی ہے
شان بے تابی جمال بھی ہے
دل کے ہر اضطراب نازک میں
میری رعنائی خیال بھی ہے
حسن کے ہر جمال میں پنہاں

یہ کیا مجال کہ ہم ترک التجا کرتے
دھن کو سی بھی جو لیتے نظر کو کیا کرتے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لا محدود
مجھے حریف مقابل بنا دیا تو نے
جمال حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے
خوشا وہ درد محبت، زہے وہ دل کہ جسے
ذرا سکون ہوا گدگدا دیا تو نے
ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد
اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا
دل کو نہ چھیڑ اے غم فرقت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا
اٹھے ہیں تیری راہ میں جب سے مرے قدم
احساس قرب و دوریٔ منزل نہیں رہا

ہزاروں قربتوں پر یوں مرا مہجور ہو جانا ٗ
جہاں سے چاہنا آن کا وہیں سے دور ہو جانا
نقاب روئے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا
مبارک اپنے ہاتھوں حسن کو مجبور ہو جانا
سراپا دید ہو کر غرق موج نور ہو جانا
ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دور ہو جانا
نہ دکھلائے خدا' اے دیدۂ تر دل کی بربادی
جب ایسا وقت آئے پہلے تو بے نور ہو جانا
جو کل تک لغزشِ پائے طلب پر مسکراتے تھے
وہ دیکھیں آج ہر نقش قدم کا طور ہو جانا
محبت کیا ہے؟ تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں؟
ترا مجبور کر دینا' مرا مجبور ہو جانا
محبت عین مجبوری سہی لیکن یہ کیا باعث
مجھے باور نہیں آتا مرا مجبور ہو جانا
نگاہ ناز کو تکلیف جنبش تا کجا آخر
مجھی پر منحصر کر دو مرا مجبور ہو جانا
جگر وہ حسن یک سوئی کا منظر یاد ہے اب تک
نگاہوں کا سمٹنا اور ہجوم نور ہو جانا

ہم نہ مرتے ترے تغافل سے پرسش بے حجاب نے مارا
چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا اس ادائے حجاب نے مارا
پاتے ہی اک اشارۂ نازک دم نہ پھر اضطراب نے مارا
دل کہ تھا جان زیست آہ جگر
اسی خانہ خراب نے مارا

میرا جو حال ہو سو ہو' برق نظر گرائے جا
میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا
دل کے ہر ایک گوشہ میں آگ سی اک لگائے جا
مطرب آتشیں نوا! ہاں اسی دُھن میں گائے جا
لحظہ بہ لحظہ' دم بدم' جلوہ بہ جلوہ آئے جا

تشنۂ حسن ذات ہوں ، تشنہ لبی بڑھائے جا
جتنی بھی آج پی سکوں ، عذر نہ کر پلائے جا
مست نظر کا واسطہ مست نظر بنائے جا
لطف سے ہو کہ قہر سے ، ہوگا کبھی تو روبرو
اُس کا جہاں پتا چلے ، شور وہیں مچائے جا
عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر
وہ تجھے آزما چکا ، تو اُسے آزمائے جا

شکست توبہ

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
سرمستی ازل جو مجھے یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگی خاطر ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جان میکدہ کی قسم بارہا "جگر"
کل عالم بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

وہی ہے عشق ، وہی حسن ہے ، وہی سب کچھ
مگر ، کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا
اُمید ہے تری رحمت اسے بھی دھو ڈالے
وہ اک گناہ جو غرق شراب ہو نہ سکا

تصویر و تصوّر

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قد بالا ، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش ، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

خرام رنگیں نظام رنگیں پیام رنگیں کلام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر تمام رنگینوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
بہار، رنگ و شباب ہی کیا ستارۂ ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اُبل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے دامان گل پہ شبنم
یہ گرمئی حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں
یہ موج دریا، یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی یہ دیکھتا ہوں نئی تجلّی
طلسم صورت مٹا رہے ہیں جمال معنی بنا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے زبان پر سوزِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے "جگر" کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشم توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی
فسردہ خاطرئ عشق اے معاذ اللہ
خیال یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی
تری نگاہ کرم کو بھی آزما دیکھا
اذیتوں میں نہ ہونی تھی کچھ کمی نہ ہوئی
صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے، یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی
ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی
خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے

ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی
گئے تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

مجھے ہلاک فریب مجاز رہنے دے
نہ چھیڑ او نگہ امتیاز رہنے دے
میں راز عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں
مگر جو مصلحت حسن راز رہنے دے
یہ بات کیا کہ حقیقت وہی مجاز وہی
مجاز ہے تو پھر اسکو مجاز رہنے دے
یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا تو اے زاھد !
یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے
گزرتی ہے جو دل عشق پر نہ پوچھ جگر
یہ خاص راز محبت ہے راز رہنے دے

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی
خیر یا رب نظام عالم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی
کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی
آئی تھی آج بھی نسیم سحر
آگ بھڑکا گئی جہنم کی
اللہ اللہ ہستئ شاعر
قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

کسی صورت نمود سوز پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی
جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیونکر جی بہلائے — غم بھی جس کو راس نہ آئے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت — روح اگر تسکین نہ پائے
حسن وہی ہے حسن جو ظالم — ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے
ضبط محبت، شرط محبت — جی ہے کہ ظالم آمڈا آئے
نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو — روح سنے اور روح سنائے
راہ طلب آسان ہوئی ہے — زلف و مژہ کے سائے سائے

تیرا تصور شب ہمہ شب — خلوت غم بھی بزم طرب
دعوئِ شوق اور شکوہ بلب — شرم دلِ آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مست شباب — شیشہ بدست و نغمہ بلب
بیت گئی، جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور آخر شب
حسن مکمل جذب و گریز — عشق مسلسل ترک و طلب
ترک طلب اور اطمینان — دیکھ تو میرا حسنِ طلب

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھِل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمع دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

نہ جانے آہ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقام حیات پا نہ سکے

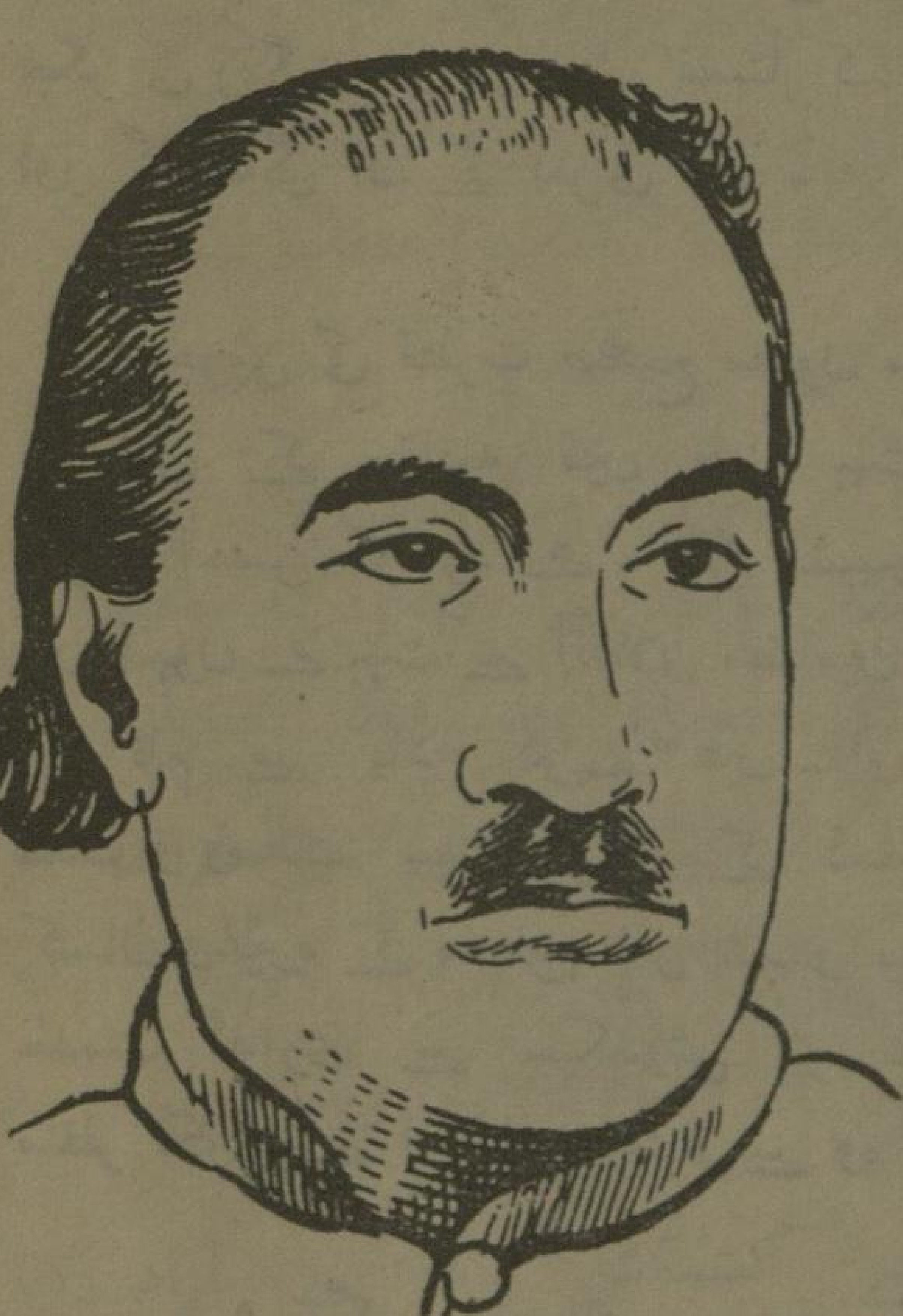
مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن
مرے خلوص محبت سے بچ کے جا نہ سکے

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد میری گرد کو بھی پا نہ سکے

سراپا حقیقت ، مجسم فسانہ
محبت کا عالم ، جنوں کا زمانہ
وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادا بے تعلق ، نظر محرمانہ
نظر آٹھتے آٹھتے ، نظر ملتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ
طبیعت شگفتہ ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش ، مگر والہانہ
وہ شعر و ترنم کا پرکیف موسم
وہ اشک و تبسّم کا رنگیں فسانہ
غرور تجمل ، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت ، مگر فاتحانہ

یہ ترا جمال کاکل ، یہ شباب کا زمانہ
دل دشمناں سلامت ، دل دوستاں نشانہ
مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی ہے ، وہ نگاہ ناقدانہ
مری زندگی تو گذری ترے ھجر کے سہارے
مری موت کو پیارے کوئی چاہئے بہانہ
میں وہ صاف ھی نہ کہدوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد ، درد تنہا ، مرا غم ، غم زمانہ
مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا ؟
مجھے اے "جگر" مبارک ، یہ شکست فاتحانہ

جوش ملیح آبادی



شبیر حسن خاں نام جوش تخلص ''شاعر انقلاب'' خطاب ' ملیح آباد (اودھ) کے رہنے والے قصبہ ''کنوھار'' میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ بزرگ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ اُن کے والد بشیر احمد خاں بشیر اور دادا نواب محمد احمد خاں احمد دونوں صاحب دیوان شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا (شاگرد ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پلے بڑھے۔ ایسی صورت میں اُن کا نو سال کی عمر میں شعر گوئی اختیار کر لینا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ ابتداً چار سال تک جناب عزیز لکھنوی سے تلمذ رہا۔ پھر اُستاد موصوف کی اُستادی کا میدان اپنی جولانیٔ طبع کے لئے تنگ محسوس کرتے ہوئے اپنے ذاتی ذوق و وجدان کی رہبری ہی کو کافی سمجھا۔

تعلیمی اعتبار سے جوش نے شروع میں گھر پر اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں پھر انگریزی کے لئے سیتاپور اسکول ' جوبلی اسکول لکھنؤ ' سینٹ پیٹرز کالج آگرہ اور علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے مگر اپنی لا اُبالی طبیعت اور کچھ گھریلو مصروفیات کے باعث تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ ۱۹۲۴ء میں جوش سرکار نظام میں دارالترجمہ سے متعلق ہو گئے اور ۱۹۳۴ء میں ناظر ادب کے عہدے سے علیحدہ ہوئے۔ کچھ عرصہ دلی سے اپنا ایک ادبی رسالہ ''کلیم'' نکالتے رہے۔ آجکل ہندوستان کے معروف سرکاری رسالہ ''آجکل'' کے مدیر اعلیٰ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جوش عصر حاضر کے اُن شعرا میں سے ہیں جو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور بقول آل احمد سرور صاحب ''اقبال کے بعد شاید یہی غزل کو نظم کا تسلسل اور کائناتی لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں'' اُن کی غزل میں صفائی ' روانی اور سلاست کے ساتھ ایک طرح کی بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے۔ عشق و رندی اُن کی غزل کا خاص موضوع ہے شاید اسی لئے وہ خود کو ہمتائے ''حافظ شیراز'' کہتے ہیں۔

آرہی ہے صدائے ہاتف غیب　　　جوش ' ہمتائے حافظ شیراز

اُن کی ترکیبوں میں بندش کی چستی و دل کشی ہے اور وہ صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز بھی نہایت سادگی سے نظم کرتے ہیں مگر اُن کے رنگ میں اپنے ہم عصر جگر کی رنگینی و سرمستی نسبتاً کم ہے - اور حق تو یہ ہے کہ غزل کی شیرینی، نرمی اور گداختگی اُن کے بس کی نہیں -

جوش کی فطرت صحیح معنوں میں نظم کے لئے موزوں ہے چنانچہ نظم میں اُن کا رتبہ غزلگوئی کے مقابلہ میں یقیناً بہت بلند ہے - اُنکی نظموں میں جوش، سادگی اور صداقت بدرجۂ احسن موجود ہے - اُنکی تشبیہات میں ایک طرح کی ندرت پائی جاتی ہے - نظموں میں اُنہوں نے بہت سے انقلابی مضامین سموئے ہیں - اس لئے لوگ اُنہیں اکثر ''شاعر انقلاب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں - اور اس دور میں ہماری شاعری کے سیاسی رجحان میں شدت و وسعت پیدا کرنے کے ذمہ دار بڑی حد تک جوش ہی ہیں - اُنہوں نے مزدور و کسان وغیرہ کے متعلق اس شد و مد کے جذبات نظم کئے ہیں کہ شاعری کو حق خدمت گذاری سے سبکدوش کر دیا - جوش کی منظومات کی ایک اور خصوصیت اُنکی منظر نگاری ہے اور اس اعتبار سے وہ اُردو کے تمام شعرا میں امتیازی شان رکھتے ہیں -

جوش کو رباعیات سے بھی خاصا شغف ہے اس صنف سخن میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اُسکے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی، وسعت اور تنوع پیدا کر دیا ہے - حقائق و معارف، حسن و عشق، خمریات، طنزیات غرضکہ کیا نہیں ہے جو اس مختصر صنف شعر میں اُنہوں نے نہیں سمویا ہے - چنانچہ جوش کی محض رباعیات کا ایک مجموعہ ''فن و حکمت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے -

کلام جوش کے انتخابات جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں - جوش کی شاعری کا سب سے پہلا مجموعہ ''روح ادب'' کے نام سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا - جو دراصل اُن کے بالکل ابتدائی کلام کا انتخاب تھا جس میں جوش کا انداز بالکل تقلیدی تھا اور اشعار میں تصوف کی جھلک بھی زیادہ تھی - اُسکے بعد نقش و نگار، شعلہ و شبنم فکر و نشاط، حرف و حکایت، جنون و حکمت، سیف و سبو اور آیات و نغمات مختلف اوقات میں شائع ہوئے اور جوش کی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے سوائے ''روح ادب'' کے جسکی دوبارہ اشاعت شاید خود جوش کو منظور نہ تھی باقی تمام انتخابات کے اب تک کئی کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں -

جوش کی منظومات کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا باقی ہے اور وہ ہے اُنکا ''شبابیات'' کا موضوع - جوش کیلئے یہ موضوع سچ مچ مخصوص سمجھنا چاہئے کیونکہ اس مبحث پر وہ اپنے حقیقی رنگ و مذاق میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں - لیکن اس خصوصیت کے باعث بعض ناظرین نے اُنہیں ''لذت پرست'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے -

بحیثیت مجموعی جوش عصر حاضر کے صاحب طرز اور کامیاب شعرا میں ہیں اور اُنہیں جیسی مقبولیت اب حاصل ہو چکی ہے اچھے اچھے شعرا کو اپنی زندگی میں نصیب نہیں ہو سکی -

انتخاب کلام

تغزل

محفل عشق میں وہ نازش دوراں آیا
اے خدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے کلی ناز سے کھِل، بادۂ سر جوش آبل
کہ نگار چمن و شاهد مستاں آیا
خاطر جمع سے هشیار کہ برهم هوئی زلف
کشش دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
کج کلاهی کا سرو برگ مبارک اے جوش
لے، پیام شکن طرۂ جاناں آیا

سوز غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دهر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
اتنا مانوس هوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا، مجھ سے کچھ ارشاد کیا
مجھ کو تو هوش نہیں، تم کو خبر هو شاید
لوگ کہتے هیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

قدم انساں کا راہ دهر میں تھرّا هی جاتا ہے
چلے کتنا هی کوئی بچ کے، ٹھوکر کھا هی جاتا ہے
نظر هو خواہ کتنی هی حقائق آشنا پھر بھی
هجوم کشمکش میں آدمی گھبرا هی جاتا ہے
خلاف مصلحت میں بھی سمجھتا هوں مگر ناصح!
وہ آتے هیں تو چہرے پر تغیّر آ هی جاتا ہے
سمجھتی هیں مآل گل، مگر کیا زور فطرت ہے
سحر هوتے هیں کلیوں کو تبسم آ هی جاتا ہے

جہنم سرد ہے جنّت کے در کھلوائے جاتے هیں
سرِ محشر پجاری حسن کے بلوائے جاتے هیں
سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے همراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے هیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! میری آنکھونمیں آنسو آئے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیّت کی
بدی کرتا ہے دشمن ، اور ہم شرمائے جاتے ہیں

چشم حواس بند ہے ، مست ہوں سوز و ساز سے
ملنے چلا ہوں اسطرح حسن جنوں نواز سے

فنا ہو جا چھلک اٹھے گا سینہ نور عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ غافل داغ ہستی ہے

میرے حواس ے لئے ، یار کی چشم مست نے
فتح کا تاج رکھدیا سر پہ میرے شکست نے
طعنۂ خود سری دیا عشق جنوں پرست نے
راہ وفا میں کھو دیا فکر بلند و پست نے
سر پہ ترے رہیں سدا پھولوں کے تاج فصل گل!
روح کو مست کر دیا تیری ہوائے مست نے
نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ھنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے
جا کے نسیم جاں ستاں! کہنا یہ بزم حسن میں
بھیجا ہے تحفہ و سلام ، جوش سحر پرست نے

منظومات

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت ، جبیں سے زلفیں ھٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں ، اُفق کی لو تھر تھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارہ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کو مد نظر ہیں کتنی رعائتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، گلاب کی پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ آوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے

سرا دُلائی کا سر پر نظر جھائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مہر خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پر دمک نظر میں شراب

قدم قدم پہ تمنائیں دلستانی کی..
رخ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی

شراب ناب لئے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں، نرگسی کٹوروں میں

دلہن زلف میں جادو سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیم صبح بنارس ، ہلال شام اودھ
ہوائے صبح سے روشن چراغ سیم تنی
شگفتہ ، غسل سحر سے مزاج گلبدنی
نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادر آبی
بیاض چشم میں گل کاری شکر خوابی
خُنک نسیم سے ابھرے ہوئے نقوش شباب
صباحتیں ہیں کہ برسات کی شب مہتاب
عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہی ہے ہوا کمسنی کی خوشبو سے
مقابلہ جو کرے کوئی چاند ، پھیکا ہے
جبیں شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے
نمی ہے زلف میں اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے ؟
سیاہ زلف پہ آنچل خفیف آبی ہے
برہنہ پا ہے تو ہر نقش پا گلابی ہے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرم خطاب
کہ وقت صبح ہے اے دختر شب مہتاب
ازل کے دن سے در حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر ، میں ترا پجاری ہوں ؟

شکست زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے ، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی !
سینوں میں تلاطم بجلی کا ، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے ، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے ، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے ، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے ، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا اُن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ ' برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے ہیں
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ زنداں گونج اُٹھا ' جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ' دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

رباعیات

بیلوں میں چھلک رہی ہیں بوندیں ساقی
خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں ساقی
دے جام کہ برگ ہائے سبز و تر پر
رہ رہ کے کھنک رہی ہیں بوندیں ساقی

اے پھول صبا ہمیشہ مہکائے تجھے
اے چاند کبھی گھٹا نہ سنولائے تجھے
اس نیند بھرے لوچ سے لِلّٰہ نہ چل
ڈرتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

غنچے ! تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسّم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

افسوس تجھے پیر دغا دیتے ہیں
کب تیری عقیدت کا صِلا دیتے ہیں

منعم ! یہ تجھے نہیں لگاتے ہیں گلے
سینے سے تری جیب لگا لیتے ہیں

آلام کہن کی یاد آتی ہے مجھے
دیرینہ محن کی یاد آتی ہے مجھے
افسانہ جہنّم کے فرشتوں کا نہ چھیڑ
ارباب وطن کی یاد آتی ہے مجھے

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
تفسیر مآل شادمانی کر کے
تو آتش دوزخ سے ڈراتا ہے اُنھیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالم سعی و کاوش میں دم بھر بھی ہمیں آرام نہیں
چھائی ہے جہاں پر تشنہ لبی مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر روح میں اک بے تابی ہے
اس بزم خلش کا ہر ذرہ بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے اک لرزش پنہاں کوہ میں ہے
لیلائے ساعت مضطر ہے عشرت کے ترانے سُننے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چننے کو
ہیجان ہے چشم پستی میں رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
اک دُھن ہے ترقی کرنے کی اک جوش ہے آگے بڑھنے کا
ہر موم کو دُھن ہے شمع بنے مضطر ہے پگھل جانے کیلئے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے آتش میں بدل جانے کے لئے
انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں بجلی پہ تفوّق پانے کو
چنگاریاں مرغ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کِھل جانے کو

بے چین بگولہ رقصاں ہے آدمی پہ شرف پانے کے لئے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے' دھارے سے اُلجھ جانے کیلئے
ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے موتی پہ تسلّط پانے کو
ہر ذرّۂ خاکی اُڑتا ہے خورشید سے ٹکر کھانے کو
ہر دل میں غرض اک کاهش ہے اُمید کا ساغر بھرنے کی
ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواهش ہے ترقی کرنے کی
وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے
اک ایسی ہی خواهش اُس کو بھی چوری کے لئے اُکساتی ہے
جس طرح کی خواهش نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے
سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اُس نے قسمت سے تسکین کا رشتہ کھویا ہے
رهبر ہو کہ رهزن دونوں میں تسکین کی خواهش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے
عارف نے یہ سمجھا آسائش اشکوں کو گرا کے ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانے میں مل جائے گی
مے کش کی سمجھ میں یہ آیا میخانے میں مل جائے گی
پس ذوق طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا میخانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم تریں انسانوں میں
جال اس پہ نہ ڈال اے صید افگن یہ بام حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گمراہ نہیں ہے زائر ہے
جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواهش ہی کے زیر فرماں ہیں
ہر جرم سیہ کے محضر پر خواهش ہی کی مہریں تاباں ہیں
المختصر ان تشریحوں سے ہم پر یہ حقیقت کُھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں بدی بھٹکی ہوئی وہ اک نیکی ہے

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہے پیر مغاں کیا کہنا
وهی دفتر ہے وهی مُہر و نشاں کیا کہنا

عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمع جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

کب سے تقویٰ ہے مزامیر و ترنم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوب جہاں کیا کہنا

کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمان سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا

ذرے ذرے پہ جہنم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا

کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغ سراب
وہی رونق ہے سر آب رواں کیا کہنا

عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وہی نالے ہیں وہی شور فغاں کیا کہنا

کب سے ہے ذوق نظر حسن شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسن جواں کیا کہنا

آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری میں
چشم انسان ہے ہر سو نگراں کیا کہنا

ہاں بہ ایں شدتِ آیات و احادیث حجاب
دست خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا

شبنم و برف کے اس حلقۂ غم ناک میں بھی
اٹھ رہا ہے دل انساں سے دھواں کیا کہنا

تُرش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندان جہاں کیا کہنا

کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہان گزراں کیا کہنا

سینۂ دھر ہے گو تیر حوادث سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا

کب سے ہے نطق رسالت پہ رواں ہجوِ شراب
وہی ہلچل ہے سر کوئے مغاں کیا کہنا
للہ الحمد کہ خود حکم خدا کے با وصف
ہے وہی گرمئی بازار بتاں کیا کہنا
آفریں باد کہ اس جبر مشیّت پہ بھی ہے
دست انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

حسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غم ناک میں
ہو رہا ہے جذب مہر خوں چکاں کے رُو برو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکل عنبر سرشت
ہو رہا ہے کم سنی کا لوچ جزو سنگ و خشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چنپئی رخسار کی
غم کے بادل خاطر نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارض رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے رنگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب
اُف یہ ناداری مرے سینے سے اُٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں
حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دست نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جھک جائے وہ گردن تف اے لیل و نہار
جس میں ہونا چاہئے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار

آسماں جان طرب کو وقف رنجوری کرے
صنف نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

بھیک میں وہ ھاتھ اُٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
اُن سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لئے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لئے

مفلسی چھانٹے اُسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستان طرب کے واسطے

فرط خشکی سے وہ لب ترسیں تکلّم کے لئے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسّم کے لئے

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاھیئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاھیئے

حفیظ جالندھری



محمد حفیظ ' نام ' حفیظ تخلص ' ابوالاثر کنیت ۱۹۰۰ء میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے - اُن کا خاندان چوہان' سورج بنسی راجپوت خاندان کی ایک شاخ ہے جو تقریباً دو سو سال قبل مسلمان ہو گیا تھا - حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی ' حفیظ دور جدید کے اُن معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے اپنی شخصیت ' شاعرانہ مقام اور شہرت ' خاندانی امارت و وجاہت سے نہیں بلکہ محض اپنی کوشش و کاوش اور محنت و جانفشانی کی بدولت حاصل کی ہے - اُنہیں شروع ہی سے علمی و ادبی مشاغل سے دلچسپی تھی چنانچہ اُنہوں نے لاہور میں ''ہونہار بکڈپو'' قائم کیا اور ادبی کتب کی طباعت و اشاعت میں مصروف رہے - دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وہ دھلی میں سانگ پبلسیٹی آرگنائزیشن (Song Publicity Organisation) کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے اور کافی عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - تقسیم ہند کے بعد حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر میں اُنکی خدمات حاصل کیں اور کئی سال تک حفیظ پبلسیٹی کے کام کی نگرانی کرتے رہے - لیکن ان تمام مصروفیات اور اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے باوجود اُنکی ادبی دلچسپیوں میں کوئی فرق نہیں آیا -

حفیظ کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا - وہ مولانا غلام قادر گرامی کے شاگرد ہیں - جنکی رہنمائی اور فیضان صحبت نے حفیظ کو غزل سرائی سکھائی اور شعری صنعت گری پر عبور عطا کیا - لیکن جہاں تک طرز فکر کا تعلق ہے حفیظ اقبال سے بہت متاثر ہوئے - جسکے ثبوت میں اُنکی بعض نظمیں ''زندگی'' یا ''آزاد وادی'' اور غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں جو بالکل اقبال کے انداز میں کہی گئی ہیں -

در حقیقت حفیظ شعرا کے اُس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ارتقا عظمت اللہ خاں کے نقطۂ خیال کی اشاعت کے بعد ہوا اور جسکی بڑی خصوصیت ہندی بحروں کو اُردو میں رائج کرنا اور شعر میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنم و حسن خیال پیدا کرنا ہے - یہی وجہ ہے کہ حفیظ کے یہاں ہندی کے نرم و شیریں الفاظ ' بول چال کی زبان ' لمبی لمبی بحروں اور موسیقیت کی بہتات ہے - اُنکی غزلوں میں نہ نئے مضامین ہیں نہ نئے اسالیب ' مگر سادگی و دلکشی ضرور نئی ہے - حفیظ شروع شروع میں اپنے گیتوں

کی وجہ سے مشہور ہوئے جن میں آرزو اور اختر کا سا سریلا پن پایا جاتا ہے۔ پھر اُن کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''نغمہ زار'' ۱۹۲۵ء میں چھپا جسکی نظموں میں خیال کی رعنائی جذبات کی فراوانی اور ترنم ریزی نے نئی پود کو بہت متاثر کیا۔ حفیظ کی اس دور کی منظومات میں نئی طرز کی بعض پسندیدہ جدتوں کے ساتھ ساتھ پرتاثیر نغمگی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اُنکی ایک نظم کا یہ اقتباس دیکھئیے۔

اُٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاج زر
لباس نور زیب بر
چڑھی فراز کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے
وہ عکس جلوہ گاہ سے سحاب نور بن گئے
نوائے جوئے بار اُٹھی
صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رباب اُٹھے خوش آمدید کے لئے
اُٹھی حسینہ سحر پہن کے سر پہ تاج زر

''نغمہ زار'' کے بعد حفیظ کے دو اور مجموعے ''سوز و ساز'' اور ''تلخابہ شیریں'' شایع ہوئے۔ جن میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بحروں میں حفیظ نے انسانی جذبات اور درد دل کی دھنوں اور گیتوں کو سانچے میں ڈھالا ہے۔ مگر حفیظ کا شاہکار اُن کی طویل نظم ''شاہنامہ اسلام'' ہے۔ جو تین جلدوں میں مرتب ہوئی ہے۔ حفیظ نے اپنی اس نظم میں اسلامی تاریخ مدون کر کے اسلامی شائستگی کا احیا بھی کیا ہے اور اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ بھی۔ اس میں شک نہیں کہ حفیظ اختصار کے پیش نظر بعض تفصیلات اس نظم میں پیش نہیں کر سکے اور اُنہوں نے واقعات، روایات اور معتقدات کے انبار سے شاعرانہ زاویے تلاش کر کے نظم مکمل کی ہے مگر بحیثیت مجموعی یہ نظم واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

''شاہنامۂ اسلام'' میں حفیظ نے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد رواں اور مترنم ہے۔ اقبال نے بھی اپنی بعض نظمیں بالخصوص ''طلوع اسلام'' و ''تصویر درد'' اسی بحر میں لکھی ہیں۔ اس خصوصیت کے علاوہ نظم میں واقعات کی ترتیب و تناسب اور بیان کی سادگی و سلاست نے شاہنامہ کی مقبولیت میں اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ نمونے کے طور پر خاتم المرسلین کی ولادت کے سلسلے میں ''شاہنامۂ اسلام'' کے چند شعر دیکھئیے۔

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنم ہی ترنم تھے، کنارے جوئباروں کے
ندا آئی، دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کریگی آج قدرت شان قدرت کے

ہوا عرش معلیٰ سے نزول رحمت باری
تو استقبال کو اٹھی، حرم کی چار دیواری
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے
جناب رحمۃ للعالمیں تشریف لے آئے
بصد انداز یکتائی، بغایت شان زیبائی
امین بن کر امانت، آمنہ کی گود میں آئی

انتخاب کلام

مجھے ذلیل نہ کر عذر لن ترانی سے
یہ اہل ذوق کی توہین ہے جواب نہیں
جو کامیاب محبت ہے سامنے آئے
میں کامیاب نہیں، ہاں میں کامیاب نہیں
اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں
سنا ہے میں نے بھی ذکر شراب و حور و قصور
خدا کا شکر ہے نیّت مری خراب نہیں

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
کس مصیبت میں جان ہے پیارے
رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات
یہ بڑی داستان ہے پیارے
تلخ کر دی ہے زندگی جس نے
کتنی میٹھی زبان ہے پیارے
جانے کیا کہہ دیا تھا روز ازل
آج تک امتحان ہے پیارے
کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ
تیرا اپنا گماں ہے پیارے
میں تجھے بے وفا نہیں کہتا
دشمنوں کا بیان ہے پیارے
تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ
ہر زمیں آسمان ہے پیارے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کرکے، مری سزا کا حساب کر دے
حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہہ جانا ہے

اے طائر جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے، دکھ سہنا ہے، غم کھانا ہے

ہم تری صورت انکار کو پہچانتے ہیں
وہ تبسم تو شریک لب گویائی کر

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں سے
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

غزلیات

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
مرے دیدۂ دل کو آباد رکھنا

ملیں گے تمہیں راہ میں بتکدے بھی
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ راتیں
تمہیں یاد آئینگے ہم یاد رکھنا

تمہیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے
اسی کو تہ تیغ بیداد رکھنا

الہی وہ برباد کرتا ہے مجھ کو
الہی اسے شاد و آباد رکھنا

جرم کو جوش ندامت میں ڈبونا چاہا
داغ ہے کوثر و تسنیم سے دھونا چاہا

عشق نے حسن کے افعال پہ رونا چاہا
تخم احساس مگر سنگ میں بونا چاہا

ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
نا خدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

سنگدل کیوں نہ کہیں بتکدے والے مجھکو
میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا

دیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرم عظیم
حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا

حضرت شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت
مے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا

پھر دم نزع توقع ہوئی دلداری کی
رکھ کے سر زانوئے دلدار پہ سونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیر کا لیکن تم نے باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چبھونا چاہا
جنس شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حفیظ
دولت وقت کو بے کار نہ کھونا چاہا

بتوں کو کبھی آپ سچا نہ جانیں نہ انکے دھن ھیں نہ انکی زبانیں
زمانے میں چرچے ھیں دیر و حرم کے بڑی رونقوں پر ھیں دونوں دکانیں
بتوں کی نگاھیں مجھے ڈھونڈتی ھیں فضاؤں میں جب گونجتی ھیں اذانیں
ھمیں پیار ھے آن سے ھم جانتے ھیں وہ سمجھیں نہ سمجھیں، وہ جانیں نہ جانیں
جوانی گئی پھر بھی ھم اور ناصح جہاں مل گئے چھڑ گئیں داستانیں

سرِ حشر کام آئی نہ مری سخن طرازی
کہ میں نامۂ عمل پر نہ شہید تھا نہ غازی
سر سر بلند میرا ھے نیاز مند تیرا
مرے ناز کو بھی دیکھے تری شان بے نیازی
فقط ایک بات کہکر کوئی بات ھے کہ چپ ھوں
مجھے بے زباں سمجھکر نہ کرو زباں درازی
نہ متاع نور حاصل نہ میں حور ھی سے واصل
نہ میں خود فریب واعظ نہ میں سادہ دل نمازی
مری زندگی ریا ھے مگر اسکا غم ھی کیا ھے
کہ ابھی بچھا ھوا ھے مرا دام پاک بازی

ھم ھی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ھمیں بھلا دیا، ھم نہ تمہیں بھلا سکے
تم ھی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھُلیگی پھر ھم نہ اگر سنا سکے
ھوش میں آ چکے تھے ھم، جوش میں آ چکے تھے ھم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے
رونق بزم بن گئے۔ لب پہ حکایتیں رھیں
دل میں شکایتیں رھیں، لب نہ مگر ھلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برھمئی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جسکی سمجھ میں آسکے

جاگ سوز عشق

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ کام دیوتا فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

پڑگئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے   ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے   راگ رنگ جاگ اُٹھے
جوگ سے ملے بھاگ
جاگ سوز عشق جاگ

منظومات

شام رنگیں

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے
رنگین بادلوں میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
عکس شفق نے کی ہے اسطرح زر فشانی
گھُل مِل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی
اوڑھے سیہ دوپٹے سر سبز وادیوں نے
زیور اُتار ڈالے گلزار زادیوں نے
چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا
چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے چلیں بسیرا
کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں
پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں
لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آوریں ہوا میں
خاموشیوں کی لہریں اُٹھنے لگیں فضا میں
گم ہو چلی ہے دنیا بکھرے ہوئے سکوں میں
دل غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں
کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں کام والے
چادر سروں پہ ڈالے کندھوں پہ ہل سنبھالے
اب شام آ گئی ہے جاگے ہیں بھاگ اُن کے
ہرسمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ ان کے
لے لے کے ڈھور ڈنگر چروا ہے آ رہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں
کمسن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کسطرح کٹا ہے
یہ بار بار باتیں یہ بار بار ہنسنا
یہ بے شمار باتیں یہ بے شمار ہنسنا
اک گدگدا رہی ہے اک کھلکھلا رہی ہے
اک بھر چکی ہے پانی گاگر اُٹھا رہی ہے
شرما کے اک نے اوڑھے منہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے
شرم و حیا کی سرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

شاہنامہ اسلام

(حضرت ہاجرہ کے قافلہ کا ایک منظر)

خدا کے حکم سے مرسل نے جب رخت سفر باندھا
جناب ہاجرہ نے دوش پر لخت جگر باندھا

پیمبر اپنا بیٹا اور بیوی ہم عناں لے کر
چلا سوئے عرب، پیری میں بخت نوجواں لے کر

خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر
معزز جس کو ہونا تھا زمینوں آسمانوں پر

چلا جاتا تھا اس تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر
جہاں دیتا ہے انساں موت کو ترجیح جینے پر

وہ صحرا جسکا سینہ آتشی کرنوں کی بستی ہے
وہ مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترستی ہے

وہ صحرا جسکی وسعت دیکھنے سے ہول آتا ہے
وہ نقشہ جسکی صورت سے فلک بھی کانپ جاتا ہے

جہاں اک اک قدم پر سو طرح جانوں پہ آفت تھی
یہ چھوٹی سی جماعت بس وہیں گرم مسافت تھی

پیمبر بیوی بچے کو لئے، قطع سفر کرتے
خدا کے حکم پر لبیک کہتے اور دکھ بھرتے

بالآخر چلتے چلتے آخری منزل پہ آ ٹھہرے
پئے آرام زیر دامن کوہ صفا ٹھہرے

یہ وادی جس میں وحشت بھی قدم دھرتی تھی ڈر ڈر کے
جہاں پھرتے تھے آوارہ تھپیڑے باد صرصر کے

یہ وادی جو بظاہر ساری دنیا سے نرالی تھی
یہی اک روز دین حق کا مرکز بننے والی تھی

وہ وادی جسمیں سبزہ تھا نہ پانی تھا نہ سایہ تھا
اسی کی جستجو میں اسطرف پیغبر آیا تھا

یہیں ننھے سے اسمٰعیل کو لا کر بسانا تھا
یہیں اپنی جبینوں سے خدا کا گھر بسانا تھا

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل
کوئی لہر اٹھتی نہیں اس بحر حیرت جوش میں
بزم انجم غرق ہے موسیقئی خاموش میں
کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوں انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے
رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات
شہ درے کے نوحہ خواں مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں
اس طرف سائے کو لپٹائے ہے پل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جز و کل سویا ہوا
اس طرف اجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اک گئے گذرے پرانے خواب میں مدھوش ہے
اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی نا شکیب و ناامید
سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد
اور ہوا کیا ہے، لب راوی پہ آہ سرد ہے
نغمہ سویا بربط آب رواں کی گود میں
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں
چاند بالائے فلک ہے چاند زیر آب ہے
چاند بھی ساکن ہے لیکن چاندنی بیتاب ہے
چاند کو گھیرے میں لیکر بہہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب اور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی
اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں
یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں
چپکے چپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں چلے آتے ہیں یہ
میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انھیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انھیں
دور افق پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رخ انور ہے میرے سامنے
میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں جہاں
حسرتیں امید کے جلوے دکھاتی ہیں جہاں

افسر میرٹھی

حامد اللہ نام افسر تخلص ۱۸۹۸ء میں اپنے وطن میرٹھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ ایک معزز و ممتاز مفتی خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۔ ابتدائی تعلیم مولوی احمد علی صاحب محدث سے حاصل کی ۔ پھر اُنھیں کی نگرانی میں آپ نے عربی و فارسی کی تعلیم مدرسۂ عالیہ عربیہ میرٹھ میں پائی ۔ اس کے بعد انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج میں ہوئی جہاں سے اُنھوں نے بی ۔ اے پاس کیا ۔ ویسے اُردو و فارسی زبانوں سے افسر صاحب کو بچپن ہی سے خاص مناسبت ہے چنانچہ ان زبانوں کی کتابیں اکثر آپ کے مطالعہ میں رہتی ہیں ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابتداً کچھ مدت تک آپ اخبار نویسی کرتے رہے ۔ آخر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں لکچرر مقرر ہو گئے جہاں آپ اپنے فطری ذوق و مناسبت کے ساتھ درس و تدریس اور ادبی خدمات میں مصروف رہے ۔ سنا ہے کہ حال ہی میں آپ اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور پنشن مل گئی ہے ۔

افسر صاحب کو شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا لیکن اس کو کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے ۔ سب سے پہلے بعض ہم جماعتوں کے اصرار سے ۱۹۱۶ء میں میرٹھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور جو غزل وہاں سنائی وہ بہت مشہور ہوئی تاہم اس مشاعرے کے بعد ایک مدت تک اُنھوں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی ۔ ویسے شعر گوئی کا شغل برابر جاری رہا ۔ افسر صاحب کو طرح پر شعر کہنے سے ہمیشہ اُلجھن رہی ہے ۔ اُن کی غزل گوئی کا طرز بالعموم یہ رہا ہے کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا پھر اُسی زمین میں اور شعر کہہ کر غزل پوری کر لی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اُنھیں نظم کے لئے پیدا کیا تھا اور وہ نظم اور گیت ہی کی دنیا سے غزل کے کوچے میں آ رہے ہیں ۔ اُن کا شمار عصر حاضر کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کے تجربات نے اُردو شاعری کو بعض نفیس اور مترنم بحروں سے روشناس کیا ہے اور جنھوں نے قدیم رسمی تغزل سے بغاوت کر کے ' نئے نئے موضوعات کو دلکش اسالیب کا جامہ پہنا کر جدید اُردو شاعری میں پیش کیا ہے ۔ افسر کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعر قدیم نظام عروض کی سختی کے ساتھ پابندی کے بجائے نئے نظام کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اس لحاظ سے افسر کو عظمت اللہ خاں کا ہمنوا کہا جا سکتا ہے چونکہ عظمت اللہ خاں نے شعر کی ظاہری شکل میں جو انقلاب پیدا کرنے کی کوشش شروع کی تھی افسر نے نہ صرف اُس سعی کو جاری رکھا بلکہ وہ اُن کے کلام میں بار آور بھی ہوئی ہے ۔

افسر کے تغزل کی ایک خاص خوبی اُس کی سادگی ہے ۔ اس سادگی میں اُنھوں نے ایک مخصوص نرمی اور دھیما پن سمو کر بڑی دلکشی اور حسن پیدا کر دیا ہے جسے نشتریت

کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ غزل میں قدیم اساتذہ کی بحروں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ نئے رحجان کے ماتحت الفاظ کو تھوڑا بہت کھینچ تان کر اپنے جذبے کے مطابق چھوٹی یا بڑی بحروں میں شعر کہتے ہیں اور اس سے بلا شبہ اُن کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اُن کی غزل حسن و عشق کی اتنی کہانی نہیں جتنی ایک حساس اور درد مند دل کی کہانی ہے۔

جہاں تک افسر کی منظومات کا تعلق ہے وہ باوجویکہ شکل و صورت میں حفیظ کی نظموں سے بہت مشابہ ہیں لیکن اپنی نوعیت و صناعی میں اُن سے بہت مختلف ہیں۔ حفیظ کے فکر و اُسلوب میں رنگینی ہے۔ اس کے برعکس افسر کے یہاں سادگی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سادگی میں بڑی رچی ہوئی نغمگی موجود ہے۔ افسر نے اپنی نظموں میں جذبات کی صورت گری اور خارجی مناظر کی عکاسی کچھ ایسی کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ اُن کی فنی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اُن کی نظموں میں بڑی روانی ترنم اور موسیقیت ہے اس سلسلے میں اُن کی ''تربینی'' ''دولت مند جوگی'' ''شب تاریک'' ''میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں'' وغیرہ جیسی نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

افسر کی نظموں کی ایک اور خوبی حب الوطنی کا احساس ہے۔ یہ احساس افسر نے اقبال، چکبست اور سرور جیسے شعرا سے ورثہ میں پایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وطن پرستی کا جذبہ اُس زمانہ میں عام ہو چکا تھا اور تقسیم سے پہلے تقریباً ہر شاعر ہندی نغموں کا راگ الاپتا تھا لیکن افسر کے ایسے نغمات اپنی شاعرانہ موسیقیت کے اعتبار سے بڑے دلدوز واقع ہوئے ہیں۔ اور ان میں افسر نے دوسرے شعرا کی طرح یاس افزا خیالات پیش کرنے کی بجائے شگفتہ جذبات کا اظہار کر کے انھیں رجائی بنا دیا ہے۔ شاید انھیں خصوصیات کے پیش نظر سر سلیمان نے افسر کی نظموں کے مجموعے ''پیام روح'' کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ ''افسر کا دل وطن کی محبت سے لبریز ہے۔ اس مجموعے میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ افسر کے یہ محبت بھرے نغمے ہمارے ملک کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جائیں'' بہر کیف یہ خواب تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا لیکن بایں ہمہ اس سے افسر کے وطنی نغموں کے اثر کو کوئی خاص ٹھیس نہیں پہنچی اور وہ اپنی شعریت و شگفتگی کی وجہ سے آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

افسر کا تعلق چونکہ محکمۂ تعلیم سے رہا ہے اور اُنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس کے مشغلہ میں گزارا ہے اس لئے اُنھیں بچوں کی نفسیات کا بخوبی علم ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے بچوں کے لئے بعض بہت ہی سہل، سادہ اور سلیس نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں بھی افسر کا تجرباتی انداز کام کئے بغیر نہیں رہا اور اُنھوں نے ان نظموں میں اُسلوب کے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ افسر کی ایسی نظموں میں ''مسافر'' ''مالن کا گیت'' اور ''چاند'' وغیرہ نہایت عمدہ نظمیں ہیں۔

الغرض سادگی، لطیف موسیقیت، نرم و مترنم طرز ادا، جذبات نگاری، مناظر قدرت کی عکاسی اور حب الوطنی افسر کے کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جن کی بدولت

انھیں ہم عصر شعرا میں خاص امتیاز حاصل ہے ۔ اُن کی غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے ''پیام روح'' اور جوئے رواں'' شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ اُن کی ادبی کاوشوں میں ''ڈالی کا جوگ'' اور ''پرچھائیاں'' اُن کے مختصر افسانوں کے مجموعے ہیں اور ''نورس'' تنقیدی مقالات کا مجموعہ اور ''نقد الادب'' فن تنقید پر ایک مبسوط کتاب ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا
اور تو اے چارہ ساز بے کساں دیکھا کیا
میں نے یوں دل کی کہانی کا اثر قائم رکھا
ہر گھڑی تھم تھم کے رنگ داستاں دیکھا کیا

دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کاہے کو ہوتی
اور کسی سے کیا مطلب ہے تو خود کیا کہتا ہوگا
کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی راتوں کو
اس بادل کے بھی پردے میں کوئی دل والا ہوگا

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوہسار کا
شاید اس کو کہتے ہیں موسم بہار کا

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا
جہاں بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے چنوں
صبا نے کر دیا کیا حال آشیانے کا

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں یا کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

للّٰہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

ہم جسکو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مر جھاتے ہیں
دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کر رہ جاتے ہیں

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں
نمایاں ہو حیات نو اگر ذروں کے دل چیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

اُف رے یہ ذوق عبادت کی عجائب کاریاں
دل کہیں ہے میں کہیں، سجدہ کہیں ہے سر کہیں
موت ہے وہ راز جو آخر کھلے گا ایک دن
زندگی ہے وہ معما جس کا کوئی حل نہیں

مذاہب کیا ہیں؟ راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی
ہے منزل کیا؟ جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ہوتیں

کچھ قطع منازل کی نہیں فکر سفر میں
ہر گام پہ منزل ہے تری راہ گزر میں
للّٰہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو
کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسر ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

زمانہ ڈھونڈتا ہے مجھ کو افسر	خدا جانے کہاں کھویا گیا میں

جن کو ہر حالت میں خوش اور شادماں پاتا ہوں میں
اُن کے گلشن میں بہار بے خزاں پاتا ہوں میں
صبح کی منزل کا تاروں سے پتا کیا پوچھنا
ظلمت شب کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
چاند کے اُس پار، سورج سے اُدھر، تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں

موت کے خواب کی تعبیر ہے تجدید حیات
یعنی اول سے سنائینگے پھر افسانے کو

نیچی غم رخصت سے وہ معصوم نظر ہو
اور مجھ کو کہیں دور کا در پیش سفر ہو

بادلوں کی سر زمیں پر نغمہ ہائے جانفزا
مرغ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

جب خوشی کا خیال آتا ہے	دل مایوس کانپ جاتا ہے
مجھے فردا کی فکر کیوں کر ہو	غم امروز کھائے جاتا ہے
سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار	دکھ میں اللہ یاد آتا ہے

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بولنے والے
کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے
رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں
تم ملے اور ڈھونڈنے والے تمہارے کھو گئے

فسانہ خواں تری آنکھیں قصور وار نہیں
میں جانتا ہوں خطا ہے مرے فسانے کی
قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید
کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اٹھانے کی

تجھ کو پا لینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں
زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے   خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے
جنت جسے کہتے ہیں اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

مل جائے جو تجھ سے جا کر ایسا کس کا مقدر ہے
دریا میں جو قطرہ ہے وہ دریا ہے یا گوہر ہے

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
دنیا میں اک سکون کا ذریعہ ہو جب یہی
انسان تجھ سے لو نہ لگائے تو کیا کرے

اُن کی پرواز انہیں تابہ فلک لے پہنچی
ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے   کاروانِ بہار دیکھا ہے
کتنے پشمینہ پوش جسموں میں   روح کو تار تار دیکھا ہے

اللہ رے جنوں کی یہ ذرہ نوازیاں   بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لئے ہوئے

بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف خدا جانے کس بھیس میں تو ملے

ایسی خلوت بھی کچھ نہیں افسر کہیں آنے کے ہو نہ جانے کے

ہائے وہ جس کی اُمیدیں ہوں خزاں پر موقوف
شاخ گل سوکھ کے گر جائے تو کاشانہ بنے

نہ شکوہ سنج مرا جوش سعی ہو کیوں کر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

بڑھا کے ریش تو مسجد کو کیا چلا افسر
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے
وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلووں کی داماں نظر میں بھیک ہوتی ہے

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں نام لے لے کر نہ کوسا کیجئے
مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

دکھاوے کے ہیں سب یہ دنیا کے میلے
بھری بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے پڑے رہتے ہیں گھر میں افسر اکیلے

بزم میں ان مد بھری آنکھوں کو گردش دے مگر
اس کا اندازہ تو کرے کسی کو کتنا ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلائی ہوئی
کچھ تمہیں بھی آج اپنی بے خودی کا ہوش ہے

ہو قرب اور پھر وہی دلبستگی رہے
ہیں اصل میں یہی تو محبت کے ولولے
واں اُن کو یہ گماں کہ دامن بھی تر نہیں
یاں حال یہ کہ آ گیا پانی گلے گلے

محو تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے
کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے

پریشانی ہے جی گبھرا رہا ہے
کوئی دھیمے سروں میں گا رہا ہے
کہوں کیا حال ناکام محبت
تمناؤں سے جی بہلا رہا ہے
کوئی شب کی خموشی میں ہے گریاں
تصور میں کوئی سمجھا رہا ہے
تصور کی یہ مقصد آفرینی
میں سمجھا کوئی سچ مچ آ رہا ہے
جو رستہ خلد میں نکلا ہے جا کر
وہ دوزخ سے نکل کر جا رہا ہے

آغاز ہوا ہے اُلفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے
شاید تھا بیاض شب میں کہیں اکسیر کا نسخہ بھی کوئی
اے صبح یہ تیری جھولی ہے یا دنیا بھر کا سونا ہے
تدبیر کے ہاتھوں سے گویا تقدیر کا پردہ اُٹھتا ہے
یا کچھ بھی نہیں یا سب کچھ ہے یا مٹی ہے یا سونا ہے
ٹوٹے جو یہ بند حیات کہیں اس شورو شر سے نجات ملے
مانا کہ وہ دنیا اے افسر صرف ایک لحد کا کونا ہے

یاس ہے، حسرت ہے، غم ہے اور شب دیجور ہے
اتنے ساتھی ہیں مگر تنہا دل رنجور ہے
تیرا جانا تھا کہ غم خانے پہ وحشت چھا گئی
میں یہ سمجھا تھا مرے گھر سے بیاباں دور ہے
شب کی خاموشی میں ہے تیرا تصور تیری یاد
ہائے کیا سامانِ تسکینِ دلِ رنجور ہے

اثر دیکھا دعا جب رات بھر کی   ضیا کچھ کچھ ھے تاروں میں سحر کی
ھوئے رخصت جہاں سے صبح ھوتے   کہانی ھجر کی یوں مختصر کی
تڑپ اٹھے لحد کے سونے والے   زمیں کی سمت کیوں تم نے نظر کی
سحر دیکھیں یہ حسرت لے گئے ھم   بتائیں کیا تمہیں کیونکر سحر کی

یہ بھی اک تماشا ھے کار زار آلفت میں
دل کسی کا ھوتا ھے بس کسی کا چلتا ھے
زندگی مری افسر اضطرار پیہم ھے
میں تو کانپ جاتا ھوں دل اگر سنبھلتا ھے

مسافر

ھے تنہا راہ میں گبھرائے گا دل
کہاں ھے اے مسافر تیری منزل ؟

سحر کی سرخ لہروں میں نہا کر   نظر مہر منوّر سے بچا کر
فضائے نیلگوں میں جب بڑھونگا   تو منزل کا پتہ کچھ دے سکونگا

سفر تیرا ھے مشکل اے مسافر
ھے کتنی دور منزل اے مسافر ؟

مسافر ھوں سفر ھے میرا مقصود   مری منزل مرے دل میں ھے موجود
سفر کی حد اگر معلوم ھوتی   سفر کی کیفیت معدوم ھوتی

سفر میں رات کا کٹنا ھے دو بھر
گزارے گا مسافر رات کیوں کر ؟

زمیں سے آسماں تک رہ گزر ھے   سفر کی رات ھی جانِ سفر ھے
خموشی کو صلائے درد دوں گا   کہانی اپنی تاروں سے کہوں گا

فلک پر نور افگن ماہ ہوگا ''مسافر رات کا'' ہمراہ ہوگا

محبت میں ہیں دونوں داغ بر دل

مسافر ہیں مگر گم کردہ منزل

مالن کا گیت

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں،

چھوٹی چھوٹی، ننھی ننھی، پیاری پیاری کلیاں

ے کانٹے میں سچ سچ کہہ دوں،

تیرے سارے پتے وتے میری ساری کلیاں

یا اللہ میں صبح کو پاؤں،

ٹہنی ٹہنی اچھی اچھی بھاری بھاری کلیاں

گیت افسر کا یسا گاؤں،

جیسے میرے پودوں والی نیاری نیاری کلیاں

چاند

تم ندی پر جا کر دیکھو
جب ندی میں نہائے چاند

ڈبکی لگائے غوطے کھائے
ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند

کرنوں کی ایک سیڑھی لے کر
چھم چھم آترا آئے چاند

جھولے میں پانی کی لہروں کے
کیا کیا پینگ بڑھائے چاند

ہنس ہنس کر ندی کے اندر
روتوں کو بھی ہنسائے چاند

جب تم آسکو پکڑنے جاؤ
بادل میں چھپ جائے چاند

پھر چپکے سے نکل کر دیکھے
اور پھر خود کو چھپائے چاند

اب ہالے میں چپ بیٹھا ہے
کیا کیا روپ دکھائے چاند

چاہے جدھر کو جاؤ افسر

ساتھ تمہارے جائے چاند

مالن

بھر کے دامن پھول والی یاسمن لائی ہے تو

بچنے بازار میں حسن چمن لائی ہے

راہِ پُر امنِ محبت کے لئے رہزن ہے تو
ہائے کتنی بے خبر اے سادہ دل مالن ہے تو
پھول یہ دو چار زینت تھے ترے گلزار کی
اب انھیں مرجھائے دیتی ہے ہوا بازار کی
بلبلیں حسرت بھری نظروں سے تکتی رہ گئیں
بس ہی کیا تھا بے کسی میں سر پٹکتی رہ گئیں
پتے گر گر کر زمیں پر سر رگڑتے رہ گئے
خار تک ظالم ترا دامن پکڑتے رہ گئے
رات بھر شبنم تجھے بیدرد مالن روئے گی
اب سحر کو کس کا منہ آ کر چمن میں دھوئے گی
نور کی جب ماہ تاباں شب کو چادر لائیگا
وہ چھپانے کو چمن کا حسن کیوں کر پائیگا
صبح کو آئیگا سورج گدگدانے کے لئے
باغ میں کوئی نہ ہوگا مسکرانے کے لئے
کاش اتنا ہوش ہوتا اے چمن والی تجھے
کوستی بے تاب ہو ہو کر ہے ہر ڈالی تجھے
دور کانوں سے ابھی تیرے صدائے درد ہے
تیرا ننھا دل ابھی نا آشنائے درد ہے
کمسنی میں چھپ رہا ہے تیرا حسن دلفروز
از صدائے دلفگاراں نیستی واقف ہنوز
خوش ادا ہیں، خوش فضا ہیں خوش اثر خوشرنگ ہیں
پھول والی پھول تیرے کس قدر خوشرنگ ہیں
نور کے ٹکڑے پرو کر لائی ہے تو ہار میں
چاند کا دل توڑ کر بے آئی ہے بازار میں
مسکراتے ہیں خوشی سے یوں ترے دامن میں پھول
ہو دعا جیسے کسی نا چار و بیکس کی قبول
تیرے پھولوں میں ہے پوشیدہ تبسم حور کا
حسم بے کر آئی زاہد کی عبادت نور کا
پھول تارے بن کے جتنے شب کے گلشن میں رہے
صبح کے دامن سے نکلے تیرے دامن میں رہے

پھول تیرے موجب آرائش حسن بتاں
پھول تیرے باعث افزائش حسن بتاں

رات بھر دیکھیں گے اب یہ ماجرائے حسن و عشق
ان پہ روشن ہونگے کیا کیا راز ہائے حسن وعشق

کوسنے کیا کیا سنائے گا ترے گلزار کو
دیکھ کر شرمائے گا جب کوئی باسی ہار کو

دل لئے جاتا ہے کیا جادو ترے پھولوں میں ہے
ہائے اے مالن کسی کی بو ترے پھولوں میں ہے

چھپ رہی ہے تیرے پھولوں میں بہار داغ دل
پھول ہیں ظالم ترے آئینہ دار داغ دل

ہائے ان سے آرزوئے خوں شدہ آتی ہے یاد
دل پکڑ کر رہ نہ جائے دیکھ کوئی نامراد

تاب یہ حسرت بھری نظروں کی کیونکر لائیں گے
پھول والی تیرے نازک پھول کمہلا جائینگے

پھول ہیں مالن ترے لطف عبادت کے لئے
ان میں زاہد نے مزے نیرنگ قدرت کے لئے

رنگ جلوت کیف افزا صورت خلوت ہوا
ان کی کثرت میں نمایاں جلوۂ وحدت ہوا

دھرم کی متوالی جوگن کہتی ہے "دزد چمن!
تیرے پھولوں سے مرے مندر کی دیوی ہے مگن"

دل کی کیفیت ہے کیا دل کی کسی کو کیا خبر
کیف اندوزِ عبادت ہے پجاری کی نظر

چشمِ آخر بیں کو اک نظارۂ عبرت ہیں پھول
آنکھ والے کے لئے آئینۂ حیرت ہیں پھول

غنچہ ہائے مہرُ بر لب تھے یہ گل گلزار میں
اب شباب آیا تو بکنے کو چلے بازار میں

رات بس کر سو رہیں گے پھر ہمیشہ کے لئے
زندگی ان کو ملی لُطفِ دو روزہ کے لئے

بے ثباتی کی جہاں میں پھول لائے ہیں خبر
ہستیٔ نازک کو روتی ہے حیات مختصر

پھول ہیں ظالم ترے تعبیر خواب زندگی
جسم لے کر آئی ہے تصویر خواب زندگی
ہوش جب آیا ہوا سے آشنا دامن ہوئے
پھول جتنے تھے چمن میں چاک پیراہن ہوئے
رنگ مایوسی کا تربت پر دو بالا کر دیا
اک عجب عالم ترے پھولوں نے پیدا کر دیا
پھول کہتے ہیں کوئی نو عمر زیر خاک ہے
کیسا وقت شام یہ نظارہ عبرت ناک ہے
اے کہ در خواب گرانِ مرگ ہستی در مزار
ہائے تجھ پر آج ہے حسن و نزاکت سوگوار
خاک ہو کر بھی زیارت گاہ اہل دل ہے تو
رہروان راہ حسن و عشق کی منزل ہے تو

فراق گورکھپوری



رگھوپتی سہائے نام فراق تخلص ۱۸۹۶ء میں اپنے آبائی وطن گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزز سری واستو کائستھ خاندان کے فرد ہیں۔ چونکہ اُن کے بزرگوں کو عہد شیر شاہ سوری میں پانچ گاؤں ضلع گورکھپور میں ملے تھے۔ اس لئے خاندان کے لوگ پنج گانواں کے کائستھ مشہور ہوئے۔ اُن کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت اُردو و فارسی کے اچھے عالم تھے اور ایک ممتاز و معروف وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ فراق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اُردو سے شروع ہوئی۔ سات سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کئے گئے۔ جہاں اُنکی خداداد ذہانت کے جوہر کھلے اور اُنھوں نے ہر امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ نے آئی۔ سی۔ ایس کے لئے اُنھیں نامزد کردیا لیکن ان ایام میں وہ اپنی ازدواجی زندگی کی تلخی سے کچھ اس طرح بیدل ہو رہے تھے کہ ڈپٹی کلکٹری قبول کرنے کے بجائے کانگرس میں شریک ہو کر خدمت قوم و وطن میں پناہ لینا چاہی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں اسیر فرنگ رہنا پڑا۔ ۱۹۲۷ء میں جب وہ قید سے رہا ہو کر آئے تو کرسچین کالج لکھنؤ میں ملازم ہو گئے۔ پھر سناتن دھرم کالج کانپور میں اُردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ اس دوران میں فراق صاحب نے انگریزی میں ایم۔ اے کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار ہو گئے۔ جب سے آپکا قیام مستقلاً الہ آباد ہی میں ہے اور آپ اپنے عہدے کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اُردو شعر و ادب کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

فراق صاحب کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی لیکن شفیق باپ نے بعض مصالح کی بنا پر ان کے اس ذوق کو زیادہ اُبھرنے نہ دیا۔ تاہم حضرت عبرت کی مساعی اس معاملہ میں پوری کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ چنانچہ فراق اپنے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر شاگرد امیر مینائی کی صحبتوں میں شاعرانہ کیفیات سے اس درجہ مانوس ہوئے کہ آخر لطف سخن اُن کا جزو زندگی بن کر رہا۔ ۱۹۱۶ء میں اُنھوں نے پہلی غزل کہی اور حضرت ناصری مرحوم سے اصلاح لی۔ کچھ دنوں بعد وسیم خیرآبادی سے اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس زمانہ میں بی۔ اے

کرنے کے بعد وہ قید ہوئے تو وہاں مولانا حسرت، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور بقول شخصے قید خانہ فراق صاحب کے لئے شعر و سخن کا مدرسہ بن گیا۔ چنانچہ جب اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو پھر کسی سے اصلاح نہ لی۔

حضرت فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے جو اُن کے بھائی سحر کے توسط سے اُن تک پہنچا۔ پھر عزیز اور صفی کا اثر اُن کے یہاں اُبھرتا ہے اور اس کے بعد وہ میر کے رنگ میں کہنے لگتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ان اساتذہ کے تاثرات، دیگر شعرائے اُردو کے کلام کے گہرے مطالعے اور انگریزی ادب کی وافر معلومات سے اثر پذیر ہو کر فراق صاحب بھی ایک نئے رنگ کی تخلیق کرنے لگے جسے ہم خود فراق صاحب کا طرز سخن کہہ سکتے ہیں۔ اُن کے تغزل کا مرکزی عنصر عشقیہ اور عام زندگی کے متعلق ایک وجدانی ادراک ہے۔ اسی کی بدولت آنکے یہاں جذبات نگاری کے بجائے ہمیں تنقید حیات کا پہلو زیادہ اُجاگر نظر آتا ہے۔ فراق صاحب نے غزل کو ایک نئی تاثیر، ایک نئے شعور اور ایک نئے آہنگ سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اُن کے تصور میں ہمیں قلب و نظر، سکون و توازن، نرمی و محبت اور خیر و برکت سبھی کچھ ملتا ہے۔ وہ جنسی عشق کو اُسکی تمام نزاکتوں، لطافتوں اور بلندیوں کے ساتھ جس رچے ہوئے رنگ میں پیش کرتے ہیں وہ اُنہیں کا حصہ ہے۔ لیکن ان تمام محاسن کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ فراق صاحب کے یہاں ابہام بھی پایا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ چونکہ مختلف اور بظاہر بے تعلق چیزوں میں ایک رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے خیال کے حسین ہونے ہوئے بھی وہ اُسکی پوری وضاحت نہیں کر پاتے۔

اس میں شک نہیں کہ فراق صاحب غزل گو شاعر ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل کے علاوہ وہ کچھ اور کہتے ہی نہیں یا اُن کی دوسری شعری کاوشیں لائق اعتنا نہیں۔ فراق صاحب کی نظمیں اور رباعیاں بھی ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ اُن کی نظموں میں طرز بیان کا تنوع اور اسلوب کی رنگا رنگی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ وہ چونکہ فطری طور پر مناظر فطرت سے بہت ہی شدید قسم کا تاثر قبول کرنے کے عادی ہیں اس لئے اُن کی منظریہ شاعری میں مناظر کے خد و خال کے ساتھ ساتھ اُس کی بھر پور فضا بھی ملتی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو فراق صاحب کی منظومات کو بہت ہی پر تاثیر بنا دیتی ہے۔ ان نظموں کے ساتھ ساتھ اُن کی وہ نظمیں بھی قابل ذکر ہیں جن میں اُنہوں نے بڑی بے باکی مگر دلکشی کے ساتھ داستان آدم سنائی ہے۔ فراق صاحب کی ایسی نظمیں بہت نازک اور بلیغ اشاریت کی حامل ہیں اور اُن میں شاعر کا بیدار سیاسی شعور صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

جہاں تک حضرت فراق کی رباعیوں کا تعلق ہے مولانا نیاز فتحپوری کی مختصر مگر جامع رائے بڑی معنی خیز ہے وہ فرماتے ہیں "فراق نے اس صنف سخن میں لطیف ترین بت گری سے کام لیا ہے۔ ان رباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے اور ایرانی کلچر بھی، یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی اُن میں موجود ہے اور قدیم ہندو اور بودھ آرٹ کا رقص

و نغمہ بھی'' اور یہی وجہ ہے کہ فراق صاحب کی رباعیات کا مجموعہ ''روپ'' اردو دان طبقہ میں بڑی قدر و منزلت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے ۔ فراق صاحب کے اس مجموعہ کی تمام رباعیاں جمالیاتی ہیں ۔ لیکن انہوں نے ہمارے جنسی جذبہ کو جس تہذیب کے ساتھ ایک آفاقی کلچر کا رنگ دیکر پیش کیا ہے وہ یقیناً لائق صد ستائش ہے ۔

بحیثیت مجموعی فراق صاحب عصر حاضر کے ممتاز شعرا میں سے ہیں ۔ اُن کی شاعری میں ہمیں سب سے زیادہ تنقید حیات کی ایک مسلسل کوشش ملتی ہے اور شاید اسی لئے اُنہیں عام طور پر اُردو کا نقاد شاعر کہا جاتا ہے ۔ اُن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''رمز و کنایات'' اور ''شبنمستان'' صرف غزلوں اور ''روپ'' محض رباعیات کے مجموعے ہیں ۔ ان کے علاوہ ''روح کائنات'' اُن کی نظموں اور غزلوں اور ''مشعل'' غزلوں اور رباعیوں کے مجموعے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو　　وہ درد اُٹھا ''فراق'' کہ میں مسکرا دیا

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

نگاہ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی　　جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

پردہ دارئ غم ہے شاکی　　تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آج تو درد ہجر بھی کم ہے　　آج تو کوئی آیا ہوتا
منزل منزل دل بھٹکے گا　　آج تمہیں نے روکا ہوتا
میں ہوں دل ہے تنہائی ہے　　تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں　　دل وہی کارگہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں　　وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا　　دولت دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
اس اضطراب میں راز فروغ پنہاں ہے
طلوع صبح کی مانند تھرتھرائے جا
نگاہ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور
مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوال عشق ہے ابھی یہ کیا کیا ، یہ کیا ہوا؟

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا ، زمانہ تھا گذر گیا

کچھ نہ خلوت میں ہے نہ جلوت میں
اسکی خلوت ہے اور جلوت اور

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ ! اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دل ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد
ہم اسیران قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے
کیا کہیں یہ تیرے انکار کہ انکار سے ہیں

دل میں اٹھا کے رکھ دے گلستاں
کر دے علاج تنگئی داماں
شبنم و شعلہ حسنِ گلستاں
پرنم پرنم سوزاں سوزاں
آئے گنہگاران محبت
نادم نادم نازاں نازاں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی
کیا شب وصل اور کیا شب ہجراں
آنچ قفس والوں تک آئی
اب کے بہت ہے شور بہاراں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبح ازل سے خراماں
کس نے موت کی نیند اڑا دی
جاگ اٹھی ہے خاک شہیداں
یوں ہی ''فراق'' نے عمر بسر کی
کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اُڑانے میں
جنوں کا نام اُچھلتا رہا زمانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہ ناز کا دیکھا نہیں
ے آڑی تجھ کو نگاہ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

رموز عذر جفا تک خیال جا نہ سکا
میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

کب دیکھئے دلوں کو ملے اذن یاس بھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ "ابھی نہیں"
ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسن یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظّارگی نہیں

پھر ہیں وہی اداسیاں پھر وہی سونی کائنات
اہل طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کی کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ
کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں

اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اک بانکپن
اپنی ہی گرمی سے گھائل ہو گیا حسن بتاں

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ
دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں
گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حسن ہی جانے
کسی سے عالم مستی میں اس طرح کھل جاؤ
نہ پوچھ الجھی ہوئی گتھیاں محبت کی
نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
تڑپ کو ہم نے بنایا سکون بے پایاں
ہماری دکھ بھری نے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

نکہت زلف پریشاں داستان شام غم — صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہاں تجھے بھی نہ کہہ سکیں تجھ سا — تجھ کو یکتائے روزگار کریں
کوئی آیا نہ آئے گا لیکن — کیا کریں گر نہ انتظار کریں
جوش تجدید شوق کیا کہنا — دل کو پھر ہم امیدوار کریں

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا — اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے — تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی
سر بھی انہیں ملا در و دیوار بھی مگر — کم ہو سکی نہ وحشت زندانیاں کبھی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

دیار دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریم عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں تو نے تو خیر بے وفائی کی

رُکی رُکی سی شب تار ختم پر آئی وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی اُمید واروں میں کل موت بھی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کہیں دامان باد صبح بھی آلودہ ہوتا ہے بچا لیتا ہے حسن نرم خود دوشیزگی اپنی

اس پرسش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

زندگی کو وفا کی راہوں میں موت خود روشنی دکھاتی تھی

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم رکے رکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ کیا گزری

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرت صحرا کی بھی ہے، کچھ رنج در و دیوار بھی ہے
اُمید نہ دے پرسش بھی نہ کر، دے اور فریب حسن کوئی
مایوسوں کا خوش ہو جانا، آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
دن رات شگوفے کِھلتے ہیں، دن رات بہاریں لٹتی ہیں
تدبیر جنوں، تقدیر چمن، ایام کی کچھ رفتار بھی ہے

اک تار نگاہ کی جنبش سے شہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے ، آمادۂ صد پیکار بھی ہے
رہ رہ کے خلش بھی ہوتی ہے ، کچھ کشمکش دل بھی کم ہے
سنتے ہیں فراق وہ تیر نظر دل میں بھی ہے دلکے پار بھی ہے

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے ذرے ذرے سے تلاطم سا بپا ہوتا ہے

تجھ کو اے باد صبا شوخئی پیہم کی قسم
اس طرح چھیڑ کہ ہر گل کو گلستاں کر دے
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل
اب اسے اے نگہ یار کچھ آساں کر دے

جنہیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی تری نگاہ ہے انداز آن کے پائے ہوئے
وہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سر حشر بھی نہیں چوکے تیری نگاہ کرم کے فریب کھائے ہوئے

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو در خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالم حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیّتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضِد پہ آئے
کشتئی دل بچائیے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو ، پار لگے تو ڈوب جائے

کہہ گئی کیا نگہ ناز تری ہم جس کو بات کی بات فسانے کا فسانہ سمجھے
اپنے دیوانے کا دنیا میں ٹھکانہ ہے کہیں لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی
جو چل پڑے تو بیاباں ، رکے تو زنداں ہے
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی
رگ جنوں ہے، رگ گل ہے، یا رگ جاں ہے

ماتھے پہ ترے صبح چمن کھیل رہی ہے
آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے
وہ زلفِ شکن زیر شکن کھیل رہی ہے
پیراہن خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اس پیکر رنگیں میں زہے شوخئی پنہاں
بجلی تہ دامانِ چمن کھیل رہی ہے
باتوں میں فراق اس کی معطر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے، سحر ہوتے
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
کسی کا قامت شاداب ہے وہ مصرعہ رنگیں
کہ جس کے سامنے فکر غزل شرمائی جاتی ہے
محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں
بہت جاگا ہوں اے شام فراق اب نیند آتی ہے

بزم برشگال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے
پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے
کوندا ہو گداز اُف یہ تبسّم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک، لَو جو ستاروں سے چرائے
وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اٹھے
وہ چستئی ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
وہ نرم کلائی کہ سکوت آنکھ اٹھاوے
آہستہ خرامی کہ فضا وجد میں آئے
وہ شوخئی محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے
یہ کم نگہی چشم فسوں ساز کی کیسی،
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے
نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات
روئے شفق آمیز سے پو پھوٹتی جائے
کیوں تیرے غم ہجر میں نمناک ہیں پلکیں
کیوں یاد تیری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گزری ہیں تیرے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

آج کی دنیا

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دھرا رہی ہے آج

وہ سر اٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج
موج حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج

کانوں میں زلزلونکی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دھر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

یکسر جہان حسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج

ہر ہر شکست ساز میں صد لحن سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

یہ دامن اجل ہے کہ تحریک غیب ہے
کیا شے ہوائے دھر کو سلگا رہی ہے آج

ابنائے دھر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج

پھر چھیڑتی ہے موت حیات فسردہ کو
پھر آتش خموش کو اکسا رہی ہے آج

برھم سا کچھ مزاج عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اک موج درد سینے میں لرزاں ہے اسطرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جُگوں کو چھاؤں ہے امروز پر فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

رباعیات

ہر ایک نظر یہ کام کرتی بھی نہیں
ہر ایک نگاہ یوں اترتی بھی نہیں
صدقے ترے دیکھنے کے ظالم دل پر
پڑتی ہے وہ چوٹ جو ابھرتی بھی نہیں

دن ڈوب گیا رات کی اندھیاری ہے
ہر سمت خموشی کا سماں طاری ہے
تارے نکلے تو درد سینے میں اٹھا
وہ آنکھ کی، یہ قلب کی بیداری ہے

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے   دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ، یہ لوچ، یہ ترنم یہ نکھار   بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

آنسو سے بھرے بھرے یہ نیناں رس کے   ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برِہ کی پیڑا   جس طرح آلٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

بالوں میں خنک سیاہ راتیں ڈھلتی   گالوں کی شفق کے اوٹ شمعیں جلتی
تاروں کی سرکتی چھاؤں میں بستر سے   اک جان بہار آٹھی ہے آنکھیں ملتی

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں   اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے   اک فرد کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

کچھ رندوں کو سن گن سی ملی ہے ساقی   نو جُگ کے جنم کی یہ گھڑی ہے ساقی
تخلیق کے لمحے تھر تھرائے سر جام   یہ شام اک گرد بن رہی ہے ساقی

یہ ولولہ یہ آمنگ دریا دریا   یہ شعلۂ بے درنگ صحرا صحرا
یہ پرتو انقلاب عالم عالم   یہ جلوۂ انقلاب دنیا دنیا

کھلتا ہے اہم ترین باب تاریخ   یہ شعلۂ نغمۂ رباب تاریخ
یہ سینۂ وقت میں دھکتی ہوئی آگ   کروٹ لیتا ہوا شباب تاریخ

شائستۂ انقلاب انساں کا وطن   آگتے سورج کا جگمگاتا درپن
وہ نغمۂ زندگی کا بجتا ہوا ساز   وہ سارے ایشیا کے دل کی دھڑکن

مولانا عبدالمجید سالک



عبدالمجید خاں نام سالک تخلص ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے دادا مولوی میر محمد صاحب علوم شرقیہ کے فاضل اور نہایت عابد و زاھد بزرگ تھے اور آپ کے والد منشی غلام قادر مرحوم پٹھانکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے ۔

مولانا سالک کی ابتدائی تعلیم پٹھان کوٹ میں ہوئی ۔ انٹرنس کا امتحان اپنے وطن بٹالہ میں پاس کیا ۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک چند عارضی ملازمتیں کرتے رہے ۔ لیکن چونکہ ادبی ذوق میراث میں پایا تھا اس لئے یہ ماحول پسند نہ آیا چنانچہ آپ نے ملازمت سے کنارہ کش ہوکر ۱۹۱۴ء میں پٹھانکوٹ سے ایک ادبی رسالہ ''فانوس خیال'' جاری کیا ۔ اس طرح گویا انیس سال کی عمر میں مولانا کی نثر نگاری کی ابتدا ہوئی اگرچہ نا مساعد حالات نے اس پرچہ کو نو یا دس ماہ سے زیادہ نہ چلنے دیا تاھم اس سے مولانا کے ذوق ادب اور سلیقہ کا ضرور پتہ چل جاتا ھے ۔ اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے ''فانوس خیال'' کو ایک معیاری جریدہ بنایا اور اُس وقت کے اچھے لکھنے والے اُس کے قلمی معاون بنے ۔

۱۹۱۵ء میں مولانا سالک لاھور تشریف لائے اور سید ممتاز علی صاحب کے رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۲۰ء میں جب پنجاب کے مشہور اُردو روزنامہ ''زمیندار'' کا اجرا ہوا تو مولانا ظفر علی خاں صاحب نے آپ کو اس کے ادارے میں شمولیت کی دعوت دی ۔ آخر اُن کے اصرار پر سالک صاحب یکم مئی ۱۹۲۰ء کو ادارۂ ''زمیندار'' سے منسلک ہو گئے ۔ اس حیثیت سے آپ نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ''زمیندار'' کو اپنی قدیم روایات کے ساتھ جاری رکھا ۔

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا سالک تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے اور ایک سال کی سزا ہوئی ۔ منٹگمری جیل میں مولانا نے انگریزی کا خاصا مطالعہ کیا چنانچہ جب نومبر ۱۹۲۲ء میں آپ رہا ہوئے تو ''زمیندار'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایک ھی سال میں ایف ۔ اے اور بی اے کے

امتحانات بھی پاس کر لئے - اسی زمانے میں مولانا غلام رسول مہر بھی ادارۂ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے -

۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناب مہر اور حضرت سالک نے مل کر روز نامہ ''انقلاب'' نکالنا شروع کیا جو قیام پاکستان کے بعد تک برابر جاری رہا - اس طویل عرصے میں مولانا سرتاپا صحافت و سیاست میں منہمک رہے - اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ دو سال مولانا کا قیام کراچی میں رہا جہاں مرکزی حکومت کے لئے آپ کچھ لکھتے رہے - اواخر ۱۹۵۳ء سے لاہور واپس آ گئے ہیں اور مختلف رسائل و اخبارت کو اپنی قلمی اعانتوں سے سرفراز کرتے رہتے ہیں -

مولانا سالک ایک کامیاب صحافی اور اچھے نثر نگار ہیں - اس کا ایک ثبوت تو ''زمیندار'' و ''انقلاب'' کے ''افکار و حوادث'' کے کالم ہیں جن کی مزاحیہ ادبی نگارشات نے قبول عام کی سند حاصل کی ' دوسرے آپ کی وہ تالیفات و تراجم ہیں جو مختلف اوقات میں طبع ہوتے رہے - لیکن ان گراں قدر اوصاف سے قطع نظر آپ ایک بلند پایہ شاعر بھی ہیں - ۱۹۰۹ء یعنی چودہ سال کی عمر سے مولانا نے شعر کہنا شروع کئے اور منشی حیات بخش رسا رامپوری فخر تلامذہ داغ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا - یہ سلسلہ چند سال جاری رہا لیکن ۱۹۱۳ء میں جب حضرت رسا کا انتقال ہو گیا تو مولانا سالک نے بھی اصلاح سے گریز کر کے خود اپنی جودت طبع کی رہنائی میں فکر سخن جاری رکھی اور تھوڑے ہی عرصہ کی مشق و ریاض کے بعد اُستادی کے درجہ کو پہنچ گئے -

مولانا سالک غزل و نظم دونوں کہتے ہیں مگر چونکہ سیاسی اور صحافی مصروفیتوں نے کبھی خصوصیت کے ساتھ شعر و سخن کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اس لئے آپ کا شعری سرمایہ کچھ ایسا زیادہ نہیں - بایں ہمہ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے اُس میں وہ مشاطگی اور فنی پختگی پائی جاتی ہے جو ایک ماہر فن اور اُستاد کے شایان شان ہے - آپ کی نظموں میں علامہ اقبال کا پرتو صاف نظر آتا ہے چنانچہ اُن میں سے بیشتر قومی رنگ کی ہیں - اس طرح کی نظموں کا موضوع مسلمان اور اُس کی زندگی ہے اور شاعر نے ان موضوعات کو اپنا کر مسلمانوں میں جوش ولولہ اور بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے - اس کے علاوہ بعض نظموں میں مظاہر فطرت اور فنون لطیفہ پر بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کچھ منظوم ترجمے بھی ہیں جو اپنی سادگی و روانی کے اعتبار سے بڑے دلکش ہیں - جہاں تک مولانا کی غزل گوئی کا تعلق ہے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی غزل زبان و بیان کی جملہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہے - پچھلے چند سالوں میں اُنھوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ تو بس خاصے کی چیز ہیں - ان غزلوں میں غم جاناں و غم روزگار کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کی روح وجد کرنے لگتی ہے - مولانا موصوف کی چند ابتدائی اُردو فارسی نظموں کا ایک مجموع ''راہ و رسم منزلہا'' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا تھا جس کی ترتیب آپ کے احباب نے اس وقت دی جب آپ جیل میں تھے

انتخاب کلام

تغزل

ہم نفسو! اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہل دل مہر و وفا کو کیا ہوا
عشق ہے بے گداز کیوں، حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہوا
اب نہیں جنت مشام کوچۂ یار کی شمیم
نگہت زلف کیا ہوئی، باد صبا کو کیا ہوا
تھم گیا دورۂ حیات، رک گئی نبض کائنات
عشق و جنوں کی گرمئی ہمہمہ زا کو کیا ہوا
نالۂ شب ہے نارسا، آہ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

غم کے ہاتھوں مرے دل پر جو سماں گزرا ہے
حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے
زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق
جو تری یاد میں اے جان جہاں گزرا ہے
حال دل غم سے یہ ہے جیسے کسی صحرا میں
ابھی اک قافلۂ نوحہ گراں گزرا ہے
بزم دوشیں کو کرو یاد کہ اس کا ہر رند
رونق بارگہ پیر مغاں گزرا ہے
پا بہ گل جو تھے وہ آزاد نظر آتے ہیں
شاید اس راہ سے وہ سرو رواں گزرا ہے
اے اجل جلد کرم کر کہ تری فرقت میں
مجھ پہ جو لمحہ بھی گزرا ہے گراں گزرا ہے
نگرانئی دل و دیدہ ہوئی ہے دشوار
کوئی جب سے مری جانب نگراں گزرا ہے

حال دل سن کے وہ آزردہ ہیں، شاید اُن کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے
وہ گل افشانئی گفتار کا پیکر ''سالک''
آج کوچے سے ترے اشک فشاں گزرا ہے

نہ محتسب کی نہ حور و جناں کی بات کرو
مئے کہن کی نگار جواں کی بات کرو
کسی کی تابش رخسار کا کہو قصہ
کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو
ضیا ہے شاھد و شمع و شراب سے اُس کی
فروغ محفل روحانیاں کی بات کرو
جو مدعا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر
تو آستانۂ پیر مغاں کی بات کرو
نہیں ہوا جو طلوع آفتاب تو فی الحال
قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو
رھیگا مشغلۂ یاد رفتگاں کب تک
چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو
اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے
کرو تو اب ستم باغباں کی بات کرو
خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں ''سالک''
دیار ہند میں حسن بتاں کی بات کرو[1]

مرے دل میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشد مغاں سے
کہ ملا جہاں ساقی کو یہ طنطنہ کہاں سے
وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
تو اُٹھا سکا نگاہیں نہ بتا سکا زباں سے
جو اُنہیں وفا کی سوجھی تو نہ زیست نے وفا کی
ابھی آکے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اُٹھ گئے جہاں سے

---

[1] مشاعرہ دھلی میں پڑھی گئی

بچے بجلیوں کی زد سے وہی طائران دانا
جو کڑک چمک سے پہلے نکل آئے آشیاں سے
شب غم جو آئی ''سالک'' مٹے باطنی اندھیرے
مرا دل ہوا منور تب و تاب جاوداں سے

نہ تھی اُمید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا
اُٹھا دے اب تو نقاب اے عروس آزادی
ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا
شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامن مشرق کو لالہ زار کیا
چھپا رکھا تھا جسے محتسب نے پردوں میں
وہ راز بزم میں رندوں نے آشکار کیا

پلا وہ بادہ کہ سرخوش زمانہ ہو جائے
کشا کشِ غم ہستی فسانہ ہو جائے
قبول پیر مغاں مطمح نظر ہے یہی
جہان خراب شراب مغانہ ہو جائے
بس اب تباہئی زنداں پہ منحصر ہے قرار
قفس کو آگ لگے آشیانہ ہو جائے
خدنگ ناز کی لذت بتاؤں کیا واعظ
خدا کرے کہیں تو بھی نشانہ ہو جائے
اسی لئے کئے جاتے ہیں پا بگل آزاد
مزاج سرو خرام آشنا نہ ہو جائے
نہ آئیں وہ تو قضا ہی کرم کرے ''سالک''
غم فراق اجل کا بہانہ ہو جائے

ہم نہیں ہوں گے

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو ! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
تمہیں ہو گے فروغ بزم امکاں ہم نہیں ہوں گے
جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلف جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبین دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوع مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شام غریباں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے
کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے بعد ہی خون شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیب عنواں ہم نہیں ہوں گے

میسر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدمبوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزش مستانہ برسوں سے
تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

میرے دل کی ہر تمنا ان نگاہوں پر نثار
جو نگاہیں میرے شکووں پر پشیماں ہو گئیں
غیر کے لب پر تبسم ' او وفا نا آشنا
بزم میں تیری نگاہیں کتنی ارزاں ہو گئیں
شکوۂ صیاد و گلچیں کیا ' حقیقت تو یہ ہے
چند کلیاں وجہ تاراج گلستاں ہو گئیں

منظومات

مجاہد و شہید

تمہیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعل وفا فروغ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُر ضیا جبین کائنات ہے
کواکب بقا ہو تم ' جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں
کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی ممات میں
تمہارا امتیاز ہے دوام میں ' ثبات میں
جدا ہو کائنات سے تو محو اس کی ذات میں
بقا ہے جس کی ذات کو وہ اک خدا کی ذات ہے

مجاہدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں
بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ چشم ہائے خونچکان و بے کفن عجیب ہیں
مجاہدو ! شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
حیات بھی حیات ہے ' تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری
بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل تاک کی
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم لے تمہیں وہ شہسوار ہو
تمہیں وہ سرفروش ہو تمہیں وہ جاں نثار ہو
تمہیں دفاع و احترامِ دیں کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو ان کی بنا نہ استوار ہو
تمہاری تیغ ضامن نظام کائنات ہے

مطرب اور شاعر

اک شاہراہ پر کوئی مطرب تھا نَے نواز
تھی جس کے سوز دل سے منور صدائے ساز
تھا اُس کی نے میں کیف سرود ازل کا رنگ
تھی جلوہ ریز جام حقیقت مئے مجاز
لیکن فغانِ نے کو نہ سنتے تھے راہ گیر
سب کا مذاق نغمہ تھا محروم امتیاز
غالب ہوا تھا ذوق نواہائے درد پر
شور کشا کشِ حسد و بغض و حرص و آز
مایوس ہو کے مطرب دل خستہ چل دیا
اندوہ میں چھپائے ہوئے اک جہانِ راز

چھیڑا پہنچ کے دور اُسی نَے نواز نے
سوز نفس سے پھر وہی آہنگ جاں نواز
آزاد ہو کے شورش انبوہ عام سے
گونجی فضا میں نَے کی نوائے جگر گداز
بجلی گری جہاں کے متاع ثبات پر
چنگاریاں سی اُڑنے لگیں کائنات پر

شاعر کہ جس کے دم سے ہے ہر دم بہشت گوش
خمخانۂ حیات کی گلبانگ نا و نوش
اُس کی نگاہ پر ہے عیاں راز کائنات
اُس کے دماغ میں ہے خیالات کا خروش
لیکن پیام اُس کا سمجھتا نہیں کوئی
سب ہیں ہوا و حرص کی دنیا میں سخت کوش
اس غم سے شیشۂ دل شاعر شکستہ ہے
میخانۂ خیال کی ہیں شورشیں خموش
صحرائے دل میں یاس کی آہیں سموم خیز
دامان غم پہ خون کے آنسو چمن فروش
لیکن ذرا زمانہ گزرنے کی دیر ہے
ہونے کو ہے کشا کشِ امروز وقف دوش

ہو جائے گا جو قلزم ماضی میں غرق حال
واپس ملے گی بزم جہاں کو متاع ہوش
اس وقت کہنہ ہوگی مئے صافئ سخن
ہوگا شراب شعر کا ساقی سبو بدوش
نغمہ ہے دلفریب تو بعُد مکاں سے ہے
وابستہ کیف شعر مرورِ زماں سے ہے

تنہائی

(ترجمہ از انگریزی)

ہنسوں تو اہل عالم سب شریک خندہ ہوتے ہیں
جو رووں تو کوئی ہمدم نہیں جز رنج تنہائی
خوشی میں حصہ لینے کے لئے تیار ہے دنیا
مگر کوئی نہیں سرمایۂ غم کا تمنائی

جو گاؤں تو جواب نغمہ کہساروں سے سنتا ہوں
بھروں آہیں تو رہ جاتی ہیں معدوم فضا ہو کر
صدائے باز گشت آتی ہے سن کر نغمۂ عشرت
مگر نالوں سے کترا جاتی ہے نا آشنا ہو کر

سناتا ہوں خوشی تو مرجع اہل جہاں ہوں میں
مگر مغموم ہوتا ہوں تو سب آنکھیں چراتے ہیں
زمان عیش ہی میں دوست ہیں دنیا کے باشندے
یہ میری داستان درد کب سننے کو آتے ہیں

اگر خوش ہوں تو لاکھوں ہیں مرے احباب شیدائی
جو غم کھاؤں، غم بے مہرئ یاراں سے مرتا ہوں

مرے شغل مئے گلگوں میں سب شرکت کے خواہاں ہیں
مگر تلخابۂ حسرت کے میخانے میں تنہا ہوں

بچھاؤں خوان نعمت تو بہت نا خواندہ مہماں ہیں
نہیں ہے فاقہ مستی میں شریک حال بد کوئی
سخاوت زندگی میں کامیابی کی معاون ہے
مگر ہنگام مُردن کر نہیں سکتا مدد کوئی

بساط محفل عشق و مسرت میں وہ وسعت ہے
کہ طول و عرض میں اس کے سما سکتی ہے اک دنیا
مگر اس تنگنائے غم میں اے دنیا کے باشندو !
گزرتا ہے ہجوم بے کسی میں ہر بشر تنہا

چراغ حسن حسرت



چراغ حسن نام حسرت تخلص، ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ (کشمیر) کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں حسرت صاحب کے نانا جناب حسن نے آپ کو گود لے لیا چنانچہ آپ نے انہیں کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ فارسی، عربی اور اردو کی ابتدائی تعلیم آپ نے جناب حسن نیز اپنے والد شیخ بدر الدین صاحب سے حاصل کی پھر پونچھ میں میٹرک کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے اور ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں تک مختلف مدارس میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن اس پیشہ سے دلی لگاؤ نہ تھا اس لئے کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کی اور مختلف مقتدر جرائد "عصر جدید" "نئی دنیا" "جمہور" اور "استقلال" کے فرائض ادارت انجام دیتے رہے۔ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" میں کام کر رہے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے اور حسرت صاحب کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئے۔ لاہور آ کر حسرت صاحب کا "زمیندار" "انصاف" "احسان" "احرار" "شہباز" "شیرازہ" اور کئی دیگر اخبارات کے اداروں سے تعلق رہا۔ بعد ازاں آپ نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو حسرت صاحب "فوجی اخبار" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اس ملازمت کے سلسلے میں آپ برما اور ملایا میں بھی رہے۔ جہاں آپ کو انگریزی صحافت کے مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو کر آپ نے روزنامہ "امروز" کی زمام ادارت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس سلسے میں یہ بات بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ "امروز" کا پہلا شمارہ موصوف ہی کی زیر ادارت شائع ہوا تھا۔ مولانا تقریباً چار برس تک "امروز" کے مدیر اعلیٰ رہے۔ پھر ۱۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو یہاں سے مستعفی ہو کر کراچی چلے گئے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کر کے قومی پروگرام مرتب کرنے لگے۔ مگر اس ملازمت سے آن کی طبیعت بہت جلد آکتا گئی اور وہ اس سے الگ ہو گئے۔ زاں بعد کچھ مدت آپ نے سلور برڈٹ کمپنی میں کام کیا اور پھر لاہور آ گئے۔ اس دوران میں آپ کو دل کی شکایت ہو گئی۔ اگرچہ آپ صاحب فراش ہی رہے تاہم لکھنے پڑھنے کا مشغلہ برابر جاری رہا آخر ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حسرت صاحب ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ فقیدالمثال مزاح نویس اور طنزنگار بھی تھے اور بلا شبہ اُردو ادب میں موصوف کی شہرت اُن کے فکاہی مضامین ہی کی بدولت ہوئی ۔ ''پنجاب کا جغرافیہ'' آپ کے فکاہی رجحان کا نقش اولین ہے ۔ اس کے علاوہ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ''مردم دیدہ'' ''دو ڈاکٹر'' ''کیلے کا چھلکا'' ''پربت کی بیٹی'' اور ''زر نیخ'' کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ لیکن ان نثری کاوشوں سے قطع نظر جہاں تک حسرت صاحب کی شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُنھیں یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے ۔ اور اُن کے نانا جناب حسن جیسے بلند پایہ شاعر کا فیضان صحبت ہے کہ اُن میں اُردو شعر و ادب سے غائت دلچسپی پیدا ہوئی ۔ یوں حسرت صاحب کو کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں مگر ایک زمانہ میں آپ نے شاد عظیم آبادی مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کی خواہش کی تھی جو شاد صاحب اس بنا پر قبول نہ کر سکے کہ وہ بیچارے اُس وقت سماعت و بصارت دونوں سے محروم ہو چکے تھے ۔

حسرت صاحب نے نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے کچھ بچوں اور عورتوں کے لئے اور کچھ سیاسی ہیں لیکن در حقیقت غزل کی طرف اُن کا میلان زیادہ ہے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے تغزل میں ہماری کلاسیکی شاعری کا پورا رچاؤ اور ایک اُستادانہ شان پائی جاتی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی صحافتی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف پوری توجہ نہ دے سکے تاہم اُنھوں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت کہا ہے اُس میں حسن کی تمام رعنائی اور عشق کی ساری گرمی و شدت موجود ہے ۔ اُن کے یہاں تصوف یا تفلسف یا الفاظ کی بازی گری کے بجائے واردات قلبیہ کا بیان ایسی شگفتگی ، لطافت اور سادگی کے ساتھ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اُن کے اسلوب میں جگر کی سی تیزی ، تندی اور سر مستی تو نہیں ہے لیکن ایک ایسی نرمی و مدھم پن اور حسن و سادگی ہے جسے نشتریت کہہ سکتے ہیں ۔ بالخصوص چھوٹی بحروں میں اُنھوں نے بہت ہی بے ساختہ و لطیف شعر کہے ہیں ۔

حسرت کی شاعری کے بارے میں ایک ضروری بات اور کہنا ہے اور وہ اُن کی زبان ہے ۔ حسرت صاحب کی زبان بڑی صاف و شستہ ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان و محاورہ کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔ بلکہ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے اشعار میں زبان کی چاشنی سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے ۔ مگر ان تمام شاعرانہ خصوصیات کے با وصف افسوس ہے کہ اب تک ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ۔

انتخاب کلام

یا رب غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دست دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا
ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ تو وفا کرتے وعدہ نہ کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز
میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جرائت پرواز
حسن کی برہمی معاذاللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز
زلف برہم جھکی ہوئی نظریں
گردن ناز میں کمند نیاز
قد بالا و دامن کوتاہ!
منزل عشق کے نشیب و فراز
اللہ اللہ فسون نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز
قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غم یار تیری عمر دراز!

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی
ہر کلی میں ہے ترے حسن دل آرا کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی
مے چکاں لب، نظر آوارہ، نگاہیں گستاخ
یوں مرے پہلو سے اٹھا ہے غزل خواں کوئی
زلف برہم ہے، دل آ شفتہ، صبا آوارہ
خواب ہستی سا نہیں خواب پریشاں کوئی
نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تار رگ جاں کوئی

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوق سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے، کہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
اُمید وصل نے دھوکے دئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اُس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

آؤ حسن یار کی باتیں کریں — زلف کی رخسار کی باتیں کریں
زلف عنبر بار کے قصے سنائیں — طرۂ طرار کی باتیں کریں
پھول برسائیں بساط عیش پر — روز وصل یار کی باتیں کریں
نقد جاں لے کر چلیں اُس بزم میں — مصر کے بازار کی باتیں کریں
اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کبھی — سایۂ دیوار کی باتیں کریں
آخری ساعت شب رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

دل بلا سے نثار ہو جائے — آپ کو اعتبار ہو جائے
قہر تو بار بار ہوتا ہے — لطف بھی ایک بار ہو جائے
زندگی چارہ ساز غم نہ سہی — موت ہی غمگسار ہو جائے
یا خزاں جائے اور بہار آئے — یا خزاں ہی بہار ہو جائے
دل پہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

رات کی بات کا مذکور ہی کیا — چھوڑئے، رات گئی بات گئی
اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے — ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

آپ کا ذکر بیٹھتے ، اٹھتے
آپ کی یاد جاگتے ، سوتے
عشق نے حسن کو بنایا حسن
ہم نہ ہوتے تو آپ کیا ہوتے

میرے درد عشق کو رسوا کیا
آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

ڈرتا ہوں کہ اس چشم فسوں ساز کی گردش
احساس تمنا کو تمنا نہ بنا دے

حسرت کو ہے تو آئیں تری بزم ناز میں
کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

غم آرزو کو نہ تازہ کر دل بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سلگ اٹھی تو سلگ اٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

حسرت یہ بے خودی ہے کہ اتنی خبر نہیں
ان کی نظر ہے یا ستم روزگار ہے

راہ میں ان سے ملاقات ہوئی
جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

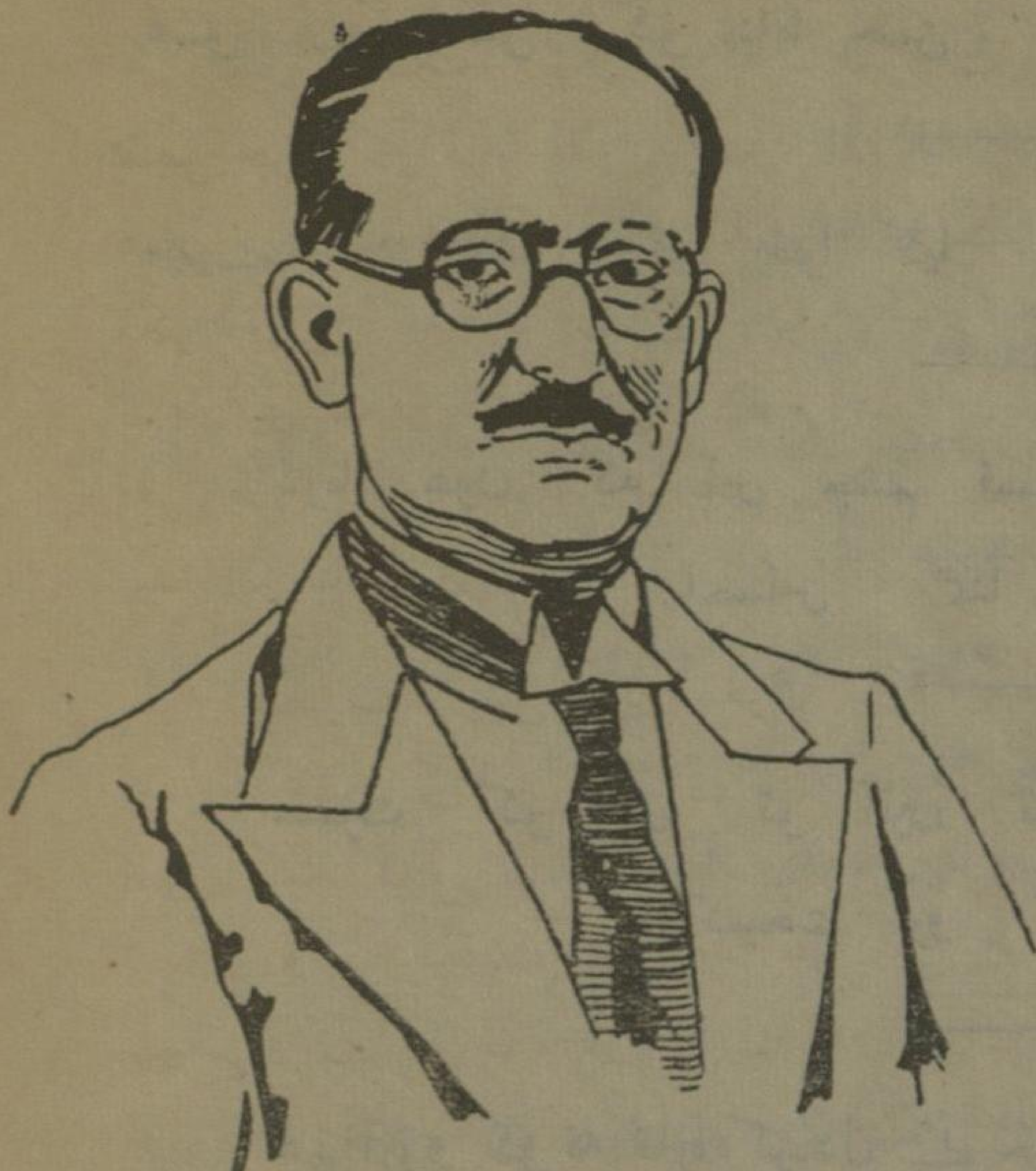
ہماری نا مرادی کا فسانہ
یہ کس کس کو سنایا جا رہا ہے

پھر وہی میں وہی نظر ان کی
دیدۂ و دل کی یاریاں نہ گئیں

روز دیتا ہے مجھے داغ جدائی اے چرخ
کیا تجھے اور کوئی طرز ستم یاد نہیں

دم آخر وہ آ گئے حسرت
موت سے اب کوئی بہانہ کریں

عبداللطیف تپش



شیخ عبداللطیف نام تپش تخلص ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ لاہور کے ہی رہنے والے تھے۔ یہیں آپ نے تعلیم وتربیت پائی اور یہیں منشی فاضل اور بی۔اے کے امتحانات پاس کرکے ابتداً کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی میں ملازم رہے۔ پھر گورنمنٹ کالج پسرور میں السنۂ شرقیہ کے اُستاد ہوکر چلے گئے۔ پسرور کے دوران قیام میں تپش صاحب نے تدریسی شغل کے علاوہ اپنے ذاتی مطالعہ کو برابر جاری رکھا چنانچہ کچھ دنوں بعد آپ نے ایم۔اے (فارسی) کا امتحان دیا اور اس امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی کہ پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے۔ پسرور کالج میں چند سال کام کرنے کے بعد آپ ایمرسن کالج ملتان میں السنۂ شرقیہ کے لکچرر مقرر ہو گئے اور عرصہ دراز تک اپنے عہدے کے فرائض نہایت مستعدی و خلوص کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ افسوس کہ موصوف کی عمر نے وفا نہ کی اور ابھی جوان ہی تھے کہ غالباً ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔

تپش مرحوم بڑے زیرک اور ملنسار انسان تھے اور چونکہ بڑے شائستہ مذاق اور شستہ ادبی ذوق کے حامل تھے اس لئے کالج نیز حلقۂ احباب میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ شعروشاعری کے ساتھ بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ خوش قسمتی سے موصوف کو سر عبدالقادر مرحوم کی دامادی کا شرف حاصل ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے شاعرانہ ذوق کی بہت جلد اصلاح و ترقی ہو گئی لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ تپش صاحب نے شیخ عبدلقادر مرحوم کی صحبتوں سے فیض اُٹھایا لیکن نظم گوئی کی طرف اُن کی طبیعت مائل نہ ہوئی اور وہ قدیم رنگ تغزل ہی کے دلدادہ رہے۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں غزل کی شمع روشن رکھی جب باد مخالف کے جھونکے اُسے ہمیشہ کے لئے گل کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ شروع میں تپش صاحب پر گوئی کے شائق تھے مگر کثرت مشق اور پختہ گوئی کا یہ اثر ہوا کہ گاہے گاہے شعر کہنے لگے چنانچہ جہاں ملک کے بہت سے ادبی رسائل آپ کے اشعار سے متمتع ہوتے تھے آخر عمر میں ''معارف'' یا اسی معیار کے دو ایک اور رسائل میں آپ کا کلام چھپا کرتا تھا۔

حضرت تپش کا کلام اُردو غزل کی روایتی تہذیب و شائستگی کا اچھا نمونہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کا اُنھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے اُن کے اسلوب میں پختگی و دلنشینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

ساتھ ہی زبان و بیان پر آنہیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے عشقیہ جذبات نیز دیگر مسائل زندگی کو بڑے سادہ اور دلکش پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آن کے کلام میں کوئی منفرد، مخصوص اور مختص تجربہ کار فرما نظر نہیں آتا اور نہ ہی وہ انوکھا پن ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ہمیں بے خود کر دے یا وہ جادو ہے جو ہمیں کسی دوسری دنیا میں لا کھڑا کرے مگر اس کے باوجود آن کے یہاں ایک ایسی سادگی و دلکشی ہے کہ پڑھنے والا آن کے اشعار سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس تاثر کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ موصوف کے تغزل میں یاس کا پہلو ہے جس نے آن کے اشعار میں درد و کرب کی ہلکی سی کسک پیدا کر دی ہے۔

حضرت تپش کے تغزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آن کی غزلیات حسن و عشق کی اتنی کہانی نہیں جتنی ایک حساس اور درد مند دل کی کہانی ہیں۔ چونکہ آنہیں بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے اس لئے آن کی کہانی میں ایک تاثیر اور دل کو لبھانے والی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے اور وہ گرمی بھی، جس کے بغیر فنکار کے نقوش پھیکے و بے کیف معلوم ہوتے ہیں۔ آن کی غزلوں میں کہیں کہیں تیکھی اور جاندار تراکیب کا استعمال بھی ہے جو کلام غالب کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض تپش مرحوم پنجاب کے خوش فکر متغزلین میں سے تھے اور آن کے کلام میں ایسی پختگی و آستادانہ شان پائی جاتی ہے کہ غزل کے باب میں آنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس کہ مرحوم کا مجموعہ کلام اب تک شایع نہیں ہو سکا۔ کاش اس معاملے میں مرحوم کے صاحبزادے ابو ظفر حنیف صاحب لکچرار چیفس کالج لاہور تھوڑی سی سعی فرماتے تاکہ یہ منتشر کلام کتابی صورت میں یکجا ہو جاتا۔

انتخاب کلام

موت آتی نہیں قرینے کی — یہ سزا مل رہی ہے جینے کی
مے سے پرہیز شیخ توبہ کرو — اک یہی چیز تو ہے پینے کی
تمہیں کہتا ہے آئینہ خودبیں — باتیں سنتے ہو اس کمینے کی
ہو گیا جب سے بے نقاب کوئی — شمع روشن نہ پھر کسی نے کی
چشم تر آبرو تو پیدا کر — یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہل دنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے نیکی کی

جان آنکھوں میں رہی جی سے گزرنے نہ دیا
اچھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستم گار! بھری محفل میں
دل چرا کر، تری دزدیدہ نظر نے نہ دیا
مدتوں کشمکش یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا، شوق نے مرنے نہ دیا
ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اترنے نہ دیا
کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اس نے
شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا
خاک آرام کی خواہش ہو وطن سے باہر
جب ہمیں چین "تپش" اپنے ہی گھر نے نہ دیا

سر پھوڑتا ہے قطع رہ عشق کے لئے
یہ کس بلا کا شوق دل کوہکن میں ہے
اندیشۂ شکستِ دل و سر بجیب شوق
اب کون سی کسر مرے دیوانہ پن میں ہے
پھر مدعی ہوا ہدف ناوک نظر
پھر اک خلش نئی مرے زخم کہن میں ہے
دلسوزیاں کلام میں ہیں میرے اے "تپش"
گویا زبان سوختہ میرے دہن میں ہے

اپنا بھی امتحان کر قاتل
تیغ کیوں آزمائے جاتا ہے
جس قدر وہ بگڑتے ہیں، یہ دل
مجھ سے باتیں بنائے جاتا ہے
اُن کی محفل میں دیکھتے ہو "تپش"
رنگ اپنا جمائے جاتا ہے

میری بے قدری نہ کر اے کج نظر
دور کی بھیجی ہوئی سوغات ہوں
انتشار طبع کیا کہئے "تپش"
مدتوں سے مورد آفات ہوں

بہار گل، ہوائے آشیاں، نغمات آزادی
یہ افسانے ہیں سب بلبل کے زیر دام آنے تک

نہ دی اشکوں نے مشت خاک کو پرواز کی رخصت
تمہارے نقش پا کا میرے سر الزام آنے تک
تمہاری خود نمائی اللہ اللہ اک تماشا ہے
تصور دل میں رہتا ہے زباں پر نام آنے تک
لب خاموش کا اپنے تحیّر ہم بھی دیکھیں گے
ترے دل میں خیال لذت دشنام آنے تک

شوق ستم ظریفئی احباب دیکھنا — رو داد عشق کو مری افسانہ کر دیا
اللہ رے نمائش انداز دلفریب — بیگانہ ہو گئے کبھی بیگانہ کر دیا
دیکھی جو بے نیازئ سنگِ حرم ''تپش'' — سر کو رہینِ سجدۂ بت خانہ کر دیا

کر گئے کام ولولے دل کے — قیس ہے ساتھ ساتھ محمل کے
کس قدر تند تھی شراب عشق — ہو گئے ٹکڑے شیشۂ دل کے
کیوں نہ بھٹکیں مسافرانِ عدم — پھیر میں آ گئے ہیں منزل کے
گل کھلاتی رہی چمن میں بہار — زخم جب تک ہرے رہے دل کے
اللہ اللہ رے خمار ستم! — لڑکھڑاتے ہیں پاؤں قاتل کے
چھُٹ گیا دامنِ اُمید ''تپش''
رہ گئے خالی ہاتھ سائل کے

جان دینا مرا ہنسی ہی سہی — دل لگی ہے تو دل لگی ہی سہی
کل تو رونا پڑیگا ہنس لو آج — عشق کی ابتد ہنسی ہی سہی
لطف ابر بہار تم دیکھو — دیدۂ تر ، نمائشی ہی سہی
آزمائش ہے ظرف واعظ کی — میرے حصے میں کچھ کمی ہی سہی
نہ بجھاؤ مرا چراغ وفا — رونق بزم مدعی ہی سہی

سو بندشیں تھیں رنگ پریدہ کے واسطے
یہ جانتا اگر کہ حنا کو تلاش ہے
پھرتی ہے پیچھے پیچھے اجل ، اُف ری زندگی!
ملتا نہیں ہے درد ، دوا کو تلاش ہے

جو بے نیاز صدمہ مضراب ہو چکا
اُس ساز بے صدا کی نوا کو تلاش ہے
کیوں زلف ناز صبح سے بل کھا رہی ہے آج
کیا جانے کس کی شام بلا کو تلاش ہے
اے خار مژدہ باد کہ اُبھرے پھر آبلے
شاد اے خلش کہ پھر کف پا کو تلاش ہے
نا آشنائے عالم ذرات ہے "تپش"
وہ مشت خاک جس کی صبا کو تلاش ہے

نہ جاگی آج تک تقدیر دیکھا چاہئے کیا ہو
مرے اس خواب کی تعبیر دیکھا چاہئے کیا ہو
ہوا جاتا ہے خالی یہ نشیمن بھی تصور کا
پریدہ رنگ ہے تصویر، دیکھا چاہئے کیا ہو
ابھی آغاز ہے، بگڑا ہے نقشہ بزم ہستی کا
ابھی نالوں میں ہے تاثیر، دیکھا چاہئے کیا ہو
ہزاروں نقش پا سجدہ طلب اور بے نشاں منزل
ترا انجام اے رہگیر! دیکھا چاہئے کیا ہو
ابھی کن مشکلوں سے بل نکالے تھے مقدر کے
کیا پھر زلف کو زنجیر، دیکھا چاہئے کیا ہو
"تپش" تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا نہیں مٹتا
نہیں بنتی کوئی تدبیر، دیکھا چاہئے کیا ہو

دنیا میں پھر آغاز ہے کافر منشی کا — اچھا ہے کہ پھر کعبہ کو بتخانہ بنا دے
اک حرف تمنا ہے سنا دوں تجھے قاصد — ایسا تو نہیں بات کو افسانہ بنا دے
پھر توبہ کے ٹکڑوں پہ گزر ہے مری ساقی — پھر مجھ کو گدائے در میخانہ بنا دے

خجل ہے طائر رنگ پریدۂ ہستی — رہا قفس ہی سلامت، نہ آشیانہ ملا
ہوائے جنبش دامن کا ذکر کیوں چھیڑا — چراغ عمر کو گُل ہونے کا بہانہ ملا
غضب تھا پردۂ خود داریٔ حرم اُٹھنا — ہوئی یہ خیر کہ بتخانے میں خدا نہ ملا

کہیں واعظ بہک آیا نہ ہو مسجد کے دھوکے میں
کوئی کھڑکا رہا ہے دیکھنا زنجیرِ میخانہ

نعرۂ مستانہ

مقام بے خودی میں دورِ دوراں کا کسے غم ہے
وہ دنیا اور دنیا ہے وہ عالم اور عالم ہے

نہ پوچھو منزلت ہم بادہ مستانِ محبت کی
کہ اک پٹکا ہوا ساغر ہمارا ساغر جم ہے

نرالا ہے سرور اپنا ، انوکھا ہے خمار اپنا
سوا ہے اس قدر ہی کیف مستی جس قدر کم ہے

ازل کہتے ہیں جس کو سر بسر ایوان خمیازہ
ابد ہے نام جس کا ایک کیفیت کا عالم ہے

حیات و موت دو موجیں ہیں اپنے ساغر مے کی
عدم ہے بیخودی ، ہستی خودی کا اپنی اک رَم ہے

فنا کیسی ، بقا کس کی ، کہاں کا عالم برزخ
وہ ہاو ہوئے مستانہ ، یہ بد مستی کا عالم ہے

وہ اک پھوٹا ہوا ساخُم ہے جس کو گور کہتے ہیں
تماشا گاہ محشر ایک شور خیر مقدم ہے

بہار ہشت جنت چار دھبے اپنے دامن کے
شراب آتشیں کا اک دھواں نارِ جہنم ہے

کہاں کا دیر ، کعبہ کیا ، وہاں بھی ہم ، یہاں بھی ہم
جسے خمخانہ سب سمجھے ہوئے ہیں چاہ زمزم ہے

نہ ساقی سے جدا ہم ہیں نہ ہم سے ہے جدا ساقی
ہوئے فانی تو پھر باقی کہاں تفریق باہم ہے

سرور جام ساقی نے بنایا ایسا متوالا
خوشی کی ہے خوشی باقی نہ غم کا اب کوئی غم ہے

ہمیں سے دونوں عالم ہیں ہمیں ہیں دونوں عالم میں
سوا و ما سوا جو کچھ تپش ہے ہم میں منضم ہے

مرقع شوق

عالم دل ہے نور دیدۂ شوق
میری ہستی ہے آفریدۂ شوق

مدعائے نظر ہے حسن نظر
ہمہ تن بن گیا ہوں دیدۂ شوق

ہو گئی کل اُمید جذب فنا
مٹ گیا دل کا سب عقیدۂ شوق

آہوئے دشت قیس کی ہے تلاش
دیدۂ شوق ہیں رمیدۂ شوق

غنچہ دل سے باز پرس نہ کر
اے نسیم وفا وزیدۂ شوق

تار دامن ہوئے گریباں گیر
مدد اے دست نا رسیدۂ شوق

چشم پوشی کی ہے طلب یعنی
پیرہن ہوں مگر وریدۂ شوق

ہے تمنائی نیازِ جبیں
سرِ راہ وفا خمیدۂ شوق

ننگ صحرائے بے خودی ہوں میں
میرا ہر ذرہ ہے کبیدۂ شوق

چشم اشک آفریں کو کیا کہئے
جام لبریز ہے دمیدۂ شوق

نہ کھلی چشم منتظر نہ کھلی
مرحبا جاں بلب رسیدۂ شوق

خوف کیا اب شکستہ رنگی کا
صورت حال ہے کشیدۂ شوق

ہائے کیوں کر ہو اعتبار خیال
مدعا اور برگزیدۂ شوق

ہے غزل میں ''تپش'' شباب کا رنگ
لکھ رہا ہوں ابھی عقیدۂ شوق

اختر شیرانی



محمد داؤد خاں نام - اختر تخلص ۴ مئی ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے - بزرگ صوبہ سرحد سے آئے تھے - دادا مولوی محمد اسماعیل خاں ٹونک کے نواب محمد علی خاں کے مختار تھے - اختر شیرانی کے والد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں -

اختر شیرانی کی ابتدائی تعلیم ٹونک میں ہوئی - جہاں پندرہ برس کے سن تک انہوں نے اردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں اور خطاطی میں مشق و مہارت حاصل کی - اختر کے والد پروفیسر محمود شیرانی ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تھے - وہ چاہتے تھے کہ اپنی نگرانی میں اختر کی تعلیم و تربیت کی جائے - چنانچہ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اختر کو لاہور بلا لیا اور اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا - اختر نے ۱۹۲۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا - اب ان کے والد مرحوم نے ان کو میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کرا دی - لیکن ان کے میلان طبع اور ماحول نے شفیق باپ کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی اور امتحان سے چند ماہ قبل ہی اختر لاہور سے فرار ہو گئے -

لاہور کے مختصر دوران قیام میں ہی اختر کی شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ اپنی چند غزلیں علامہ تاجور نجیب آبادی کو جو اس وقت مخزن کے ایڈیٹر تھے، دکھا چکے تھے - چنانچہ امتحان سے روگردانی کر کے، کچھ دن کے بعد اختر لاہور واپس آگئے اور شعر و شاعری ان کا مستقل مشغلہ بن گیا - ساتھ ہی وہ مختلف رسائل کے لئے مضامین بھی لکھنے لگے - اس کے بعد انہوں نے رسائل کی ادارت کا کام سنبھالنا شروع کیا - سب سے پہلے وہ چند ماہ کے لئے ''ھمایوں'' کے مدیر رہے پھر چند ماہ ''انتخاب'' کی ادارت کی - ۱۹۲۸ء میں اختر شیرانی نے اپنا ایک پرچہ ''خیالستان'' نکالا مگر وہ کارکنان کی بد دیانتی کی نذر ہو گیا - ۱۹۳۱ء میں انہوں نے دوسرا پرچہ ''رومان'' جاری کیا لیکن اس کا حشر بھی ''خیالستان'' کا سا ہوا - ۱۹۳۱ء میں ''شاھکار'' کی ادارت سنبھالی مگر بعض وجوہ کی بنا پر انہیں خود اس سے علیحدہ ہونا پڑا - غرض اس مشغلہ میں اختر شیرانی گو اپنی شرافت، نیک نیتی اور سادہ لوحی کے باعث کامیاب نہ ہو سکے مگر ادبی حلقوں میں نہ صرف روشناس ہو گئے بلکہ لوگوں کے دلوں پر ان کے زور قلم کا سکہ بھی بیٹھ گیا -

اختر شیرانی کی نثری کاوشوں سے قطع نظر نظم کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) پھولوں کے گیت — بچوں کے لئے نظمیں
(۲) نغمۂ حرم — خواتین کے لئے نظمیں
(۳) صبح بہار — نظموں کا پہلا مجموعہ
(۴) اختر ستان — نظموں کا دوسرا مجموعہ
(۵) لالۂ طور — نظموں کا تیسرا مجموعہ
(۶) طیور آوارہ — غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ
(۷) شہناز — غزلوں اور نظموں کا مجموعہ
(۸) شہرود — باقیات اختر کا مجموعہ جو اُن کے انتقال کے بعد بیگم اختر شیرانی نے شائع کرایا۔

اختر شیرانی فطری طور پر بڑے خوش اخلاق، ملنسار اور مستغنی‌الطبع واقع ہوئے تھے اور شروع ہی سے بڑے دوستدار اور دوست نواز، مگر افسوس کہ کثرت احباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں ہر برے بھلے سے نباھنا پڑی اور بہت سے شرابی کبابی اور عامی و جاھل دوست ان کے گرد جمع رہنے لگے ایسی ہی صحبتوں میں اختر شیرانی نے اپنی علمی و فنی صلاحیتوں میں گھن بھی لگایا اور شراب نوشی کا مہلک چسکا بھی پڑا۔ اختر کی شراب نوشی نے آھستہ آھستہ خطرناک صورت اختیار کرنا شروع کی، پروفیسر شیرانی نے صرف ایک اس کمی کے باعث اُن سے قطع تعلق کر لیا مگر اس کے باوجود اختر شیرانی شراب ترک نہ کر سکے حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں اُردو کا یہ ہونہار شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

اختر شیرانی کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری فلسفہ و تصوف کی بجائے حسن مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائت سے معمور ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور اُن کی تمام شعری کائنات پر جوانی چھائی ہوئی ہے۔ اُن کی شاعری کی روح تغزل ہے۔ اور وہ اس روح تغزل اور موسیقیت کو اپنی غزلوں، نظموں اور گیتوں پر پھیلا کر اپنا ایک انفرادی رنگ قائم کرتے ہیں۔ جن میں ولولہ انگیز ترنم رنگینی، نزاکت ادا اور جدت تراکیب نے اور بھی جان ڈال دی ہے۔ اختر کے یہاں ایک عجیب سر مستی، ایک شدید احساس اور ایک ایسی تیزی و تندی پائی جاتی ہے کہ اُن کی غزلیں اور نظمیں بھی جوان معلوم ہوتی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ھمیں اُن کے کلام میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں ملتی، تاھم ھمیں اُس کی سیلابی کیفیت کا معترف ہونا پڑتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی رو میں دور تک بہا لے جاتی ہے۔

اختر شیرانی ایک نوجوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفیس مذاق اور حسن پسند نظر کے مالک تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے کلام میں بڑے حسین و دلکش موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ بنا بریں ”خدائے رقص“ ”اعتراف“ ”ترانہ“ وغیرہ منظومات اپنے انتخاب موضوع کے اعتبار سے بالکل انوکھی نظمیں ہیں۔ پھر شاعر نے محض موضوع ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بحروں کا انتخاب بھی نئے انداز میں کر کے

ان کی روانی و دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان نظموں میں معنویت و مفہوم خوش آہنگی پر کہیں قربان نہیں ہونے پاتا ۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے اختر کو نہ صرف زبان پر قدرت حاصل ہے بلکہ انکے انتخاب الفاظ ، تراکیب، تشبیہات و استعارات میں اکثر جدت و خوش آہنگی بھی پائی جاتی ہے اور واضع معنویت بھی ۔ یوں اُن کی بہت سی غزلیں آپ کو بالکل سپاٹ بھی ملینگی جن میں کوئی نیا تخیل نہیں ، نہ کوئی نئی بات پیش کی گئی ہے مگر اُن میں بھی آپ کو بلا وجہ کی پیچیدگی اور اُلجھاؤ یا الفاظ کا خواہ مخواہ الٹ پھیر نہیں ملے گا ۔

اختر شیرانی نے اپنی انہیں خصوصیات کلام کی بدولت کم عمری میں پختہ کاروں کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ حالات نے اُنھیں فنی یا ارتقائی حیثیت سے زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا اور نہ ہی عمر نے وفا کی ۔

انتخاب کلام

تغزل

وعدہ، اُس ماہرو کے آنے کا ۔۔۔ یہ نصیبہ ! سیاہ خانے کا
ذرے ذرے میں بے حجاب ہیں وہ ۔۔۔ جن کو دعویٰ ہے منہ چھپانے کا
حاصل عمر ہے شباب ، مگر ۔۔۔ اک یہی وقت ہے گنوانے کا
اُس کی بدلی ہوئی نظر، توبہ ! ۔۔۔ یوں بدلتا ہے رخ زمانے کا

کر دیا خوگر ستم "اختر"
ہم پہ احسان ہے زمانے کا

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی ۔۔۔ یہ سیل نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف ۔۔۔ جیسے مستی میں اُلٹ دے کوئی پیمانے چند
چٹکیاں لینے لگا دل میں نشاط طفلی ۔۔۔ آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند

گلزار جہاں میں گل کی طرح ، گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبح خزاں ، سب ناز عبث اک خواب ہیں ہم

دو دن کے لئے ہم آئے ہیں ، اک شب کی جوانی لائے ہیں
فردوس سرائے ہستی میں ، ہم رنگ گل مہتاب ہیں ہم

ادائے پردہ کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے
پس پردہ کوئی ناز آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے
کسی کا عشق آ پہنچا ہے رسوائی کی منزل تک
نگاہ شوخ ! اب کچھ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے اٹھلا کے جب پیمانہ رکھتے ہیں
جوانی بھی تو اک موج شراب تند و رنگیں ہے
برا کیا ہے اگر ہم مشرب رندانہ رکھتے ہیں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی جھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

ہیں بحر مے سے بہم ، میکدے میں شام و سحر
کہ ماہتاب قدح ، آفتاب ہے ساقی

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو
وہ سلمیٰ کا خرام رائیگاں ہے

ہے نشاط لالہ و گل میں کیا ، ہے بہار سرو سمن میں کیا
مجھے کب دماغ ہے سیر کا ، میں کروں گا جا کے چمن میں کیا ؟
مرا واسطہ ہے خطا سے کیا ، مرا کام باغ ختن میں کیا ؟
وہ شمیم روح فزا نہیں ترے گیسوؤں کی شکن میں کیا ؟

همه فتنه و همه فتنه گر، همه تیره دل، همه خیره سر
ہے یہ حال اہل وطن اگر، تو کرینگے جا کے وطن میں کیا؟
وہ سواد رنگ و نظر نہیں، وہ فضائے شام و سحر نہیں
وہ بہار باغ و شجر نہیں تو ہے لطف سیر چمن میں کیا

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے؟
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے؟
ویراں ہیں صحن و باغ، بہاروں کو کیا ہوا
وہ بلبلیں کہاں وہ ترانے کدھر گئے؟
تھے وہ بھی کیا زمانے کہ رہتے تھے ساتھ ہم
وہ دن کہاں ہیں اب وہ زمانے کدھر گئے؟
ہے نجد میں سکوت ہواؤں کو کیا ہوا
لیلائیں ہیں خموش دوانے کدھر گئے؟
صحرا و کوہ سے نہیں آٹھتی صدائے درد
وہ قیس و کوہ کن کے ٹھکانے کدھر گئے؟
آجڑے پڑے ہیں دشت غزالوں پہ کیا بنی
سونے ہیں کوہسار دوانے کدھر گئے؟
وہ ہجر میں وصال کی آمید کیا ہوئی
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے؟
غیروں سے تو آمید وفا پہلے ہی نہ تھی
رونا یہ ہے کہ اپنے یگانے کدھر گئے؟
دن رات میکدے میں گزرتی تھی زندگی
"اختر" وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے

یہ کون آیا بزم گل و یاسمن میں — کہ شادابیاں جاگ آٹھیں چمن میں
ہر اک ذرہ اک آنکھ بن کر ہے مضطر — وہ کب آئیں گے میرے دارالمحن میں
یہ کس نے نگاہ بہارِیں سے دیکھا — کہ پھولوں نے انگڑائی سی لی چمن میں
یہ مطلب کا بندہ وہ مطلب کا بندہ — نہیں فرق کچھ شیخ اور برہمن میں
تری یاد باقی ترا غم سلامت — بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں
یہ سیمیں بدن اور شفق رنگ عارض — کہ گل ہائے احمر ہیں شاخ سمن میں

چمن کیا جواب اُس چمن وش کو دیگا
بہت فرق ہے گل میں اور گلبدن میں

اُٹھو بادہ نوشو، کریں رقص مستی
وہ آئی بہار، ابر گونجا چمن میں

وہ جان بہار آج آئے گی ''اختر''
چلو چل کے کلیاں بچھا دیں چمن میں

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں، خوش رہیں، مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرور محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شب وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کِھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہار محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخئی مے سے زاہد
تجھے باغ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشق رسوا کو ''اختر'' دعا دیں

کون آیا ہے مرے پہلو میں خواب آلودہ
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابر سر مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جام شراب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہار چمن ہے باقی
نگاہ شمع سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شام غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغ صبح وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگ داغ کہن ہے باقی

حباب آسا محیط ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیر چرخ کہن ہے باقی
غم زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبع ''اختر''
نہ وہ نشاط کہن ہے باقی نہ وہ مذاق سخن ہے باقی

منظومات

تاثرات نغمہ

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا !
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موج زن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا !
خلا میں پرفشاں ہیں خواب کی شہزادیاں گویا !
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں ..
اور ان میں منتظر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا !

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر ماہتابوں کے جزیرے ہیں
بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں
فضا ہے مست موج نکہت باد بہاری سے
اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ بکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُر خواب فضائیں
اک موج طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ھجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ھیں بہکے ھوئے تارے

یہ تارے ھیں یا نور کے مے خانے ھیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ھیں آباد
مستانہ ھواؤں پر پری خانے ھیں آباد
یا دامن افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ھے یا نور کی خوابیدہ پری ھے
الماس کی صورت ھے کہ مندر میں دھری ھے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ھے
اور تیرتی ھے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ھیں کھوئی ہوئی بے دار ھوائیں
گل زار میں گل ریز گہر بار ھوائیں
یا نور میں ڈوبی ھوئی سرشار ھوائیں
یا بال فشاں مستئی نکہت کے نظارے

صحرا ھیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنا ھے یہیں رات گزارے

انتظار (گیت)

اب بھی نہ آئے من کے چین
بیت چلی ھے آدھی رین
نا کوئی ساتھی نا کوئی ساجن نا کوئی میرے پاس سہیلی
برھہ کی لمبی رات گزاروں ڈر کی ماری کیسے اکیلی
نیر بہائیں کب تک نین
اب بھی نہ آئے من کے چین

نظریں جمی ہیں چوکھٹ پر اور کان لگے ہیں آہٹ پر
آنکھوں سے ننھے ننھے سے آنسو بہتے ہیں اک اک کروٹ پر
کرتی ہوں چپکے چپکے بین
اب بھی نہ آئے مورے چین !
بیت چلی ہے آدھی رین !

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگین سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ھجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستان جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے ' اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے ' یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے ' تو اس کا کھویّا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جس آس پہ جیتے تھے، اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ جبر کدہ آزاد افکار کا دشمن ہے
احرار کا مدفن ہے ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی سی سر سبز اور شاداب نما دنیا
للّٰہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو قرنوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جسکے مناظر پر تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی لہروں میں
ٹھہری ہوئی لہروں میں، سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ایسی بہشت آئین وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے پائیں
لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

رخصت دائمی

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے یاد بہار چھوڑ گئے
ہماری چشم حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے
جسے سمجھتے تھے اپنا وہ اتنی مدت سے
اسی کو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے
رگوں میں اک طپش درد کار جاگ اٹھی
دلوں میں اک خلش انتظار چھوڑ گئے
ہوائے شام سے آنے لگی صدائے فغاں
فضائے شوق کو ماتم گسار چھوڑ گئے
نشاط محفل لیل و نہار لوٹ لیا
نصیب میں غم لیل و نہار چھوڑ گئے
گھٹائیں چھائی ہیں ، ساون ہے مینہ برستا ہے
وہ کس سمے میں ہمیں اشکبار چھوڑ گئے
دل حزیں ہے اب اور عہد رفتہ کا ماتم
چمن کے سینے پہ داغ بہار چھوڑ گئے
چھڑا کے دامن امید دل کے ہاتھوں سے
سواد یاس میں ماتم گسار چھوڑ گئے
نہ آیا رحم مرے آنسوؤں کی منت پر
کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے
امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل
امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں
یہ نقش گیسوئے مشکیں بہار چھوڑ گئے
ترس رہے ہیں مسرت کو عشق کے ارماں
ہمیں ستم زدہ و سوگوار چھوڑ گئے
اُمید خستہ ، سکوں مضطرب ، خوشی بسمل
جہان شوق کو آشفتہ کار چھوڑ گئے
نگاہ درد کی عرض حزیں قبول نہ کی
ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے
کسے خبر ہے کہ اب پھر کبھی ملیں نہ ملیں
نظر میں اک ابدی انتظار چھوڑ گئے
ہماری یاد بھلا کر وہ چل دیے "اختر"
اور اپنی یاد ، فقط یادگار چھوڑ گئے

اثر صہبائی



عبدالسمیع پال نام، اثر تخلص ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ مورث اعلیٰ وادئی کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ اثر صاحب کے والد مولوی احمد دین صاحب پال مرحوم (پال کشمیری راجپوتوں میں ایک ذات ہے) جماعت اہل حدیث میں ایک فاضل و ممتاز بزرگ تھے۔ انھیں کی مذہبی آغوش میں اثر صاحب نے آنکھیں کھولیں مگر تعجب ہے کہ گھر کے شدید مذہبی ماحول کے باوجود وہ دولت شاعری سے محروم نہ رہے۔

اثر صاحب کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی جہاں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد لا کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں ایل۔ بی کرنے کے بعد وکالت کا کام شروع کیا۔ پھر چند سال اس طرح گزار کر ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔

صہبائی صاحب نے اگرچہ گیارہ بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دئیے تھے لیکن اسلامیہ کالج کے طالب علمی کے زمانے میں لاہور کی رنگیں و شعر انگیز فضا نے موصوف کے ذوق شعری کو اور جلا دی اور یہاں آ کر آپکی طبیعت اور شاعری نے آزادی کی سانس لی۔ ۱۹۲۷ء میں آپکی شادی ہوئی اور زندگی کا ایک خوشگوار دور شروع ہوا مگر افسوس کہ یہ سہانا خواب زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور ۱۹۳۱ء میں موصوف کی اہلیہ جنہیں آپ ''راحت'' کہتے تھے انتقال کر گئیں۔ اس سانحہ عظیم کا اثر صہبائی صاحب کے خیالات اور شاعری دونوں پر بہت پڑا اور حسن و شباب کی تمام رعنائیاں اور عشق و محبت کی ساری سرمستیاں اب حزن و ملال اور درد و کرب میں ڈوب گئیں۔

صہبائی صاحب پہلے کچھ عرصہ اپنے وطن سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے رہے پھر جموں چلے گئے جہاں ۱۹۴۶ء میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ چند ماہ بعد جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں اسٹنٹ ایڈوکیٹ ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کشمیر سے سیالکوٹ واپس آ گئے اور نومبر ۱۹۴۷ء میں دوبارہ پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۴۸ء میں چند ماہ اسٹنٹ

کسٹوڈین کے فرائض انجام دینے کے بعد یہاں بھی آپ سرکاری وکیل بنا دئے گئے اور آج تک آپ بفضلہ اس عہدے کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں - آج کل آپ کا قیام لاہور میں ہے -

صہبائی صاحب بڑے خوش اخلاق ' با مروت اور وضع دار انسان اور علم و ادب کے بڑے قدر دان ہیں - وہ حق و صداقت کے پرستار ہیں مذہب آنکی زندگی و شاعری کا اہم ترین جزو ہے - اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ آنکی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے وہ زر پرستی ' عیش کوشی ' ریا کاری اور جاہ طلبی جیسے ذمائم اخلاق کے خلاف ہمیشہ آنہیں صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کریگی -

اثر صاحب نے ابتداً اپنا کلام اپنے بڑے بھائی ''امین حزیں'' کو دکھایا اور کچھ غزلیں مرحوم مولانا تاجور نجیب آبادی کو دکھائیں ' اسکے علاوہ علامہ کیفی دہلوی اور حضرت اثر لکھنوی نے بھی آنکے کلام کا بیشتر حصہ دیکھ کر آنہیں اپنے مشوروں سے مستفید کیا اور خود اثر صاحب کے الفاظ میں ''مولانا سید سلیمان ندوی نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما کر مجھ میں یقین و اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا'' ہر موقعہ پر آن کی یہ خواہش اور کوشش رہی - کہ ان کا کلام ممتاز نقادان فن کی نگاہ سے گذرتا رہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اثر صاحب کا زر شاعری ان متعدد مستند کسوٹیوں پر چڑھنے کے بعد پہلے ''خالص'' ہوا پھر آس نے ایک ''سکہ بند'' شکل اختیار کر لی اور آجکل بجا طور پر آن کا شمار پاکستان و ہند کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے -

جناب اثر کے فطری شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں - آن کے کلام میں عشق و محبت کی رنگینیاں کم اور حکیمانہ اسرار و رموز کی عقدہ کشائی زیادہ ہے - آن پر اقبال ' میر اور غالب کا خاصا اثر ہے - وہ اپنے دھیمے سروں میں بڑی پر معنی باتیں کہنے کے عادی ہیں - آنکے خیالات بڑے رفیع اور ساتھ ہی بہت سلجھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان حکیمانہ خیالات کی جان وہ نرم وشیریں زبان ہے جسکے برتنے پر اثر صاحب کو بڑی قدرت حاصل ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کسی صنف کلام میں بند نہیں - آنہوں نے غزلیات ' قطعات ' رباعیات اور نظمیں سب کچھ کہی ہیں - لیکن بقول مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ''ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے یہی سبب ہے کہ آنکی غزلوں کے مقابلے میں آنکی رباعیات اور قطعات زیادہ پر معنی اور زیادہ موثر ہیں'' - لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ آنکی غزلیں اور نظمیں پھیکی یا بے کیف ہوتی ہیں - بلکہ غزل کے معاملہ میں تو ہمارا خیال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بڑی تیزی سے قدم آگے بڑھایا ہے اور اب آنکی غزلیں بڑے رچے ہوئے رنگ میں دیکھنے میں آتی ہیں - بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب شاعر ہیں آن کا کلام کیف و سرور کا خزینہ اور زبان شگفتہ و دل نشیں ہے -

اب تک اثر صہبائی صاحب کے کئی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں چنانچہ ۱۹۲۸ء میں آنکی رباعیات کا مختصر سا مجموعہ ''جام صہبائی'' کے نام سے شائع ہوا - ۱۹۳۳ء میں آن کا شاہکار ''خمستان'' طبع ہوا - ۱۹۳۷ء میں رباعیات کا دوسرا مجموعہ ''جام طہور'' کے نام سے منظر عام پر آیا ۱۹۴۵ء میں

"روح صہبائی" ایک اور مجموعہ شائع ہوا۔ حال میں ان کا چوتھا مجموعہ کلام "بام رفعت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ابھی بہت سا کلام قابل اشاعت ہے۔

انتخاب کلام

ملی ہے جاں مگر آرام جاں نہیں ملتا
کہیں جہاں میں دل شادماں نہیں ملتا
خدا کی دین ہے جسکو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

تمہارا ذکر مرے کیف و حال کی دنیا
تمہاری یاد ہے میرے خیال کی دنیا
جو تیرے عشق کے زخموں سے رہ گئی محروم
وہی حیات ہے رنج و ملال کی دنیا
نظر ہٹا کے بتوں سے جاتی ہے دل پر
کہ دل ہے درد و غم لازوال کی دنیا

گو تو نہیں ملا ہے مگر تیرے شوق میں
یہ وقفۂ حیات تو اچھا گزر گیا

صبح ازل سے ہے رواں، یہ نہ مگر ہوا عیاں
کون ہے میر کارواں، منزل کارواں ہے کیا؟

آن سے آغاز رسم و راہ ہوا
آخر کار دل تباہ ہوا!

کعبہ میں ہو یا ہو بتکدے میں
ہر سنگ ہے آستاں کسی کا
گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے
دل کو ہے مگر گماں کسی کا

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم
سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
کیا خوب بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم

لطف گناہ میں ملا اور نہ مزا ثواب میں
عمر تمام کٹ گئی کاوش احتساب میں
تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا
میرے جنوں نے بھر دئے رنگ ترے شباب میں

آہ یہ دن کہ جانگداز جوشش اضطراب ہے
ہائے وہ دَور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں

وہی ساعتیں حاصل زندگی ہیں گزر جائیں جو مستی و بے خودی میں

آستانے نگاہ سے گزرے مائل بندگی جبیں نہ ہوئی
لاکھ جلوے رہے نگاہوں میں کوئی تصویر دل نشیں نہ ہوئی
کعبہ و دیر و میکدہ میں رہے دل کی تسکیں مگر کہیں نہ ہوئی

ایک جاں پر ہزارہا آفت پھر بھی شکر خدا کرے کوئی
نظر شوق تجھ کو ڈھونڈتی ہے دیر و کعبہ کو کیا کرے کوئی

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جان بہار
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا ہی اک درد بھرا افسانہ ہے
برگشتہ قسمت والوں کا نےَ کعبہ نےَ بتخانہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں آنکے، یا موت ہے یا پیمانہ ہے
ہر شاخ جب اک مستانہ ہے، ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توبہ! ایسے میں توبہ!! جب فطرت خود میخانہ ہے
برسات کی چاندنی راتوں میں، دیکھے تو کوئی صہبائی کو
لب پر ہیں مناجاتیں لاکھوں اور ہاتھوں میں پیمانہ ہے

فراغت ہے اب فکر سود و زیاں سے محبت کی دیوانگی مل گئی ہے
ترے اک تبسم سے اے جان خوبی مجھے دو جہاں کی خوشی مل گئی ہے
اثر آسکو پاتا ہوں میں بے خودی میں
مری بے خودی ہی مری آگہی ہے؛

تم یاسمن و لالہ و گل سے بھی ہو رنگیں
تم خندۂ معصوم سحر سے بھی حسیں ہو!
تم عرش بریں پر ہو کہ اس سے بھی کہیں دور
محسوس یہ ہوتا ہے، رگ جاں سے قریں ہو!
سو رنگ کے پردوں میں بھی چھپ جاؤ اگر تم
میری نگہ شوق سے مستور نہیں ہو
آغوش محبت ہو تو آغوش میں ہے حسن
ہر گام پہ منزل ہے، جو منزل کا یقیں ہو

یاد تری شراب ہے ذکر ترا سرور ہے
کیف طرب میں موجزن میرا یمِ وجود ہے
اپنی ہی دھن میں عرش سے آگے نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غم صعود ہے
اس میں کہاں سرور و نور آگ ہی آگ ہے ہوس
مثل سموم ہر نفس آہ برنگ دود ہے
آنکھ ہو حق شناس اگر آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بتکدۂ نمود ہے
پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے دُھلی ہوئی
عرش بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا ورود ہے
فکر دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے
غرق سرور نور ہوں جام و سبُو سے دور ہوں
میرے لئے کھُلا ہوا میکدۂ شہود ہے

رباعیات

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا
ظاہر ہے کہ ایک روز مرنا ہوگا

لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل
کیا ڈوب کے مجھ کو پھر ابھرنا ہوگا

مدت ہوئی زخم دل پہ کھاتے کھاتے
اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اثر
آتا ہے قرار دل کو آتے آتے

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر
اے ننگ جہاں روح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہ ہستی میں وقار
کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

گزری ہے جگر کے زخم سیتے سیتے
زہرآبِ الم کے جام پیتے پیتے
سو بار اگرچہ کوہ غم بھی ٹوٹے
گردن نہ کبھی جھکے گی جیتے جیتے

سرمایۂ افتخار آدم ہے یہی!
جبریل یہی ہے اسم اعظم ہے یہی
ہے تیرے مقدر میں غم عشق اگر
خوش باش کہ حاصل دو عالم ہے یہی

انسان کا قلب جب سنبھل جاتا ہے
جادو ہر شے پہ اس کا چل جاتا ہے
ڈھل جاتے ہیں دو جہاں نئے سانچے میں
انداز نگاہ جب بدل جاتا ہے

منظومات

پلائے جا

بہار ہے نگار ہے کنار جوئبار ہے
فضائے کوہسار ہے رباب آبشار ہے
نسیم خوشگوار ہے جہان زرنگار ہے
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

ستارے ہیں یہ سو بہ سو چھلک رہے ہیں یا سبو
رواں ہے کہکشاں کی جو ہر ایک شے ہے مشکبو
یہ بزم حسن ہو بہو ! ہے اک طلسم رنگ و بو
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

کبھی بہار کا سماں ! کبھی ہے منظر خزاں
یہ زندگی کی داستاں عجیب سی ہے چیستاں
رواں ہے ایک کارواں خبر نہیں مگر کہاں
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

کرم ہو ساقیا کرم ! نگاہ مست کی قسم
چلے وہ دور جام جم کہ بھول جائیں کیف و کم
یہ محفلیں ہیں مغتنم کہ زندگی ہے کوئی دم
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

سرگزشت

مرغزاروں میں چمن زاروں میں کہساروں میں
چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شب تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں
شب مہتاب کی مہکی ہوئی رعنائی میں

شفق شام کی رنگینی و سرشاری میں
صبح پرکیف کے انوار کی بیداری میں
حسن معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے

دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی
نہ گئی دل کی تپش شعلہ فشانی نہ گئی
تیر پر تیر برستے رہے مجھ پر برسوں
سنگدل دُور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
یورش غم بھی سہی، رنج و محن بھی دیکھے
رہ اُلفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے

بزم امکاں میں رہا ظلمت باطل کا ہجوم
چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم
ہیبت اہرمنی چاروں طرف طاری تھی
مرد حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لئے خنجر خونخوار کہیں
زہر کا جام کہیں، نار کہیں، دار کہیں
پرچم حق و صداقت کو اُٹھایا میں نے

پھول اور ستارہ

میں لالۂ صحرا ہوں! تو عرش کا تارا ہے
چاہوں کہ پہونچ جاؤں،
اُڑ کر تری محفل میں،
پر میری تگ و دو کیا!
کچھ دور ذرا اُڑ کر!
پھر خاک پہ گر جاؤں،
گرتے ہی فنا ہو جاؤں،
میں لالۂ صحرا ہوں! تو عرش کا تارا ہے

میں لالۂ صحرا ہوں! تو عرش کا تارا ہے

تیرے لئے ممکن ہے
تو چاہے تو بن جائے
قطرہ مئے شبنم کا !
اور صبح بہاراں میں
میرے دل سوزاں پر !
اک بار برس جائے
تو عرش کا تارا ہے میں لالۂ صحرا ہوں !

ساغر نظامی



محمد صمد یار خاں نام ساغر تخلص ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو محلہ بالائے قلعہ، علی گڑھ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد کا نام ڈاکٹر احمد یار خاں اور مورث اعلیٰ کا نام سردار شہباز خاں تھا - سردار شہباز خاں نواب جھجھر کی فوج کے سپہ سالار تھے اور موصوف کو غدر میں نواب کے ساتھ پھانسی دی گئی - ساغر نظامی کی مذہبی، اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی اور انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ اور محدود طور پر ایم - اے - او کالج علی گڑھ میں ہوئی - شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی - چنانچہ ۱۹۱۸ء سے جبکہ انکی عمر تیرہ سال کی تھی وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا - ۱۹۲۳ء میں مولانا مرحوم کی شرکت میں آگرہ سے رسالہ "پیمانہ" جاری کیا اور اس کی ادارت کا کام بھی سنبھالا لیکن ۱۹۲۶ء میں مزاجی و ادبی اختلافات کی بنا پر استاد و شاگرد کا یہ تجارتی و ادبی اشتراک اس طرح ختم ہوا کہ نہ صرف یہ بعد میں استوار نہ ہو سکا بلکہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے ایک حریفانہ کشمکش کی صورت اختیار کر گیا -

ستمبر ۱۹۲۶ء سے ساغر صاحب نے اپنے وطن علی گڑھ سے ماہنامہ "مستقبل" جاری کیا - لیکن یہ پرچہ بعض وجوہ کی بنا پر زیادہ دن نہ چل سکا - ۱۹۲۸ء میں انہوں نے ایک نیم مزاحی و ادبی اخبار "علی گڑھ پنچ" نکالا - اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہفتہ وار "استقلال" کی اشاعت شروع کی جس میں ساغر صاحب کے سیاسی جذبات و تفکرات کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ہوئی - اگست ۳۰ء سے جولائی ۳۱ء تک وہ اپنے والد کے ہمراہ مظفر نگر میں رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے متعدد نثر کی کتابیں لکھیں - رسالہ "پیمانہ" کی ادارت کی اور اپنے کلیات "بادۂ مشرق" کی ترتیب و تصحیح کی - لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود ۱۹۲۹ء سے انہوں نے عملی سیاست میں جو حصہ لینا شروع کیا تھا وہ برابر جاری رہا -

۱۹۳۲ء میں ساغرصاحب کے والد کا تبادلہ میرٹھ ہو جانے پر یہ بھی والدین کے ہمراہ میرٹھ پہنچ گئے - یہاں انہوں نے ادارہ ادبی مرکز کی بنیاد ڈالی - ایک مکتبہ قائم کیا اور ایک اردو لیتھو پریس "ساغر پریس" کے نام سے جاری کیا - یہیں سے انہوں نے

اپنی نگرانی و اہتمام میں ''بادۂ مشرق'' شائع کی ۔ اس کے علاوہ اور دوسری کتابیں بھی اس ادبی مرکز نے شائع کیں لیکن ان کتابوں سے بھی زیادہ گراں قدر خدمت اس ادارے کے ماہنامہ ''ایشیا'' نے انجام دی جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک برابر نکلتا رہا اس طرح میرٹھ میں مستقل گیارہ سال تک علمی و ادبی خدمات انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں انہوں نے اس محبوب شہر کو خیر باد کہا اور دکن کے عظیم الشان تاریخی شہر پونا کو سدھارے جہاں انہیں ''شالیمار پکچرز'' میں بحیثیت اسٹوری رائٹر ' مکالمہ نگار اور شاعر بلا لیا گیا ۔ پونا کے دوران قیام میں ساغر صاحب نے فلمی مصروفیات کے باوجود اپنے محبوب ماہنامہ ''ایشیا'' کو جاری رکھا ۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر یہ رسالہ بند ہوگیا ۔ قیام پاکستان کے بعد ساغر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں ہیں اور کسی فلم کمپنی سے متعلق ہیں ۔

غرض ساغر صاحب کی تمام زندگی سخت جدو جہد ' شدید مقابلے اور ادبی و شاعرانہ ذوق میں گزری اور انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے اب تک ان کا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے ہی میں گزرا ۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ اردو کے جدید شعراء میں سے ہیں اور ان کے کلام میں اردو شاعری کے جدید تغیر کا نمایاں اثر ہے ۔ ساغر صاحب نے یوں تو تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی نظمیں خاص طور پر نزاکت خیال اور موسیقی کی روانی کے اچھوتے محاسن کی آئینہ دار ہیں ۔ مزیدبراں ان کی نظموں کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ہندوستانی زندگی ' ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کا اظہار ایسے سلیس و دلکش انداز میں ہوا ہے جو بیشتر عوام کی روز مرہ کی بول چال سے مشابہت رکھتے ہیں ۔ آزادئ وطن کا جذبہ حضرت ساغر کی منظومات میں قدم قدم پر نظر آتا ہے اور وہ اپنی پرجوش نظموں اور پر لطف نغموں سے اہل وطن کو ہر قسم کی قربانی کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں ۔

لیکن جناب ساغر کی شاعری یہیں تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے مناظر قدرت کے جلوے ' جذبات کی کیفیتیں اور نغمہ و سرود کی سحر آفرینیاں بھی اپنی نظموں میں خاص کیفیت سے بیان کی ہیں ۔ اس سلسلے میں ساغر صاحب کے محاسن شعری کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بادۂ مشرق'' کے دیباچہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''ان کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور موسیقیت ہے ۔ یہ بات شاید اس وقت کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ۔ دوسری بات بحروں کا تنوع ہے جس سے شاعر کا حسن انتخاب اور اس کے ذوق موسیقیت کا پتہ ملتا ہے ۔ یہ فارسی کی جدید شاعری کا اثر معلوم ہوتا ہے ترنم اور بحروں کی جدت یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو ساغر نے جدید فارسی شاعری سے حاصل کی ہیں اور انھیں خوب نبھایا ہے ۔ ساغر کی بعض نظمیں ایسی ہیں کہ انہیں پڑھکر اور خاص کر ان سے سن کر (جس میں خوش گلوئی ' جوش اور باطنی کیفیت سب کچھ ہوتا ہے) آدمی محو ہو جاتا ہے'' ۔

مختصر یہ کہ ساغر صاحب نے جدید اردو شاعری میں زبان کی نرم اور دلفریب شیرینی پیدا کی ۔ جس میں ہندی الفاظ بے ساختگی کے ساتھ بغیر کسی تصنع کے ' فارسی

منظومات کی مشکل تر مقررہ بند شوں میں، گھل مل جاتے ہیں۔ انھوں نے شباب سے سرشار ہو کر قدم بڑھایا اور زندگی کے متعلق اُن کا تمام طرز عمل شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اُن کا دل شباب، رومانیت، تاریخ اور آزادئی وطن کے جذبات سے مملو ہے۔ وہ یاس و مایوسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے چنانچہ اُن کے کلام میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ موصوف کے کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں ''صبوحی'' ''بادۂ مشرق'' اور ''رنگ محل'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انتخاب کلام

عشق ہنگامہ فروش و حسن ہنگامہ نواز
رنگ محفل مانع نظارۂ محفل ہوا
سامنے آتے ہی اُن کے آنکھ پرنم ہو گئی
جانے کیا دیکھا کہ ضبط آرزو مشکل ہوا

نہ میں ہوں نہ وہ ہیں نہ دین اور دنیا جنوں محبت کہاں کھینچ لایا

جہاں پڑی وہیں اک چوٹ کھا کے بیٹھ گئی
مری نگاہ کو اندازۂ شباب نہ تھا

کیوں روک دیا تم نے آنکھوں کے اشاروں سے
دلچسپ تھا افسانہ کہنے تو دیا ہوتا
مارا مجھے اے ''ساغر'' فطرت کی عنایت نے
یا وہ نہ ملے ہوتے یا دل نہ ملا ہوتا

کیوں گرفتار مجھے اے مرے صیاد کیا
اور بھی فطرت آزاد کو آزاد کیا
یہ تری بزم کا انداز یہ نظروں کا فریب
ہر غم اندوز یہ سمجھا کہ مجھے شاد کیا
غنچے نے نکہت و شبنم نے شمیم و گل نے
سارے گلشن نے تجھے وقت سحر یاد کیا
قید ہستی بھی ہے فطرت کی غلامی ''ساغر''
کاش یہ حکم سنوں ''جا تجھے آزاد کیا''

لوٹ کر لے گیا نظر میری نرگس نیم خواب کا عالم
کھلے پھولوں میں صبح کا منظر بند کلیوں پہ خواب کا عالم

شوق بیکار جذب دل ناکام میں ہوں خود اپنے عشق کا انجام
ہے یہ دنیائے عاشقی کا نظام مرگ آغاز، زندگی انجام

حسن آمادۂ پرسش ہے باندازۂ غم
کاش ہم آج بھی اظہار تمنا نہ کریں
ہجر مہلک ہی سہی وصل کی راحت معلوم
کاش ہم یہ بھی محبت میں گوارا نہ کریں

میرے آنسو اُن کے دامن پر ستارے بن گئے
کون کہتا ہے کہ یوں رونے سے کچھ حاصل نہیں
نا خدا پہنچے گی ساحل پر نہ کشتی، کیا کہا؟
ناخدا ہے تُو خدائے کشتی و ساحل نہیں

بدل گئی ہیں فغاں میں جرس کی آوازیں
کوئی خراب محبت تو کارواں میں نہیں
مذاق دھر ہے اب تشنۂ سکوں "ساغر"
مگر شراب سکوں ساغرِ جہاں میں نہیں

کس طرح دوں پیام غم جاوداں کو میں
قابو میں ہو تو روک لوں عمر رواں کو میں
سجدے مری جبیں کے نہیں اس قدر حقیر
کچھ تو سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں
باقی اب امتحان وفا میں ہے اور کیا
بے ضبط کر گیا ترے درد نہاں کو میں

محفل خموش صبح کے آثار جاوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

ایک زنجیر طریقت میں بندھے ہیں دونوں
عشق پابند سہی حسن بھی آزاد نہیں

میں ناواقف سہی منزل سے منزل مجھ سے واقف ہے
مجھے بھی قافلے والے شریک کارواں کر لیں
چمن میں جانے کل کس برق وش کی حکمرانی ہو
ابھی سے عندلیب و گل کو اپنا رازداں کر لیں
گل اپنے ، غنچے اپنے، گلستاں اپنا ، بہار اپنی
گوارا کیوں چمن میں رہ کے ظلم باغباں کر لیں
یہ اک بجلی کہ رقصاں ہے یہ اک شعلہ کہ عریاں ہے
جو مل جائے تو پھر روشن چراغ آشیاں کر لیں
نہ دے پھر کوئی غربت میں ثبوت آبلہ پائی
وہ "ساغر" کاش کانٹوں کو بھی اپنا ہمزباں کر لیں

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے
صبر و سکوں دو دریا ہیں بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے
جینے میں کیا راحت تھی ، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے ؟
ساون آئے پھول کِھلے ، اک افسردہ بول اٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے؟
رات کے آنسو اے "ساغر" پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

شاید تری سمجھ میں روداد غم نہ آئے ڈرتا ہوں آرزو کی تشریح مختصر سے
خانہ خراب قسمت آخر مٹا کے مانی اُس کو بھی تھا گزرنا تیری ہی رہگزر سے

ہے شب رنگیں، سحر رنگیں، ہوئے ہیں بام و در رنگیں
زمانہ رنگ پر ہے اک مری رنگینئی دل سے

جب چمن ریز نظر آن کی گل افشاں ہو جائے
کیوں نہ اندیشۂ کوتاہئی داماں ہو جائے
محفل سوز میں اس دل کی نموداری کیا
جو بھڑکتے ہی چراغ تہ داماں ہو جائے
بار بار آے تصوّر ترا تغئیر کے ساتھ
کم سے کم ایک ہی تصویر کا ساماں ہو جائے
نہ سہی شمع مری خلوت غم میں نہ سہی
کوئی ڈوبا ہوا تارا ہی فروزاں ہو جائے

جانب دل کوئی آتا ہے بانداز لطیف
کہہ نہیں سکتا یہ تو ہے یا تری آواز ہے
ختم ہوتی ہے جہاں سرحد خودی و ہوش کی
اس سے کچھ آگے نکل کر جلوہ گاہ ناز ہے
نالہ کہتے ہیں جسے سب اصطلاح عشق میں
ساری دنیائے وفا کی متحد آواز ہے

ہستی کی بد مستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی ہوش میں جسدن آئیں گے
میری آنکھیں کچھ بھی نہیں تیرے جلوے جلوے ہیں
تو جب سامنے آئیگا، پردے سے پڑ جائیں گے

گل اس کے، غنچے اس کے، گلستاں اس کا بہار اسکی
جو قانون گلستاں توڑ کر آزاد ہوتا ہے

کچھ حقیقت نہ ہو محبت کی نشہ سا اک ضرور ہوتا ہے

زمانہ بھر نے ٹھکرایا ہے ہم کو اٹھا دو تم بھی اپنے آستاں سے

آہ ملتا ہے یہ سرمایہ کسے — غم بڑی دولت بڑا انعام ہے
ہے ترا سحرِ تبسم فتنہ ساز — اور مری دیوانگی بدنام ہے
مدعی اور پختہ کاری کا فریب — مدعا ''ساغر'' خیال خام ہے

سہ گئے سوز عشق کو ہم تو — حسن سے کب مگر یہ آگ دبی
ایک دن لے دیا تھا نام ترا — بات یہ پھر دبائے سے نہ دبی
آرزو نا تمام و عمر تمام — زندگی مستقل ہے تشنہ لبی
بارگاہ جنوں میں اے ''ساغر'' — ہے ادب بھی کمال بے ادبی

یہ ناکامی محبت کی الہی ! — محبت سے بھی دل گھبرا رہا ہے

آفتاب

بربط نوریں پہ بھیروں راگنی گاتا ہوا
ساز سے کرنوں کے روشن راگ برساتا ہوا
اپنی موسیقی سے دنیا بھر کو گرماتا ہوا
زندگی کی موج ہر اک شے میں دوڑاتا ہوا
پردۂ مشرق سے ساقئی سحر پیدا ہوا
بادۂ مشرق بدست و نغمہ گر پیدا ہوا
دیر میں ناقوس، مندر میں گجر بجنے لگا
میکدے میں حلقۂ زنجیر در بجنے لگا
جنبش مضراب سے ساز سحر بجنے لگا
خود بخود ساز خموش بحر و بر بجنے لگا
روح ہستی جاگ کر محو ترنم ہو گئی
زندگی بیدار ہو کر رقص میں گم ہو گئی
لالہ و گل جاگ اٹھے بام و در روشن ہوئے
سبزۂ خوابیدہ پر لعل و گہر روشن ہوئے
ڈالیوں پر روشنی دوڑی، شجر روشن ہوئے
کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر وبر روشن ہوئے
آسماں روشن ہوا اور خاکداں روشن ہوا
پر تو انوار سے سارا جہاں روشن ہوا

اے نقیب صبح اے سر چشمۂ امواج نور
اے کلید خمستاں، اے مشعل طاق سرور
ہر شعاعِ گرم تیری لمعۂ صد برق طور
تیری کرنوں سے رگ عالم میں ہے موج شعور
ذرہ ذرہ زندگی کے نور سے تا بندہ ہے
زندگی تابندہ ہے، رقصندہ ہے رخشندہ ہے

گوہریں شبنم کے قطرے موتیوں کا یہ نکھار
یہ عروس صبح کے سینے پہ ہیروں کی بہار
یہ سمندر، یہ بیاباں، یہ چمن، یہ کوہسار
ناچتی یہ ندیاں، گاتے ہوئے یہ آبشار
سب کو تو نے روشنی دی مسکرانے کے لئے
قاسم انوار ہے تو اک زمانے کے لئے

آسماں کے اے طلائی دائرے! زرّیں باب
اے زمیں کی نوجوانی، آسمانوں کے شباب
اے سبوئے آتشیں، اے حاصل شعر و شباب
خاک ہیں تیرے قدم کی کہکشاں و ماہتاب
دست قدرت کا جہنم زار انگارہ ہے تو
کس کی دُھن میں اے نگاہ چرخ آوارہ ہے تو

ناظر عالم ہے تو اک آتشیں منظر ہے تو
جوہر آئینہ ہے، آئینہ جوہر ہے تو
فطرتاً نظارۂ خاموش کا خوگر ہے تو
دہر کی تاریخ پارینہ کا اک دفتر ہے تو
تیری کرنیں راز دار عظمت دیرینہ ہیں
تیرے جلوے یادگار عشرت دوشینہ ہیں

ہر کرن تیری ہے دنیا کو سلام زر نگار
خمستان انجم رخشاں کا جامِ زر نگار
خود کلیم زر فروش و خود کلام زر نگار
اے خطیب زر نگار و اے امام زر نگار
اپنا خطبہ کیف میں جس وقت دہراتا ہے تو
دہر کو سیلاب زرّیں میں ڈبو جاتا ہے تو

سانولے هلکے دھندلکے میں پری پیکر ہے تو
یا جبین صبح پر سونے کا اک جھومر ہے تو
یا برهمن کی جبیں کا قشقۂ احمر ہے تو
یا فلک کے هاتھ میں کندن کا اک ساغر ہے تو
یا کسی شاعر کے دل کا داغ ہے دهکا هوا
یا بهشت حسن کا اک پھول ہے مہکا هوا

روشنی تیری متاع خانۂ آشفته حال
تیری کرنوں میں کسانوں کیلئے تاروں کی شال
اور مزدوروں کو پہلی رات سے تیرا خیال
ثبت ہے منعم کے دل پر بھی تری مُہرِ جلال
تو قریب و دور کے احساس سے آزاد ہے
خواجه و مزدور کے احساس سے آزاد ہے

یاسمن کی غنچگی، گل کا تبسم رقص میں
تیری خاطر ہے جہانِ رنگ و بو گُم رقص میں
ہے سمندر اور سمندر کا تلاطم رقص میں
خاکداں کا ذکر کیا ہے بزم انجم رقص میں
اک جہاں تیرے لئے شام و سحر آواره ہے
کس کے دل کی قاش تو کس کے جگر کا پاره ہے

سوئے مغرب جا رہا ہے رنگ برساتا هوا
جیسے اک مزدور دن بھر کا تھکا هارا هوا
سرخ آغوش فلک میں شعله سا دهکا هوا
جس طرح کوئی سپاهی خون میں ڈوبا هوا
نونهالان چمن کے خون سے رنگیں ہے تو
کیا شهیدان وطن کے خون سے رنگیں ہے تو

غنچه و گل هوں رہا اور آشیاں آزاد هو
بلبلیں آزاد هوں اور گلستاں آزاد هو
ایشیا آزاد هو، هندوستاں آزاد هو
حلقۂ زنجیر سے کون و مکاں آزاد ہے
تجھ سے ٹکرا کے اٹھے پستی سے اٹھلاتا هوا
ذره ذره گیت آزادی کا هو گاتا هوا

سماج

کِھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
خندہ جز شورشِ آغوشِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ جُز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بُو ہے
گود میں موجِ تبسم کی فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گل کا تبسم ہے بہاروں کا فریب
کھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ سخن — اے مری جانِ سخن
جھوٹ نے مستئ گفتار کا بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کا رنگین و تراشیدہ لباس
بحرِ تکذیب کے ٹھیرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن — اے مری جانِ سخن
شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گِر کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر
یوں تو شیریں ہیں بہر طور مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہر آب تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ تبسم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت کا راز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر کیف نظر — اے مرے کیف نظر
گنگناتی ہوئی بانہوں پہ نہ جا ساز خیال — اے مرے کیف خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستوں چاہئے اس بیل کو زر دوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زرّیں کمر و گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں پہ ہی اس گلشن کا
فن ہو یا حسن جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں تو کبھی
گنگناتی ہوئی بانہوں پہ نہ جا ساز خیال — اے مرے ساز خیال
عطر آلود نگاہوں پہ نہ جا روح گلاب — اے مری روح گلاب

اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائیگا دنگ
عہد تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکز بُو اور یہی مخزن رنگ
جسم عریاں پہ مگر جامۂ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے اُڑے ہیں یہ لباس

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روح گلاب — اے مری روح گلاب
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسن نظر — اے مرے حسن نظر

چلتے پھرتے جو نظر آتے ہیں تہذیب کے بت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بت
ان کے دل سنگ ہیں جاں سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جان ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں

ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسن نظر — اے مرے حسن نظر
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشت حیات — اے مری کشت حیات

کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطاف امیر
ایک ہو جائے کبھی قسمت صیاد و اسیر
زہر خود شہد بنے آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو محال
ظلم کی روح کو احساس ترحّم ہو محال
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشت حیات — اے مری کشت حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ مٹ حسن نظر — اے مرے حسن نظر

انتخاب نظم (پجارن)

اے مندر کا راز پجارن — اے فطرت کا ساز پجارن
پریم نگر کی رہنے والی — ہر کی بتیاں کہنے والی
سیدھی سادی بھولی بھالی — بات نرالی گات نرالی
گردن میں تلسی کی مالا — دل میں اک خاموش شوالہ
ہونٹوں پر پیمانے رقصاں — آنکھوں میں میخانے رقصاں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

بھینی بھینی بو ساری میں — ساری مدھ میں تو ساری میں
آنکھوں میں جمنا کی موجیں — بالوں میں گنگا کی لہریں
نور ترے رخسار حسیں پر — رنگیں ٹیکا پاک جبیں پر
جیسے فلک پر صبح کا تارا — روشن روشن پیارا پیارا
شرمیلی معصوم نگاہیں — گوری گوری نازک باہیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

نور کے تڑکے گھاٹ پر آ کر — گنگا کا سنان بڑھا کر
پھر لے کر خوشبوئیں ساری — چندن جل اور دوب سپاری
صبح کے جلووں کو تڑپا کر — نظارے سے آنکھ بچا کر
اے مندر میں آنے والی — پریم کے پھول چڑھانے والی
ہستی بھی ہے گلشن تجھ سے — سورج بھی ہے روشن تجھ سے

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

آ ! تیری صورت کو پوجوں — میں زندہ مورت کو پوجوں
تو دیوی میں تیرا پجاری — نام تیرا ہر سانس سے جاری
لاگ کی آگ نے تن کو بھونا — پھر مندر ہے دل کا سونا
من میں تیرا روپ بسا لوں — تجھ کو من کا چین بنا لوں
چھپ جا میرے دل کے اندر — ہو جائے آباد یہ مندر
اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

رباعی

ہوتی نہیں ختم داستانِ ہستی — مٹتا نہیں حشر تک نشان ہستی
ہے موت بھی ایک وقفۂ کیف و سرور — دم لے کے چلے گا کاروانِ ہستی

ڈاکٹر تاثیر



محمد دین نام تاثیر تخلص ۱۹۰۲ء میں قصبہ اجنالہ ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابھی تاثیر کم سن ہی تھے کہ ۱۹۰۴ء کی وبائے طاعون میں پہلے باپ کے سائے سے پھر ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے اور اس کم سن یتیم کو اُن کے خالو میاں نظام‌الدین نے، جن کا شمار لاہور کے روساء میں ہوتا ہے اپنے گھر میں پناہ دی۔ اس طرح تاثیر تین سال کی عمر سے میاں نظام‌الدین کے گھرانے میں پرورش پانے لگے۔ میٹرک اسلامیہ اسکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے کیا۔ پھر ایف۔سی کالج میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۹۲۶ء میں انگریزی میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔

ڈاکٹر تاثیر کی ادبی زندگی کا آغاز تو اسکول ہی میں ہو گیا تھا مگر کالج میں اُن کی ادبی صلاحیتوں نے جلا پائی۔ ۱۹۲۴ء میں وہ ادبی دنیا سے روشناس ہوئے۔ اُن دنوں ”نیرنگ خیال“ کی بڑی دھوم تھی چنانچہ اُس رسالے کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد حفیظ جالندھری نے ”مخزن“ نکالا اور تاثیر کی نظمیں اور مقالے اُس میں چھپنے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر چند روز محکمہ اطلاعات سے وابستہ رہے مگر یہ ملازمت بھی طبیعت کو راس نہ آئی اور اس سے علیحدہ ہو کر ۱۹۲۸ء میں دوبارہ اسلامیہ کالج میں آ گئے اور ۱۹۳۴ء تک وہیں رہے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ولایت چلے گئے اور کیمبرج میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں واپس آئے اور ایم۔اے او کالج امرتسر میں پرنسپل مقرر ہوگئے۔ کوئی تین سال تک اس درسگاہ سے تعلق قائم رہا۔ ۱۹۴۰ء میں سری پرتاپ کالج سری نگر کے پرنسپل ہو گئے جنگ کے زمانے میں تعلیمی زندگی سے الگ ہو کر حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں وہ اس ملازمت سے علیحدہ ہو کر سری نگر گئے اور کچھ عرصہ بعد پاکستان چلے آئے اور آزاد کشمیر کے محکمہ نشر و اشاعت کے انچارج ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری دن تک اسی ادارہ سے متعلق رہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے اپنی کوئی مستقل یادگار نہیں چھوڑی اور نہ اُن کی کوئی تصنیف شائع ہوئی لیکن اگر اُن کے مضامین کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں اور یہی حال اُن کے کلام کا ہے ۔ حال ہی میں ایک خبر سننے میں آئی ہے کہ عنقریب اُن کا مجموعہ کلام شائع ہونے والا ہے جس کی ترتیب اُن کے ایک عزیز دوست سید عابد علی صاحب عابد کے سپرد ہوئی ہے ۔ خدا کرے مرحوم کا یہ مجموعہ جلد مدون ہو کر شائع ہو جائے اور مرحوم کا بکھرا ہوا کلام یکجا صورت میں ادبی حلقوں میں پہنچ جائے

ڈاکٹر تاثیر ایک جلیل‌القدر ادیب ، خوش فکر شاعر ، عظیم‌الشان نقاد اور ماہر تعلیم تھے اُن کی ذات مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا ایک نہایت موزوں سر چشمہ تھی ۔ گزشتہ بیس پچیس برس میں پنجاب میں جتنے ادیب و شاعر ہوئے ہیں اُن میں تاثیر کا نام ممتاز ہے ۔ اور اُن کی بدولت بہت سے ادیب و شاعر فنی بلاغت حاصل کر سکے ۔ وہ فطرتاً بڑے خوش اخلاق ، بذلہ سنج اور باغ و بہار قسم کے انسان واقع ہوئے تھے ۔ اور قدرتی طور پر اُن میں ایسی صلاحیتیں تھیں کہ وہ ہر محفل پر چھا جاتے تھے ۔ شعر و شاعری کا ذوق اُنھیں بچپن ہی سے تھا ۔ عام شعراء کی طرح اُنھوں نے بھی غزلگوئی سے ابتدائے سخن کی لیکن بہت جلد اُن کی حساس طبیعت ملک کی سیاسی کشمکش اور زبوں حالی سے متاثر ہوئی ۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی جس کے بانیوں میں تاثیر بھی تھے ۔ اسی ایک واقعہ سے اُن کے شاعرانہ رجحانات کا کافی اندازہ ہوتا ہے ۔ پھر علامہ اقبال مرحوم کے فیض صحبت نے اُن کے شاعرانہ مذاق کو خاصی جلا دی اور زبان و بیان میں بھی پختگی پیدا کی ۔ وہ اہل زبان تو نہ تھے مگر اپنی ذاتی دلچسپی و مطالعہ کی بدولت اُنھیں زبان پر بڑا عبور حاصل ہو گیا تھا ۔

اُن کی نظموں میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ زندگی کا گہرا مطالعہ بھی ملتا ہے ۔ اُن کی ابتدائی نظمیں رومانی ہیں مگر اُن میں بھی بڑی شگفتگی و تازگی پائی جاتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع میں غم جاناں کا تذکرہ ہی کافی سمجھتے تھے مگر حالات سے بیداری نے اُنھیں حقائق کے بیان کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اُنھیں چونکہ سیاست میں بھی خاصا شغف تھا اسلئے اُن کی نظموں میں انقلابی رنگ کی جھلک بھی پیدا ہو گئی ہے ۔ جس کا اظہار بعض جگہ تو دبے دبے اور ایمائی انداز میں ہوا ہے اور بعض جگہ وہی بے دھڑک و بے جھجک پیرایہ ہے جو اُن کا اسلوب زندگی تھا ۔

انداز بیان میں باوجودیکہ اُنھوں نے روایت سے بغاوت کی ہے اور مروجہ اسلوب سے ہٹ کر نظم آزاد کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے مگر خوبی یہ ہے کہ مفہوم میں کہیں پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے خیالات کو بڑی روانی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری اُن کے سمجھنے میں کوئی دقت یا اُلجھن محسوس نہیں کرتا ۔

اُن کے کلام میں یقیناً مزید گہرائی ، رچاؤ اور پختگی پیدا ہوتی مگر افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس ہونہار شاعر کو ہم سے چھین کر ہماری ادبی محفلوں کو سونا کر دیا ۔

انتخاب کلام

تغزل

حضور یار میں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں
ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقام جنبش ابرو نکل ہی آتے ہیں
حنائے ناخن پا ہو کہ حلقۂ سر زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں
جناب شیخ وضو کے لئے سہی، لیکن
کسی بہانے لب جُو نکل ہی آتے ہیں
متاع عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

اس طرح آیا کہ اب تک اس طرح آیا نہ تھا
لو پریشاں، چاک داماں، دست افشاں آ گیا
جیسے صحرا میں گھٹائیں جیسے اندھیاری میں چاند
رخ پہ بکھرائے ہوئے زلف پریشاں آ گیا
اس طرح آیا کہ جیسے کاروانِ فصل گل
یک گلستاں بر کف و صد گل بداماں آ گیا
خانقاہوں کی ترقی، مسجدوں کی رونقیں
میرے گھر میں وہ عدوئے دین و ایماں آ گیا
ہوش میں آ، سر اٹھا تاثیر، آنکھیں کھول، دیکھ
تیری آنکھوں کی قسم وہ شاہِ خوباں آ گیا

لبا لب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے نہ جانے کیا ہوا مجھ سے
مری توبہ، مجھے باور، وہ کافر ہے
خفا تو بھی ہوا جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپا پھرتا ہوں اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک
یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دلکا مدعا مجھ سے
مجھے معلوم ہے "تاثیر" سب کچھ جانتا ہوں میں
ارے اب پی بھی جا کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

حسن کے راز نہاں شرح بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے
کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو در پیر مغاں تک پہنچے

تری نیم کش نگاہیں ترا زیر لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریب سادہ
وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر مری تاب سے زیادہ

سجدوں سے نامراد ہے جلوؤں سے نا امید
وہ رہگزر کہ، اب جو تری رہگزر نہیں
بے باک چال، چال سے بے باک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں
دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

زلف آوارہ، گریباں چاک، اے مست شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

بہت ھجوم تھا مسجد میں میکدے کی طرح
میں لوٹ آیا شریک نماز ہو نہ سکا

یوں ہی بیٹھے ہیں ترے در پہ تو بیٹھے ہیں مگر
پھر نہ ہم لوٹ کے آئینگے جو اک بار گئے

منظومات

رس بھرے ہونٹ

رس بھرے ہونٹ '
پھول سے ھلکے '
جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس جھلکے '
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق سرخ سے در خشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے '
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں !—
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راھی
پاؤں چھلنی ' نگہ متزلزل !—
وقت صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگ منزل نما ' نہ آج ' نہ کل—
دفعتہً دور — دور !— آنکھ سے دور
شفق شام کی سیاھی میں
قلب کی آرزو نگاھی میں
فرش سے عرش تک جھلک اٹھے
ایک دھوکا — سراب — منبع نور !
رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر
رات دن کے تھکے ہوئے راھی
یوں ترستے ہیں ' یوں لرزتے ہیں !—

لندن کی ایک شام (مرحوم کی سب سے آخری نظم)

۱۹۵۰ء

یہ رھگزر
یہ زن و مرد کا ھجوم یہ شام
فراز کوہ سے جس طرح ندیاں ، سر پر
لئے ہوئے شفق آلود برف کے پیکر
سفید جھیل کی آغوش میں سمٹ جائیں !—
یہ تند گام سبک سیر کاروانِ حیات
"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"
کدھر سے آئے کدھر جا رہے ھیں کیا معلوم !—
سنہری شام میں
اسی* روس جھلملاتا ھوا
بندھا ھوا ہے نشانہ ، کھنچی ھوئی ہے کماں
کسے یہ تیر لگے گا
کہاں ؟ یہاں کہ وھاں !—
نظر نظر سے ملی دل کا کام ختم ھوا ۔
سنہری شام میں
اسی روس جگمگاتا ہے
کوئی ھنسے کوئی روئے یہ مسکراتا ہے
اسی مقام پہ پھر لوٹ کر میں آیا ھوں
یہ رھگزر ، یہ زن و مرد کا ھجوم یہ شام
یہ تند سیر سبک گام کاروان حیات
یہ جوش رنگ ، یہ طغیانِ حسن کے جلوے :
یہیں کے نور سے روشن مری نگاھیں ھیں
مرے شباب کی روندی ھوئی یہ راھیں ھیں !—
وھی مقام ہے لیکن وھی مقام نہیں
یہ شام تو ہے مگر وہ سنہری شام نہیں
وہ رعب داب نہیں ہے وہ دھوم دھام نہیں

---

* عشق کے دیوتا کا مجسمہ جو لندن کے مشہور چوک (پکاڈلی سرکس) میں استادہ ہے ۔

وہ میں نہیں ہوں کہ اُن کا میں اب غلام نہیں !
صنم کدوں میں آجائے نہیں رہے کہ جو تھے
کہ اب وہ دیکھنے والے نہیں رہے کہ جو تھے

میخانہ افرنگ

تیرے ہر جام کا یکساں ہے مزا اے ساقی
اب پلائی ہے تو کچھ اور پلا اے ساقی
تجھ پہ کیوں مست ہوئے بیٹھے ہیں رندان کہن
وہ ترے پاس نیا نشہ ہے کیا اے ساقی
وہی پیمانہ فروشی وہی قطروں کا شمار
وہی انداز پرانا ہے ترا اے ساقی
وہی آقائی و محکومی کی زنجیریں ہیں
وہی بندے ہیں وہی اُن کے خدا اے ساقی
جاں بلب پیاس سے کوئی، کوئی بدمستی سے
کیا یہی مے ہے تری "آب بقا" اے ساقی
اب نئے رنگ کے مے خوار یہاں آئیں گے
ب یہاں سے تو دکاں اپنی بڑھا اے ساقی

اب یہاں سود و زیاں کا نہ تقاضا ہوگا
غم امروز نہ اندیشہ فردا ہوگا
عہد سلطانئی جمہور کی ساعت ہے قریب
تو معزز جسے سمجھا ہے وہ رسوا ہوگا
تیری تلچھٹ کی گدائی پہ جو اب ہے مجبور
وہی مجبور بچارا ترا آقا ہوگا
یوں ہی رکھے ہوئے رہ جائیں گے آداب و رسوم
جانے اے پیر مغاں حشر ترا کیا ہوگا
پھر بہار آئی، گئی جیب و گریباں کی تمیز
قیس پھر دست کش دامن صحرا ہوگا
کھیلی جائیگی نئے رنگ کی ہولی "تاثیر"
میکشو! مژدہ کہ جاری یہ تماشا ہوگا

تاثرات

میری وفائیں یاد کروگے — روؤگے فریاد کروگے
مجھ کو تو برباد کیا ہے — اور کسے برباد کروگے
ہم بھی ہنسینگے تم پر اک دن — تم بھی کبھی فریاد کروگے
محفل کی محفل ہے غمگیں — کس کس کا دل شاد کروگے
دشمن تک کو بھول گئے ہو — مجھ کو تم کیوں یاد کروگے
ختم ہوئی دشنام طرازی ؟ — یا کچھ اور ارشاد کروگے
جا کر بھی ناشاد کیا تھا — آ کر بھی ناشاد کروگے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کروگے

ید بیضا [1]

مجھے تلاش رہی ہے
نہیں تلاش نہیں !
تلاش میں تو طلب
جستجو سی ہوتی ہے
دبی دبی ہی سہی
آرزو سی ہوتی ہے
نہ آرزو نہ طلب ہے نہ جستجو نہ تلاش
ذرا سی ایک جراحت ذرا سی ایک خراش
میان قلب و نظر اک مقام ہے اس کا
مقام ؟ مرحلہ ؟ جو کچھ بھی نام ہے اس کا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں
وہ طور جلوۂ معنی
وہ کار گاہِ کمال

---

۱ ''ید بیضا'' جسے تاثیر کی شاعری کا شاہکار کہنا چاہئے ۔ اردو ادب میں ایک نئی چیز ہے ۔ معنوی اعتبار سے یہ نظم ان جذبات و کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے جو فنون لطیفہ کی تخلیق میں کار فرما ہوتی ہیں اور باعتبار اسلوب اس نظم میں منطقی تعریف کی کاوش و احتیاط اور رچی ہوئی شعریت اپنی مثال آپ ہے ۔

تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے باک واردات جمال
ہوس، نہ عشق، نہ منزل نہ سرحدیں نہ حدود!

"جمال: تابشِ رو، گرمئی خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں!"

یہ جھلکیاں
یہ ادائیں
یہ پرفشاں سائے
یہ جھلملاتے
ابھرتے
دبے ہوئے سے نقوش
سوادِ قوس خم و گردش و نشور و سرور!

یہ کائنات مری کائنات ہو، یہ نہیں
ہر ایک بات مگر میری بات ہو یہ نہیں
میں دن کو رات بتاؤں تو رات ہو یہ نہیں

نہیں! مجھے یہ خلش یہ ہوس نہیں ہوتی
بقدر جام یہاں اذن عام ہے سب کو
یہ میکدہ ہے یہاں پیش و پس نہیں ہوتی!
مگر کبھی کوئی گم گشتہ رہ نورد غزال
مری کمندِ نظر کا شکار ہو جائے!
حریم ناز کا پردہ صبا الٹ ڈالے
کسی کا رازِ دروں آشکار ہو جائے!

یہ مدعا طلبی یہ نظر کی آلائش
یہ حسن رہگزری یہ سرودِ نشر گہی

یہ شمع طاق حرم، یہ شرار بو لہبی
یہ منتہائے نظر، یہ مآل کار نہیں!
"نہیں نہیں" کی یہ تکرار، ہر جگہ یہ "نہیں"
کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے
کہ جیسے قلب و نظر میں فساد ہو جائے
کہ جیسے .... کیا میں کہوں
"یہ نہیں" یہ تشبیہیں

یہ اعتقاد کے اثبات کی نفی سے نہیں
وفور شوق کی جذبات کی کمی سے نہیں !

بساط کیف ہے اک کار زار جوش نمود
روش روش ہمہ رامش ، چمن چمن ہمہ رنگ
خطوط نسخ و مناشیر و سنبل و ریحاں
نوائے بربط و طنبورہ و دف و نے و چنگ

نمود سر بسر اظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکر شیریں فسرد در رگ سنگ

کسی نے مسند سنگ سیہ پہ لی کروٹ
برنگ موج ابھرنے لگے نشیب و فراز
کھلا ہے ضربت تیشہ سے اک دریچۂ سرخ
قطار بستہ ہوئے کھڑے ہیں محو نیاز
عمود ہمت و قوس نیاز و محور درد
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بے سرو دست
تنے کسے ہوئے سینے بلند سر بد مست

شکار ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

وہ ایک اجنبی ساحل وہ شام تنہائی
حریف کثرت نظارہ دل کی یکتائی
جواب جوشش دریا صدف کی پنہائی !

وہ رنگ و صوت کا عالم حواس کی دنیا
وہ غور و فکر کی خوف و ہراس کی دنیا
وہ ماورا کا جہاں ، آس پاس کی دنیا

افق پہ وہ شفق آلودہ بادلوں کے ہجوم
مصوروں نے لگائے ہیں نقش رنگ برنگ
مچی ہوئی ہے چٹانوں میں جل ترنگ کی دھوم
مغنیوں نے اڑائے ہیں موج کے آہنگ

مرے حروف مرے لفظ میرا طرز کلام
نہ ان میں لمس نہ رنگت نہ ذائقہ نہ مشام

چمن کا رنگ نہیں ہے گہر کی آب نہیں
مگر وہ کیا ہے کہ جس کا یہاں جواب نہیں

حکایت غم دل روئداد کون و مکاں
حدیث مطرب و مے حادثات دور زماں
جمال زہرہ جبیناں جلال کجکلہاں

یہ چند حرف یہ لفظوں کے جوڑ یہ پیوند
ردیف و قافیہ و مثنوی و قطعہ و بند
"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

مرا کلام ہے میرا کلام ہی لیکن
یہ میری بات جو ہے میری اپنی بات نہیں
معاملات غزل ہیں معاملات غزل
یہ آپ بیتی یہ میرے معاملات نہیں

وہ صبحدم سر مژگاں لہو سے تر آنسو
وہ نوک خار پہ شبنم کے ارغواں قطرے
لرز لرز کے جو سنبھلیں، سنبھل سنبھل ڈھلکیں
تصورات کی آمیزشیں یہ تشبیہیں

یہ واقعات نہیں ہیں یہ واردات نہیں
یہ اور بات ہے قلب و نظر کی بات نہیں

کلیم غش میں گرا، طور جل کے خاک ہوا
نظر کی بات رہی اور نہ دل کی بات رہی
شہود و شاہد و مشہود کے حدود کہاں
نہ اس کی ذات رہی اور نہ اُس کی ذات رہی

مگر وہ ایک دھکتا ہوا نشاں کہ جو ہے
متاع عرض تماشا بس اور کچھ بھی نہیں
وہی کہ جس سے درخشاں ہے خاکنائے حیات
وہی کہ جس سے ہے لمحات زندگی کو ثبات
وہی حیات کا مقصد وہی بنائے حیات
وہی کہ ہے ید بیضا بس اور کچھ بھی نہیں

یہی ہے، کچھ بھی نہیں اور کائنات مری
مری حیات ادب ہے ادب حیات مری

میانِ قلب و نظر اک مقام ہے اُس کا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اُس کا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

(اپریل تا جون ۱۹۵۰ء)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم



صوفی غلام مصطفیٰ متخلص بہ تبسم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ جہاں اُن کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہو گئے تھے۔ صوفی صاحب کی ولادت ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر ہی میں ہوئی لیکن آپ کی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا ہے۔ ابتداً آپ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کر کے گورنمنٹ اسکول میں مدرس ہوئے پھر فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ٹریننگ کالج میں اورینٹیل ٹریننگ کی جماعتیں ختم ہو گئیں تو آپ تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے اور اپنی تمام مدت ملازمت اس معروف درسگاہ میں گذار کر یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ اس دوران میں آپ عرصہ تک فارسی کے صدر شعبہ رہے اور کچھ مدت تک فارسی کے علاوہ شعبہ اُردو کے بھی صدر رہے۔

تبسم صاحب کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے نیز اُن کی تمام عمر چونکہ علمی اور ادبی ماحول میں گزری ہے اس لئے اُن کا ادبی مذاق بھی نہایت سلجھا اور نکھرا ہوا ہے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے ہے لیکن زیادہ تر فارسی میں کہتے رہے ہیں۔ آپ کا کلام نگار اور ملک کے دیگر مقتدر ادبی رسائل میں طبع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے۔ تاہم اس عرصہ میں وہ اُردو میں بھی برابر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں بالخصوص چند سالوں سے تو اُنہوں نے فارسی کے مقابلے میں اُردو میں بہت زیادہ کہا ہے۔ اور غزل نظم، قطعہ، رباعی غرضکہ ہر صنف میں اُن کی شاعری کے نہایت دلکش نمونے موجودہیں۔

صوفی صاحب بڑے مشاق مگر محتاط سخنور ہیں۔ اُنہوں نے بحیثیت مجموعی کم کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اُس میں اُستادانہ فکر و فن کے جوہر بڑی مشاطگی سے سموئے ہیں۔ خاص طور پر اُن کی غزلیں جتنی حسن و عشق کی رنگین داستان ہیں تقریباً اُتنی ہی حساس اور دردمند دل کی کہانی بھی ہیں۔ یہ بات بلاشبہ اس دور کے اکثر متغزلین کے یہاں عام ہے چونکہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں غم عشق کے ساتھ غم روزگار کا بیان ناگزیر سا ہو گیا ہے مگر تبسم صاحب نے ان جذبات و خیال کو جس سادگی و صفائی، نغمگی و ترنم اور لطافت و شرینی کے ساتھ شعر کے قالب میں

ڈھالا ہے اُس سے اُن کے اُسلوب بیان میں ایک امتیازی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی بیان کی بدولت اُن کی چھوٹی بحر والی غزلیں سہل ممتنع کی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی ایک غزل کے چند شعر دیکھئے۔

ہر اک نے اک بات کہی — کوئی نہ سمجھا دل کی بات
شام و سحر کا نام نہ تھا — ایسے بھی دیکھے دن رات
دل کے ہاتھوں ہم مجبور — دل کی لاج پرائے ہات
حسن کے تیور کیا کہئے — ہر لحظہ اک تازہ بات
تم بھی ضبط کرو ہم بھی — عشق ہے کس کے بس کی بات

جن سے کلام کی اس خوبی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اُن کے تغزل میں ایک ایسی گھلاوٹ اور سریلا پن پایا جاتا ہے جس میں کہیں کہیں گیتوں کا سا رس اور لوچ ہے۔

انتخاب کلام

غزلیات

ہزار گردش شام و سحر سے گزرے ہیں — وہ قافلے جو تیری رہگذر سے گزرے ہیں
ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز — ابھی یہ لوگ مقام نظر سے گزرے ہیں
ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقش پا کا گماں — قدم قدم پہ تیری رہگذر سے گزرے ہیں
نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رک جائیں — نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں
رحیل شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور — نہ جانے کس لئے ہم بے خبر سے گزرے ہیں
کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں — غم فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں
جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر — وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

شجر شجر نگراں ہے کلی کلی بیدار
نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار
نہ جانے کس کے نشاط قدم سے ہیں محروم
کہ ایک عمر سے سونے پڑے ہیں راہگذار
یہ برق حسن اور اس پر یہ تیری خوئے حجاب
یہ سیل عشق اور اس پر نظر نظر کا شمار

ابھی چمن کو میسر نہیں ہے رنگ چمن
بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغ بہار

ایسے بھی تھے کچھ حالات
دل سے چھپائی دل کی بات
ہر اک نے اک بات کہی
کوئی نہ سمجھا دل کی بات
شام و سحر کا نام نہ تھا
ایسے بھی دیکھے دن رات
عشق کی بازی کیا کہئے
سوچ سمجھ کر کھائی مات
دل کے ہاتھوں ہم مجبور
دل کی لاج پرائے ہات
حسن کے تیور کیا کہئے
ہر لحظہ اک تازہ بات
اشکوں کا طوفان اٹھا
غم میں ڈوب گئی برسات
تم بھی ضبط کرو ہم بھی
عشق ہے کس کے بس کی بات

جب بھی دو آنسو نکل کر رہ گئے
درد کے عنواں بدل کر رہ گئے
کتنی فریادیں لبوں پر رک گئیں
کتنے اشک آہوں میں ڈھل کر رہ گئے
رخ بدل جاتا مری تقدیر کا
آپ ہی تیور بدل کر رہ گئے
تیرے انداز تبسم کا فسوں
حادثے پہلو بدل کر رہ گئے

دل کا افسانہ ہی کیا ہے
بھولنے والا بھول نہ جائے
ایک افسانہ کہتے کہتے
کتنے افسانے یاد آئے
جو کچھ بھی میں کہنا چاہوں
تیرا نام زباں پر آئے

نظر میں ڈھل کے ابھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے
وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے
یہ کیا بہار کا جوبن، یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے، اداس میخانے
نگاہ ناز میں دل سوزیٔ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

وہ دیکھتے ہیں تبسم مرے لبوں کی ہنسی
جو مرے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

رسم مہر و وفا کی بات کریں — پھر کسی دلربا کی بات کریں
سخت بیگانۂ حیات ہے دل — آؤ اُس آشنا کی بات کریں
گیسوؤں کے فسانے دھرائیں — اپنے بخت رسا کی بات کریں

سحر فسردہ ہے شام اُداس اُداس — عجیب گردش لیل و نہار ہے ساقی
ٹھہر گئے ہیں کہاں قافلے محبت کے — ہر ایک راہگذر سوگوار ہے ساقی
دبی دبی سی ہے کچھ اسطرح سے جان حزیں — تری نگاہ بھی اب دل پہ بار ہے ساقی
ہمارے جذبۂ ذوق نظر کا کیا ہوگا — تری نگاہ تغافل شعار ہے ساقی
یہ سحر بار تبسم، یہ خندہ بار نگاہ
نظر کا نشہ ہے دل کا خمار ہے ساقی

دیکھ کیا کر رہے ہیں اہل زمیں — آسماں کے ستم کی بات نہ کر
سخت اُلجھی ہیں زیست کی راہیں — زلف کے پیچ و خم کی بات نہ کر
آج سود و زیاں کا سودا ہے — آج دیر و حرم کی بات نہ کر

ہر اپنی داستاں کو کہا داستان غیر — یوں بھی کسی کا راز چھپائے چلے گئے
میں جتنا اُن کی یاد بھلاتا چلا گیا — وہ اور بھی قریب تر آتے چلے گئے

یہ تیرا ہی فیضان غم ہے کہ میں نے — غم زندگی کر لیا ہے گوارا
فسون تمنا کی سو داستانیں — نگاہ کم آمیز کا اک اشارا

آہوں کے نغمے، اشکوں کے تارے — کتنے حسیں ہیں غم کے سہارے
چھوٹا سا اک دل، اُلفت کی دولت — کیا کوئی جیتے کیا کوئی ہارے

اس موسم گل ہی سے بہکے نہیں دیوانے — ساتھ ابر بہاراں کے وہ زلف بھی لہرائی
ہر درد محبت سے اُلجھا ہے غم ہستی — کیا کیا نہیں یاد آیا جب یاد تری آئی
چرکے وہ دیئے دل کو محرومئی قسمت نے — اب ہجر بھی تنہائی اور وصل بھی تنہائی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی
وہ مست نگاہیں ہیں یا وجد میں رقصاں ہے
تسنیم کی لہروں میں فردوس کی رعنائی

وہ طوفان ہوس تھا آرزو کا
کہ ناموس محبت ڈگمگائی
محبت کی خموشی بھی فسانہ
محبت کی فغاں بھی خوشنوائی
محبت کا وہ سنگ آستاں ہے
لرزتی ہے جبیں پارسائی
ہنسی کیا آئی آن نازک لبوں پر
''تبسم'' ایک دنیا مسکرائی

ہم بھی سر راہ منتظر ہیں
دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے
افسانۂ غم طویل ہے دوست
اس بات کو مختصر کریں گے
ہے شام فراق سخت تاریک
اس شام کی اب سحر کریں گے
آئے گا تبسم آن لبوں پر
آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی
زندگی ' زندگی نہیں ہوتی
جان پر کھیلتے ہیں اہل وفا
عاشقی دل لگی نہیں ہوتی
کیا کروگے کسی کی دلداری
تم سے تو دلبری نہیں ہوتی
موت کی دھمکیاں نہ دو مجھکو
موت کیا زندگی نہیں ہوتی ؟
عشق میں ہوشیاریاں بھی ہیں
محض وارفتگی نہیں ہوتی
عشق کی اشک ریزیوں کے بغیر
آبرو حسن کی نہیں ہوتی
دل ''تبسم'' کسی کو دو پہلے
مفت میں شاعری نہیں ہوتی

ہوتا تھا اثر کبھی فغاں کا
منہ دیکھ رہا ہوں آسماں کا

تو نے کھائی تو قسم ضبط محبت کی مگر
وہ کہیں بزم میں آجائیں تو پھر کیا ہوگا
دیکھ اے جذبۂ بے تاب سنبھل کر رہنا
آج سنتے ہیں وہ پھر انجمن آرا ہوگا

بارگاہ حسن میں

جہاں میں خلد مسرت کی یادگار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تو نو عروس شبستان زندگانی ہے
تو نو بہار گلستان شادمانی ہے
شباب کھیل رہا ہے ترا بہاروں میں
نشاط حسن کے شاداب خندہ زاروں میں
سرور و خواب کی دنیائے کیف بار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تری نگاہ میں فردوس رقص کرتے ہیں
لبوں پہ جنتیں عشرت کی مسکراتی ہیں
تری اداؤں پہ لرزاں ہیں کوثر و تسنیم
ضیائیں حور و ملائک کی جگمگاتی ہیں
ترا شباب طرب زار حسن فطرت ہے
جہاں میں تو ابدی راحتوں کی جنت ہے
مرا فسانۂ غم سن کے اشکبار نہ ہو
سکون قلب کو تکلیف اضطراب نہ دے
خدا کے واسطے تیغ نگہ کو آب نہ دے

مرد مومن

ترے ضمیر میں پوشیدہ کائنات کا راز
تری نظر میں دو عالم کی وسعتیں پنہاں
سکوں کی جنتیں آسودہ تیرے سینے میں
تری جبیں پہ تری بے نیازیاں رقصاں
ترے خیال سے لرزاں ہے شوکت الوند
ترے سجود سے ہے سرنگوں سپہر بلند
ترے نیاز سے خائف غرور قیصر و جم
تری نماز کے آگے سرِ ملائک خم
ترے جمال سے رخشندہ کائنات کا حسن
ترے جمال سے پائندہ عظمت انسان

ہر اک نفس میں نہفتہ حیات نو کی لگن
ہر اک نگاہ تری تازہ سرخوشی کی لگن

قطعات

آرزو کا گداز افسردہ
شمع غم کی بجھی بجھی تنویر
آ! کہ یہ زندگی ہے تیرے بغیر
اک پریشان خواب بے تعبیر

آج کچھ مضمحل سی یادوں کے
یوں سلگنے لگے ہیں افسانے
جیسے اک نیم سوز شمع کے گرد
سسکیاں لے رہے ہوں پروانے

کتنی ہنگامہ خو تمنائیں
مضمحل ہو کے رہ گئیں دل میں
جیسے طوفاں کی مضطرب موجیں
سو گئی ہوں کنارے ساحل کے

دل کی ہر آرزو ہے خوابیدہ
اب نہ وہ کیفیت نہ سوز نہ رنگ
ہر نظر ایک شعلۂ بے نور
ہر نفس ایک ساز بے آہنگ

آنسوؤں میں الم کا رنگ نہ تھا
قہقہوں میں خوشی کی بات نہ تھی
تھے عجب ڈھنگ زندگانی کے
کوئی بھی زندگی کی بات نہ تھی

ہر خزاں غارت چمن ہی سہی
پھر بھی اک سرخوشی بہار میں ہے
موت پر اختیار ہو کہ نہ ہو
زندگی اپنے اختیار میں ہے

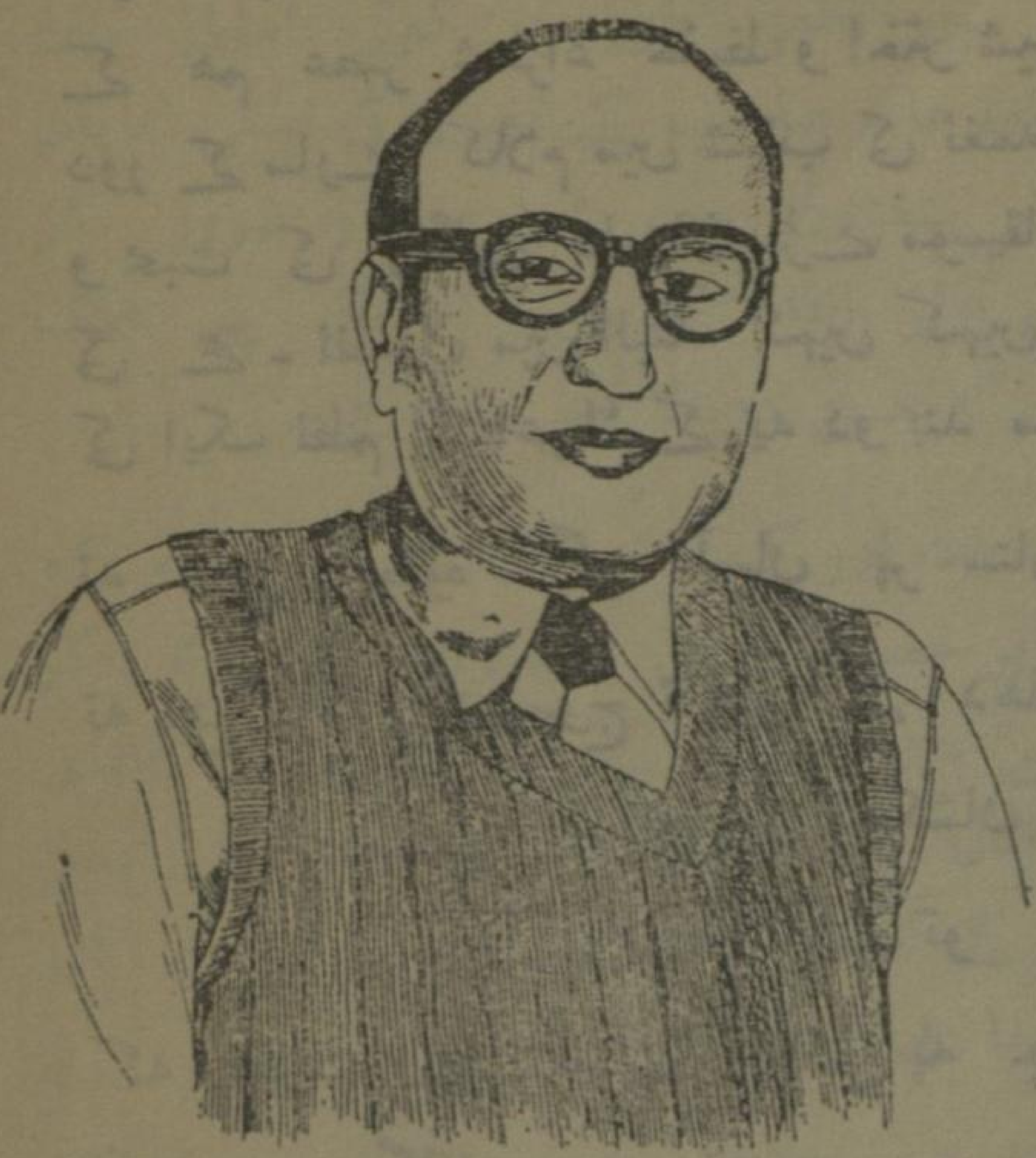
اے درخشندہ ماهتاب بتا
ان ستاروں کی بزم میں رہ کر
کتنی هنگامہ آفریں راتیں
هم نے تنہائیوں میں کاٹی هیں

رباعیات

ارباب وفا کی جاں گدازی دیکھی
اور اس پہ ستم کی سرفرازی دیکھی
مفلس کا نیاز هو کہ منعم کا غرور
هر چیز میں تیری بے نیازی دیکھی

آغوش میں آ کہ زندگانی کر لوں
کچھ روز خوشی سے زندگانی کر لوں
اک جام مئے طرب پلا دے ساقی
فانی هے حیات جاودانی کر لوں

عابد علی عابد



سید عابد علی نام عابد تخلص ، ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسمعیل خاں میں پائی جہاں آپ کے والد سید محمد عباس صاحب فوج میں ملازم تھے اس کے بعد لاہور کے رنگ محل مشن ہائی اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ سید صاحب نے ۱۹۲۳ء میں بی ۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ۔ ایل ۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ لیکن اس درمیانی وقفے میں انہیں چونکہ شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا اس لئے وہ ’’دلکش‘‘ اور ’’ہزار داستان‘‘ رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ۔ یہی وہ زمانہ ہے جب عابد صاحب نے ایک شاعر و افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی ۔

۱۹۲۵ء سے حضرت عابد نے گجرات میں وکالت شروع کی لیکن یہ مشغلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا تھا کہ علمی و ادبی ذوق آپ کو پھر لاہور کھینچ لایا ۔ لاہور آ کر آپ کے مطالعہ کا دور پھر سے شروع ہوا ۔ اور آپ نے انگریزی اور عربی کے تنقیدی ادب کا مطالعہ کیا ۔ اسی اثناء میں ایم ۔ اے کرنے کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم ۔ اے کیا اور اس کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ اس اسامی پر چار سال تک کام کر کے آپ ایف ۔ سی کالج لاہور چلے گئے جہاں آپ کو السنۂ شرقیہ کا صدر مقرر کر دیا گیا ۔

۱۹۳۲ء میں پروفیسر عابد دوبارہ دیال سنگھ کالج سے منسلک ہوئے اور تقسیم ہند سے قبل تک وہ کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے مگر قیام پاکستان کے بعد آپ کالج کے پرنسپل ہو گئے لیکن کچھ مدت کے بعد کالج میں کچھ ایسے تنازعات پیدا ہو گئے ۔ کہ آپ کو کالج سے علیحدہ ہونا پڑا ۔ لیکن ان مصروفیتوں اور پریشانیوں کے باوجود وہ مجسم شاعر ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ پچھلے چند سالوں سے اُن کی شاعری اپنے پورے شباب پر ہے ۔

حضرت عابد ایک خوش فکر اور مشاق سخنور ہیں انہوں نے غزل ، نظم ، گیت ، رباعی غرضکہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کی شاعری در اصل تغزل کی شاعری ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اب عرصہ سے وہ صرف غزل کہتے ہیں ۔ اُن کے

ابتدائی کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں وہ جدید اُردو شاعری کے اُس اسکول سے زیادہ متاثر تھے جسے غنائی اسکول کہا جا سکتا ہے اور جس میں خود اُن کے ہم عصر شعراء حفیظ و اختر شیرانی وغیرہ شامل تھے ۔ بنابریں عابد صاحب کے اس دور کے سارے کلام میں شباب کی نغمہ سرائی کا عنصر غالب ہے ۔ اُنہوں نے عشق و محبت کی رنگین داستان بڑے موسیقانہ و مترنم الفاظ اور رنگین و دلکش انداز میں بیان کی ہے ۔ نظموں میں البتہ کہیں کہیں اقبال کا رنگ بھی جھلکتا ہے ۔ مثال کے طور پر اُن کی ایک نظم ''شاعر'' کے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے ۔

نہ تھے جلوہ گر آسماں پر ستارے　　نہ تھے مہرِ گردوں کے روشن شرارے
نہ تھے یوں رواں موج تابش کے دھارے　　نہاں تھے یہ سب حسن کے ماہ پارے
ابھی کہکشاں جلوہ گستر نہیں تھی
ازل میں تو ہوگی فلک پر نہیں تھی

کہ فطرت نے اجزائے عالم پہ چھڑکا　　وہ پانی کہ اکسیر ہے نام جسکا
تپش ہو گئی روح قدرت میں پیدا　　ہر اک شے سے ذوق نظر پھوٹ نکلا
محبت در آغوش آیا ہے شاعر
مئے غم سے مدھوش آیا ہے شاعر

اقبال کی نظم ''محبت'' ذہن میں رکھیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عابد صاحب کے انداز فکر پر اقبال چھائے ہوئے ہیں ۔

اس کے بعد حضرت عابد کی شاعری کا وہ دور آتا ہے جس میں صرف غزل اُن کے جذبات و مشاہدات کا ذریعہ اظہار بنی اور اُس میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا حسین و متوازن امتزاج بھی پیدا ہوا ۔ اپنے اس مسلک کی وضاحت خود عابد صاحب نے ایک شعر میں فرمائی ہے ۔

قرض جتنے غم دوراں کے ہیں مجھ پر عابد　　غم جاناں کی وساطت سے ادا ہوتے ہیں

اس دور کی غزلیات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُن تمام تحریکات سے متاثر ہوئے جو اُن کے گرد و پیش اُٹھ رہی تھیں اور اسی لئے باوجود قدما کی طرز میں غزل لکھنے کے اُن کی شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے ۔ اس انفرادیت میں موجودہ رجحانات ، اثرات اور اُن کی طبیعت کی اُفتاد کو بہت بڑا دخل ہے ۔ جناب عابد کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق رجائی ہے اور وہ بڑے زندہ دل انسان ہیں ۔ چنانچہ یہی زندہ دلی انکے تغزل میں کش مکش حیات اور حسن کاری کے درمیان ایک لطیف توازن پیدا کرتی ہے ان کی شاعری میں سیاسی خیالات بھی تلقین و پروپیگنڈے کے بجائے حسن کے ایسے نفیس سانچوں میں ڈھل کر نکلتے ہیں کہ پڑھنے والا محظوظ و متاثر تو اکثر ہوتا ہے لیکن منغض کبھی نہیں ہوتا ۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے عابد صاحب اساتذہ کے طرز اظہار کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ہماری کلاسیکی شاعری کا گہرا

مطالعہ کیا ہے اور میر، غالب، آتش وغیرہ کے رنگ کی جھلکیاں اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ ساتھ ہی اس غائر مطالعہ کی بدولت اُنہیں زبان پر ایسی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ اُن کی اور اہل زبان شعرا کی زبان میں قطعی طور پر کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا، صاف، شستہ اور منجھی ہوئی زبان عابد صاحب کے تغزل کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو اُنہیں کم از کم پنجاب کے دیگر متغزلین میں ممیز و ممتاز ضرور کر دیتی ہے۔ بعض اوقات عابد صاحب اشعار میں ہم آواز الفاظ کے پیہم استعمال سے ایک ایسی صوتی خوش آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

حضرت عابد کی شاعری کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اردو شاعری میں گو ”ساقی نامہ“ کو باقاعدہ طور پر حضرت نفیس لکھنوی نے رائج کر دیا تھا لیکن اُس کے بعد معدودے چند شعرا ایسے ہیں جنہوں نے اس روایت کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے بالخصوص پنجاب میں علامہ اقبال کے بعد عابد صاحب ہی ایسے قادرالکلام سخنور ہیں جنہوں نے فارسی ساقی ناموں کے اُصول کی پیروی بھی کی ہے اور ساتھ ہی ہندی فضا کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

غرض حضرت عابد ہر لحاظ سے ایک کامیاب سخنور ہیں بالخصوص غزلگو کی حیثیت سے وہ بلاشبہ ایک امتیازی شان کے مالک ہیں۔ ساتھ ہی ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ شاگردوں کے مجموعے چھپواتے ہیں مگر اپنے مجموعہ کلام کی تدوین کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ باوجودیکہ اُنہوں نے بہت کچھ کہا ہے لیکن اب تک اُن کا ایک مجموعہ بھی شایع نہیں ہوا۔

انتخاب کلام

غزلیات

سب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں — وہ نہ جانے کدھر سے گزرے ہیں
موج آواز پائے یار کے ساتھ — نغمے دیوار و در سے گزرے ہیں
آج آیا ہے اپنا دھیان ہمیں — آج دل کے نگر سے گزرے ہیں
گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں — جتنے سیلاب گھر سے گزرے ہیں
زلف کے خم ہوں یا جہان کے غم — مر مٹے ہم جدھر سے گزرے ہیں
صدف تہ نشیں بھی کانپ گیا — کیسے طوفان سر سے گزرے ہیں
باغ شادابِ موجِ گل ہی نہیں — سیل خوں بھی ادھر سے گزرے ہیں

جب چڑھی ہے کہاں کہیں ”عابد“
تیر میرے جگر سے گزرے ہیں

کسی کی عشوہ گری سے بہ غیر فصل بہار
سبھی کا چاک گریباں ہے دیکھئے کیا ہو
تمہیں خبر ہی نہیں اے طیور نغمہ سرا
یہی چمن یہی زنداں ہے دیکھئے کیا ہو
جہاں کشودِ نوا پر خزاں کے پہرے ہیں
وہیں بہار غزل خواں ہے دیکھئے کیا ہو
سبو اُٹھا کہ یہ نازک مقام ہے ساقی
نہ اہرمن ہے نہ یزداں ہے دیکھئے کیا ہو
رواں ہے موج گل و لالہ موج خوں کی طرح
چمن شہید بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو
درازئ شب ہجراں سے مجھ کو خوف نہ تھا
کسی کی زلف پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو
ہوا کا رنگ یہ ہے آشیاں تو ایک طرف
قفس بھی شاخ پہ لرزاں ہے دیکھئے کیا ہو
یہی ہے دل سے شکایت کہ میرا محرم راز
مجھی سے دست و گریباں ہے دیکھئے کیا ہو
ہمیں ہیں پیر مغاں کافروں کے اے ''عابد''
ہمیں کو دعوئ ایماں ہے دیکھئے کیا ہو

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
جن گلیوں میں ہم نے سُکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
اُن گلیوں میں بیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں
روپ سروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھُور اندھیرے پھرتے ہیں
جن کے شام برن سائے میں میرا من سستایا تھا
اب تک آنکھوں کے آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں
کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو، اُن پر دل کیوں ریجھ گیا
تیکھی چتون، بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ہیں

اک دن اُس نے نین ملا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا
تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں
اس نگری کے باغ اور من کی یارو لیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پہ اُٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں
لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابد ہم دیوانے ہیں، جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

غم دوراں غم جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصف خوباں بہ حدیث دگراں ہے کہ جو تھا
شرع و آئین کی تعزیر کے باوصف شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
عشق کی طرز تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لب خوش گوئے ہوس محو بیاں ہے کہ جو تھا
مغ بچے خوش ہیں کہ بزم اُن کی ہے ساقی اُن کا
بر سرِ کار وہی پیر مغاں ہے کہ جو تھا
سنگ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصر بلند
یہ وہی کارگہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

کہو بتوں سے کہ ہم طبع سادہ رکھتے ہیں
پھر اُن سے عرض وفا کا ارادہ رکھتے ہیں
یہی خطا ہے کہ اس گیرو دار میں ہم لوگ
دل شگفتہ، جبین کشادہ رکھتے ہیں
خدا گواہ۔ کہ اصنام سے ہے کم رغبت
صنم گری کی تمنا زیادہ رکھتے ہیں
دکان بادہ فروشاں کے صحن میں ''عابد''
فرشتے خلد کا اک در کشادہ رکھتے ہیں

گردش جام نہیں رک سکتی جو بھی اے گردش دوراں گزرے
صبح محشر ہے بلائے ظاہر کسی صورت شب ہجراں گزرے
کوئی برسا نہ سرِ کشت وفا ق کتنے بادل گہر افشاں گزرے

ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس
کئی آذر کئی یزداں گزرے
اے غمِ یار تری راہوں سے
عمر بھر سوختہ ساماں گزرے
وہ جو پروانے جلے رات کی رات
منزلِ عشق سے آساں گزرے
غمِ ہستی کے بیابانوں سے
کچھ ہمیں تھے جو غزلخواں گزرے
غم کے تاریک اُفق پر "عابد"
کچھ ستارے سرِ مژگاں گزرے

آیا ہمارے جینے کا انداز سب کو یاد
جب ذکرِ جاں نثارئ پروانہ ہو چکا
اُس بد نصیب کو نہیں ملتی کہیں پناہ
جو تیری بار گاہ سے بے گانہ ہو چکا

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گذری ہے
وہ زندگی جو سرِ راہگذار گذری ہے
گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
کہیں چمن سے نسیمِ بہار گذری ہے
کہیں سحر کا اجالا ہوا ہے ہم نفسو
کہ موجِ برق سرِ شاخسار گزری ہے
رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے
یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے
اُنہیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
اُنہیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے
حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک "عابد"
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

عام ہو فیضِ بہاراں تو مزا آ جائے
چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آ جائے
واعظو! میں بھی تمہاری ہی طرح مسجد میں
بیچ دوں دولتِ ایماں تو مزا آ جائے
کیسی کیسی ہے شبِ تار یہاں چیں بہ جبیں
صبح اک روز ہو خنداں تو مزا آ جائے
ساقیا! ہے تری محفل میں خداؤں کا ہجوم
محفل افروز ہو انساں تو مزا آ جائے

ہنس رہی ہے کلی کلی کہ ہوا
سارے گھونگھٹ اُلٹ گئی کل رات
اُن کے گیسوئے عنبریں کے طفیل
کس تکلف سے کٹ گئی کل رات

ایک دنیائے رنگ و رامش و نور　　میرے دل میں سمٹ گئی کل رات
اب سنا ہے کہ گردش دوراں　　الٹے پاؤں پلٹ گئی کل رات
بڑھ گیا ذوق زندگی عابد
عمر کچھ اور گھٹ گئی کل رات

دنیا میں اپنی صبحیں نہ شامیں　　دل کے اندھیرے دل کے اجالے
اے ہم صفیرو گلشن قفس ہے　　آنکھوں پہ مہریں ہونٹوں پہ تالے
میخوار ساقی قطرے کو ترسیں !　　برسیں چھا چھم ساون کے جھالے !
فصل بہاراں گویا دلہن ہے　　پھولوں کا آنچل چہرے پہ ڈالے

آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل　　جلنے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول
بے تاب ہے جنوں کہ غزلخوانیاں کروں　　خاموش ہے خرد کہ نہیں بات کا محل
کیسے دئے جلائے غم روزگار نے　　کچھ اور جگمگائے غم یار کے محل
اب ترک دوستی ہی تقاضا ہے وقت کا　　اے یار چارہ ساز مری آگ میں نہ جل
اے التفات یار مجھے سوچنے تو دے　　مرنے کا ہے مقام یا جینے کا ہے محل
ہم رند خاک و خوں میں اَٹے ہاتھ بھی کٹے　　نکلے نہ اے بہار ترے گیسوؤں کے بل

خوں فشاں دست صبا دیکھا ہے　　میں نے کل باغ میں کیا دیکھا ہے
دور ہے گھر ابھی ویرانی کا　　ابھی امید نے کیا دیکھا ہے
اے سر خار کہاں ہے "عابد"　　کہیں وہ آبلہ پا دیکھا ہے

اہرمن یار ، نہ یزداں محرم　　یہی تقدیر بشر ہے ساقی
گیسوئے یار ہیں گو شامل کار　　ہر شب غم کی سحر ہے ساقی
زندگی آنچ ہے انگاروں کی　　عاشقی رقص شرر ہے ساقی
ہے نہیں چارۂ حرماں کہ مجھے　　غم بہ اسلوب دگر ہے ساقی
کچھ تکلف مجھے تلچھٹ میں نہیں　　میکدہ تو مرا گھر ہے ساقی

دیکھنا یہ ہے کہ انداز سحر کیا ہوں گے
یوں تو ارباب جنوں رات گزر جائیگی

میں ترا محرم اسرار ہوں اے صبح بہار
جا کے پھولوں سے کہوں ، رات گزر جائیگی
مژدۂ صبح مبارک تمہیں اے دیدہ ورو
میں جیوں یا نہ جیوں ، رات گزر جائیگی
رات بھر میں نے سجائے سر مژگاں تارے
مجھ کو تھا وہم کہ یوں رات گذر جائیگی

شکووں پہ مجھے بھی تھی ندامت — کچھ اُس کی نگاہ بھی خجل تھی
دنیا کے لئے بنی وہ ٹھنڈک — سینے میں جو آگ مشتعل تھی
اب عکس نشاط بن گئی ہے — وہ غم کی خلش کہ جاں گسل تھی

یوں بڑھی اُن سے راہ و رسم وفا — کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی
شب غم کا طلسم کیا کہیئے ! — دھوپ چڑھنے پہ بھی سحر نہ ہوئی
میرا مرنا تو اُن پہ کیا کھلتا — میرے جینے کی بھی خبر نہ ہوئی

یہ رنگ و نور کے جلوے یہ دلکشا نغمے — صنم کدے ہیں کہ ذوق نظر بہشت میں ہے
یہ ساکنان حرم سے پتہ چلا عابد — کہ ڈھونڈنے جسے نکلے ہو وہ کنشت میں ہے

دشت ایمن سے چلے ، کوئے بتاں تک پہنچے
تیرے دیوانے رموز دو جہاں تک پہنچے
بت کے راندے ہوئے ، اللہ کے ٹھکرائے ہوئے
آخر کار در پیر مغاں تک پہنچے
رہ گئے یار قتیل غم دوراں ہو کر
ہم سے کچھ سوختہ جاں کوئے بتاں تک پہنچے
دامن یار کی راہوں سے گزر کر آخر
دست گستاخ سر تاجوراں تک پہنچے
چاند اُترا مرے کاشانے میں عابد کل رات
دیکھئے رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے

اے دوست موج رنگ سے بنتے نہیں چمن — اے دوست موج خوں کی طلبگار ہے بہار
نوک زبان خار کی دیکھی نہیں ادا — غافل کو وہم ہے گل و گلزار ہے بہار

کمال صبر و ضبط ہے یہ میری بود و ہست ہے
دیار عاشقی میں حوصلوں کی راہ پست ہے
نظر ہے کامگار حسن ' یار پھر بھی خوش نہیں
یہ بندوبست عشق ہے کہ فتح کو شکست ہے

کیسے کیسے نقش ہائے علم و فن سینے میں ہیں
بن گئے ہیں اپنے حسن فکر کا بت خانہ ہم
منزلیں ایمان و عرفاں کی بہت پر پیچ تھیں
رہ گئے ہو کر شہید مسلک رندانہ ہم

بے حسی بری شے ہے دل کو مضطرب کر لوں
یا وفور عشرت سے یا غم تمنا سے

مدت کے بعد آئے ہیں اے راہبر ' جہاں
میرا قیاس ہے کہ چلے تھے وہیں سے ہم

یوں تو میٹھی زباں ہے ظالم کی — آنکھ میں رنگ التفات نہیں

تدبیر ترک عشق ' ورائے جنون غم
دل پر ہو اختیار تو کیا کیا نہ کیجئے

شوق سے خود جو مرے راہنما ہوتے ہیں
مری قسمت کہ وہی آبلہ پا ہوتے ہیں
بادہ نوشی پہ مصر ' بادہ نوشی پہ خفا
محو حیرت ہوں کہ یہ لوگ بھی کیا ہوتے ہیں

لب سے ہوتی ہوئی آنکھوں میں ہنسی جاتی ہے

اے بتو! پیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں
یہی بت شب کے اندھیرے میں جو ہیں بندۂ شوق

یہی بت دن کے اجالے میں خدا ہوتے ہیں
کوئی پروانو کو سمجھاؤ کہ مرنے کے سوا

اور بھی چند مقامات وفا ہوتے ہیں

قرض جتنے غم دوراں کے ہیں مجھ پر "عابد"
غم جاناں کی وساطت سے ادا ہوتے ہیں

ساقی نامہ

فسون خرد سے ہے دل تلخ کام
پلا ساقیا بادۂ لعل فام
نہ دل شادماں ہے نہ طبع جواں
مجھے کھا گئی فکر سود و زیاں
نہیں کم یہ شرمندگی ساقیا
گئی رائگاں زندگی ساقیا
مغنی کوئی نغمۂ درد ناک
جسے سن کے ہوجائے دل چاک چاک
دُرت میں کدارا بجا چنگ پر
کہ آئے طبیعت مری رنگ پر
سنا کوئی پنجاب کی داستاں
کہ دل پر ہے بار محبت گراں
وطن ہے میرا حسن کی سر زمیں
کمی اس جگہ دلبروں کی نہیں
یہاں رنگ احباب محفل نہیں
یہاں جمع اسباب محفل نہیں
یہاں دھلوی خوش کلامی نہیں
اُصول زباں کی غلامی نہیں
یہاں خنجر ناز ہے خوں فشاں
یہاں خاک کا رنگ ہے ارغواں
یہاں ساز میں سوز' پانی میں آگ
یہاں جوگ میں مل گیا ہے بھاگ
یہاں موت سے کھیلتا ہے جنوں
یہاں روز بہتا ہے دریائے خوں
یہاں نوجوانی سے ڈرتی ہے موت
یہاں مرنے والوں پہ مرتی ہے موت

مغنی سن اے رازدان بہار
بہت تیز ہے کاروان بہار
کلی کو چٹکنے کی فرصت نہیں
ہوا کو مہکنے کی مہلت نہیں
آٹھ اے زینت انجمن رقص کر
آٹھ اے رشک سرو سمن رقص کر
ذرا ساز سے ناز کے سُر ملا
بڑی دیر کے بعد یہ گر ملا
کہ مستی میں کھلتا ہے راز حیات
اسی سُر پہ بجتا ہے ساز حیات

بہار آئی ساقی بط مے اُٹھا — ھتھیلی پہ تخت جم و کے اُٹھا
دکھا کوئی محفل کو جادو گری — اُتار اپنے شیشے میں ساقی پری
مئے لعل کو آب حیواں بنا — خط جام مے کو رگ جاں بنا
نہیں قید کچھ بھیرویں ٹھاٹھ کی — کوئی شے کسی دل نشیں ٹھاٹھ کی
کوئی شے شہانہ ہو یا شاھناز — کوئی دھن بطرز عراق و حجاز
کوئی سُر ھو کومل، رکھب یا گندھار — کوئی تال ھو دادرا یا دھمار
سن اے نغمہ گر اے بہار آفریں — تری ساحری پر ھزار آفریں
خرد کا ھے شیرازہ بکھرا ھوا — سنا دے کوئی راگ نکھرا ھوا

کہانی ھم اپنی سنانے لگے — وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگے
وہ پہلو میں ھیں اور شام بہار — یہی خواب رہ رہ کے آنے لگے
حیا سے جو کرتے نہ تھے ھم سے بات — وہ اب چٹکیوں میں اُڑانے لگے
دئے حسن نے ایسے ایسے فریب — کہ ھم عشق سے جی چرانے لگے
وہ سن لیں جو ’’عابد‘‘ یہ رنگیں غزل
تو محنت ھماری ٹھکانے لگے

غم کے محور پہ ھیں ٹھہرے ھوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات
نہ مکاں آج ھے ثابت نہ زماں ھے سیّار
نہ خزاں شعبدہ آرا نہ بہار آج کی رات

تصدّق حسین خالد



تصدق حسین نام خالد تخلص ۶ نومبر ۱۹۰۰ء کو پشاور میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد میاں محمد بخش صاحب بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے - لیکن چونکہ میاں صاحب ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۷ء تک پشاور سے تبدیل ہو کر راولپنڈی میں سکونت پذیر رہے اس لئے خالد صاحب کا بچپن اور زمانہ طالب علمی راولپنڈی ہی میں بسر ہوا - تصدق حسین صاحب کا آبائی وطن بٹالہ ضلع گورداسپور ہے اور خاندانی اعتبار سے آپ کا تعلق پنجاب کے اس معروف گھرانے سے ہے جس میں سر فضل حسین مرحوم اور میاں افضل حسین ایسے شہرہ آفاق لوگ ہوئے ہیں -

خالد صاحب نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی میں حاصل کی - ایف - اے گارڈن کالج راولپنڈی اور بی - اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا - آپ کی طالب علمی کا زمانہ بڑی شاندار روایات کا حامل ہے آپ نے ایک طرف تو نہایت ذہین و محنتی طالب علم ہونے کی حیثیت سے پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے تمام امتحانات بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کئے اور ہمیشہ وظائف حاصل کئے اور دوسری طرف اپنے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے آپ ادبی مجالس میں سرگرم حصہ لیتے رہے - ۱۹۲۴ء میں آپ نے انگریزی ادبیات میں ایم - اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال پنجاب سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور ہر مضمون میں اول رہے - ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر متعین رہے پھر ۱۹۳۲ء میں پنشن حاصل کر کے مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے - وہاں لندن یونیورسٹی سے بی - اے آنرز اور پی - ایچ - ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں - ۱۹۳۴ء میں رائل اکنامکس سوسائٹی لندن کے فیلو منتخب ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں بیرسٹر ہو کر وطن واپس آئے - جب سے لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں -

خالد صاحب کو شعر و شاعری سے بچپن سے ہی دلبستگی ہے - آپ نے ۱۹۱۹ء سے شعر کہنا شروع کئے - ابتداً غالب اور اقبال کا مطالعہ بیشتر رہا اس لئے اُن کا رنگ غالب تھا - زاں بعد ۱۹۲۵ء سے نظم آزاد لکھنا شروع کی - انگلستان کے دوران قیام میں وہاں کے نامور شعرا سے ملاقاتوں اور مروجہ انگریزی شاعری کے عمیق مطالعے کا یہ

اثر ہوا کہ آپ ماضی کی پابند شاعری کے حلقے سے ہمیشہ کے لئے نکل کر نہ صرف آزاد شاعری کے رسیا بن گئے بلکہ اُس کے فروغ دینے میں بڑی مستعدی سے حصہ لینے لگے۔ اور اس میں شک نہیں کہ آج اُن کا شمار اُردو کے اُن چند باغی شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو نظم میں ایک نئے تجرباتی دور کا آغاز کیا اور مروجہ اصناف سخن اور اسالیب بیان سے ہٹ کر نئی نئی راہیں نکالیں۔

تصدق حسین خالد نے قدیم اُردو شاعری سے صرف موضوع ہی میں نہیں بلکہ ہیئت میں بھی انحراف کر کے نظم آزاد اور نظم معریٰ میں دلی کیفیات اور جذباتی تجربات بیان کئے اور نئے اسالیب سخن کو مقبول و پسندیدہ بنانے کی جد و جہد کی۔ اُن کی نظموں میں تاثر، ایمائیت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ نئی نئی تشبیہات اور جدید استعارات بکثرت ملتے ہیں۔

مختلف انسانی جذبات نظم میں ڈھلنے کے لئے مختلف ہیئتوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔ تصدق صاحب اس رمز سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس سے کام بھی لیتے ہیں۔ وہ اپنے دلی جذبات اور نفسیاتی کیفیات و تجربات اپنی تخئیل سے ہم آہنگ کر کے مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کرنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایجاز بھی ہے اور تاثیر بھی۔ تاہم یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بعض نظموں میں وہ ابہام بھی موجود ہے جو رفتہ رفتہ ہماری آزاد شاعری کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔

مختصر یہ کہ تصدق حسین خالد صاحب کا شمار اُردو کے اُن جدید شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف قدیم موضوعات سخن اور اسالیب بیان سے منہ موڑا بلکہ اُردو شاعری کے روایتی محبوب اور اُس نظریۂ محبت کے خلاف بھی بغاوت کی جس کی رو سے محبوب یا تو حسن جفا پیشہ ہوتا ہے یا شاہد بازاری۔ آپ کے کلام میں مروجہ بحور اور اوزان کے نئے نئے تجربات بھی ملتے ہیں اور ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ بحر کے استعمال سے بحور و اوزان کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ موصوف کا مجموعہ کلام ''سرود نو'' عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین و تراجم بھی مختلف رسائل میں اکثر چھپتے رہے ہیں۔

انتخاب کلام

پیام

فضاؤں میں کوئی نا دیدہ نا معلوم رستہ ہے

جہاں جذبات مضطر، روح کے سیماب پا قاصد،

صعوبات سفر سے بے خبر، اک دور منزل کو،

پروں میں الفتوں کے راز کو لے کر،
ہواؤں کی طرح آزاد بے پروا اڑے جائیں،
پیام شوق دے آئیں ؟
اگر اس رات، اس بے راہ رستے پر،
کوئی جذبہ دل بے تاب سے اٹھ کر،
عناں برداشتہ نکلے،
اشارے گرم جوش آرزو آئیں گے ایثر پر
انھیں پڑھنا،
اگر منظور خاطر ہو،
جواباً ایک جذبے کو سوار برق کر دینا۔

پشیمانی

موت کا راگ نفیری پہ بجاتی اٹھی
لُو، جھلستی ہوئی لُو،
اٹھی
بڑھی
ریت پہ جیسے دھواں اٹھتا ہو
سرسراہٹ سی درختوں میں ہوئی
پتے مرجھا گئے
گرنے لگے
وہ ان کے کھڑکنے کی صدا — میرے خدا

لُو کے ہمراہ بڑھے
موت کے ناچ کا نکلا تھا جلوس
چونک کر جاگ اٹھے صحن چمن میں طائر
آشیانوں سے جدائی انھیں منظور نہ تھی
سہم کر اٹھے، اڑے، اڑ کے وہیں آن گرے
ان کی اس آخری فریاد کی غمناک صدا — میرے خدا

اک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جھکائے ہوئے سر
ہاتھ آنکھوں پہ رکھے
بیٹھی ہے غمگیں اداس مجبور
پہلو میں افسردہ خوشی کو لئے
سانس رکنے لگا
خون جمنے لگا
بیکلی ڈھونڈتی پھرتی ہے پناہ
رینگتا رینگتا خوف آیا سسکتا ہوا سانپ
بیکلی کانپ اٹھی
خوف جھپٹ کر اٹھا ، بیکلی نزع میں تھی
مجھ کو بچا —— میرے خدا

تیرگی کانپی
فضا لرزی
کھلی کرنوں کی راہ
روحیں جو وسعت آفاق میں آوارہ سی تھیں
ڈھونڈتی پھرتی تھیں منزل اپنی
پھڑ پھڑائے ہوئے پر اپنے اٹھیں
اور ہواؤں میں بڑھیں
سامنے جنت گم گشتہ نظر آتی تھی

اعجاز تصور

راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساتھی نہیں ، میں ہوں ، مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ
دور ان سے بھی کہیں دور مجھے جانا ہے
اس بلندی پہ اڑے جاتا ہے توسن میرا
کہکشاں گرد سی دیتی ہے دکھائی مجھ کو

رفعت عرش سے مٹتا ہوا مبہم سا شرار
میری منزل ہے کہاں یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہی کسے ؟ دل میں مگر رہتا ہے
درد وہ درد کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
چاند کچھ راہ مرے ساتھ ہوا تھا لیکن
رہ گیا دور کہیں ہار کے ہمت اپنی
زہرہ کہنے لگی ''اے بزم فلک کے قاصد
زرد رو پہلی ہی منزل میں ہوا تو کیوں کر
جب کہ وہ خاکئی بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کئے جاتا ہے''
بھر کے اک آہ کہا چاند نے یوں زہرہ سے
''اے نگار رخ زیبائے بہار افلاک
میں بھی حیران ہوں اس ہمت عالی پہ کہیں
حسن سلمیٰ کے تصور کا یہ اعجاز نہ ہو
یہ جواں حوصلگی پردہ در راز نہ ہو'' ۔

حسن قبول

گرج رہا ہے سیہ مست، پیل پیکر ابر
اداس کوہ کی چوٹی پہ ایک تنہا پیڑ
اٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ
سرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا بیکس ہاتھ
ہجوم یاس میں اک آخری دعا کے لئے
''برس محیط کرم ایک بار اور برس
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے
تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں ساز و برگ نمو
یہ میری کلیاں یہ پتے، ابھی تو زندہ ہوں
اتر اتر مرے دامن پہ پھول برسا دے''
مچل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا

دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا
شرار برق کا ہیجان
پیڑ —— طور بدست ۔
زفرق تا بقدم ایک پھول
حسن قبول !

شیر دل خاں

شیر دل خاں !
میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے مسلسل ذلتیں
جنگ
روٹی
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتاب مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی ——
آف کنوارا ،
کیا کہوں ——

احسان دانش



احسان الحق نام احسان تخلص - دنیائے شاعری میں احسان دانش کے نام سے مشہور ہوئے - احسان کا خاندانی وطن باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن اُن کے والد قاضی دانش علی نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی - یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان کی پیدائش ہوئی - قاضی دانش علی زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے اور محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے تھے تاہم خوش مذاق اور علم دوست تھے اسی لئے اُن کی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے چشم و چراغ کو زیور علم سے ضرور آراستہ کریں لیکن برا ہو اس مفلسی کا جس نے نادار باپ کی خواہش پوری نہ ہونے دی اور احسان کی تعلیم نامکمل رہی - چند عربی فارسی کتابیں حافظ محمد مصطفیٰ سے پڑھیں اور مدرسہ کی چوتھی جماعت سے اُٹھ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہونا پڑا - اس سلسلے میں کچھ عرصہ کاندھلہ اور دہلی میں قیام رہا پھر لاہور کیا آئے کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے -

لاہور میں '' مکتبۂ دانش '' کے قیام سے پہلے احسان کو غم روزگار نے جن جن دشوار منزلوں سے گذارا ہے اُن کی تفصیل میں جاتے ہوئے سچ مچ قلم تھراتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے - احسان نے اپنی ادبی زندگی سے قبل اسی لاہور میں مزدوری ' معماری ' باغبانی ' چوکیداری اور نہ جانے کیا کچھ کیا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ قسمت کی ان گوناگوں گردشوں اور پریشانیوں کے باوجود احسان نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت وقت نکال کر کتب بینی ضرور کی - اس طرح خود علم حاصل کرکے اس مزدور شاعر نے اپنی ابتدائی تعلیمی کمی کو بڑی حد تک پورا کر لیا - غرض احسان اس لحاظ سے یقیناً لائق صد ستائش ہیں کہ اُن کی زندگی خود تعمیر کردہ ہے - اُنہوں نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی ' اُسی کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے مگر اس افلاس کے پیدا کردہ مصائب و مشکلات کا مقابلہ بڑی ہمت و جوانمردی سے کیا اور عزم و استقلال کا دامن اُس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اُنہیں دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت نہ حاصل ہو گئی -

ابتداً شعر و شاعری کا ذوق قاضی محمد زکی کی صحبت میں ہوا جسے احسان کے میلان طبع نے اور ہوا دی حتیٰ کہ فطری ذہانت اور جودت کی رہنمائی میں بہت جلد

نظم نگاری میں ایک خاص ملکہ حاصل کر لیا یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں ایک مخصوص سیاسی بیداری پھیل رہی تھی اور انقلابی رجحانات اور ترقی پسند نظریات مقبول ہو رہے تھے اس زمانہ میں شعر و شاعری میں بھی یہ رجحانات بڑی تیزی سے راہ پا رہے تھے اور سماجی دکھوں کا بھرپور اظہار اس دور کی شاعری کا طرۂ امتیاز بن رہا تھا - غرض کچھ اس مقبول رنگ سے متاثر ہو کر اور بیشتر اپنے تلخ تجربات و مشاہدات سے مجبور ہو کر احسان نے اپنی منظومات کا موضوع سخن مزدور کی زندگی قرار دیا اور اس دکھی طبقہ کی زندگی کی ترجمانی میں چونکہ فن کاری کے ساتھ ساتھ خلوص بھی شامل تھا اس لئے احسان کے کلام کو جو مقبولیت و امتیاز حاصل ہوا اُس کا پوچھنا ہی کیا - ۱۹۳۶ء کے بعد تقریباً سارے ہندوستان میں جہاں جہاں بھی اچھے مشاعرے ہوئے اُن میں نہ احسان کے بغیر رنگ جمتا اور نہ ہی نوجوان طبقہ مطمئن ہوتا تھا - یہی وہ زمانہ تھا جب احسان اُفق شاعری پر اُبھرتے ہی آفتاب بن کر چمکنے لگے -

احسان نے ذاتی تجربات کی بنا پر مزدور طبقہ کی ترجمانی میں اُس کی زندگی کی بہت سی عبرتناک تصویریں پیش کی ہیں جنھیں دیکھ کر بسا اوقات بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں - واقعات و مناظر کی تصویر کشی میں احسان کو بڑی قدرت حاصل ہے انہیں ماہر فن انیس کی طرح واقعات و مناظر کے بیان میں جزئیات سے کام لے کر نقوش کو ہلکا و گہرا کرنا خوب آتا ہے اور جذبات کے لطیف فرق کو نمایاں کرنے میں اُنہیں ید طولیٰ حاصل ہے - احسان کی واقعہ نگاری و منظر کشی کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ ان کی تصویروں کے نمایاں کرنے میں انکے درد و تاثر کو حسب ضرورت کم و بیش کر کے بڑے واضح خد و خال پیش کرتے ہیں - تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لئے وہ اکثر مفلسی و ناداری کی غمناک تصویریں پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں - چنانچہ اس بھیانک تمہید کے بعد جب اصل تصویر سامنے آتی ہے تو اُس کا اثر یقینی طور پر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے -

احسان کی زندگی جیسے ماحول اور مصائب و آلام میں گزری ہے اُس کا لازمی طور پر نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ اُنکے جذبات میں بے پناہ شدت پیدا ہو جائے - اس شدت جذبات نے ایک طرف تو احسان سے ''باغی کا خواب'' یا ''سادھو کی چتا'' جیسی بھیانک نظمیں کہلوائیں جو اتنی ادبی لطافتوں کے ساتھ شاید ہی کوئی دوسرا شاعر کہہ سکے اور دوسری طرف کلام میں بعض اوقات سخت تریں تلخی پیدا کر دی ہے جو اگرچہ شاعر کے دل کی آواز ہے اور اُس کی تہ میں خود اُس کے تلخ تجربات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ شاعرانہ رواداری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی -

احسان کی شاعری بھی انقلابی شاعری ہے - وہ نادار مزدور کی پامال زندگی کی اصلاح بھی چاہتے ہیں - لیکن یہاں آ کر احسان کبھی جوش کی طرف جھکتے ہیں کبھی علامہ اقبال کے ہم خیال ہوتے ہیں اور کبھی یہ مسئلہ مصلحین کے سپرد کر کے خاموش ہو جاتے ہیں - احسان کے اس ذہنی خلفشار کا سبب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود اُنکے خیالات میں تصورات واضح نہیں ہیں اور وہ زندگی و سماج کے بنیادی مسائل پر رسمی و مذہبی قیود سے نکل کر علمی و تحقیقی نگاہ نہیں ڈالتے - وہ سرمایہ داری اور اُس کی

جملہ اقسام کی سخت ترین مذمت تو کرتے ہیں مگر اپنے طبقاتی تعلق کی اہمیت کو زیادہ نہیں سمجھتے۔ بایں ہمہ جوش و اقبال کا اثر اُن پر اتنا گہرا نہیں ہے کہ خود اُنکی شاعرانہ انفرادیت ختم ہو جائے۔ احسان کا اپنا مشاہدہ اتنا وسیع اور تیز ہے کہ وہ محض اسی کے بل بوتے پر واقعات کو بڑے شاعرانہ اور دلکش انداز میں پوری قدرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

احسان کی رومانی نظمیں بھی بڑی والہانہ ہیں اور اُن میں حسن و عشق کے کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے کافی شعر ملتے ہیں۔ اس منزل میں احسان کی شدت جذبات بڑی لطیف اور نرم صورت اختیار کر لیتی ہے۔ زبان میں مٹھاس اور حلاوت کے ساتھ بیان میں بڑی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے اور احسان واردات کے بیان کو خوب ٹھہر ٹھہر کر بڑی تفصیل کے ساتھ اسطرح بیان کرتے ہیں کہ سارا منظر پڑھنے یا سننے والے کی آنکھوں سامنے کے آ جاتا ہے۔ احسان نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن اُن کی غزلوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے پختہ رنگ کے بعد تغزل میں وہ خاصے پھیکے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ نظم گوئی کے میدان میں احسان نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اور یہی پانا غزل کی بیگانگی کا باعث ہوا ہے۔ احسان جس تفصیل و وضاحت کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ غزل کو بے کیف و بے رنگ بنا دیتی ہے۔ تاہم اُن کی غزلوں میں جذبات کی آئینہ داری ضرور ملتی ہے بالخصوص تقسیم کے بعد اُن کی غزلوں میں ایک طرح کا نکھار پیدا ہونا شروع ہوا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اسی توجہ کے ساتھ وہ غزلیں کہتے رہے تو عنقریب اس خیال کی تردید ہو جائیگی کہ احسان کی غزلیں ردیف و قافیہ کی قید میں عاشقانہ نظمیں ہوتی ہیں۔ احسان کی تازہ غزلوں میں تصوف تو نہیں مگر معرفت و آگاہی کی جھلک ضرور بڑھ رہی ہے۔ جو انکے تغزل کو ایک جدا گانہ رنگ دے رہی ہے۔

جہاں تک اُسلوب بیان کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا احسان ایک ماہر فنکار کی طرح اپنی تصویروں کے خد و خال نمایاں کرتے ہیں اور انکے تاثر کو بڑی چابکدستی کے ساتھ گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ ترنم اُنکے کلام کی جان ہے۔ احسان کو لطیف و نادر تشبیہات و استعارات کے استعمال پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے اور بعض اچھوتی تشبیہات تو اُنھوں نے ایسی تلاش کی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ احسان کی زبان بڑی شگفتہ و پاکیزہ ہے۔ وہ سیدھے سادھے مگر دلکش اور مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے زبان میں سلاست و صفائی پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کے یہاں فارسیت کا غلبہ نہیں بلکہ اُنھوں نے فارسی تراکیب کا بڑا معتدل اور بر محل استعمال کر کے زبان کو بوجھل ہونے سے بچا لیا ہے۔

احسان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ''حدیث ادب'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور اسی سے ''مکتبۂ دانش'' کی بنیاد پڑی تھی۔ اس کے بعد اُن کے حسب ذیل مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

درد زندگی، نفیر فطرت، چراغاں، نوائے کارگر، آتش خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم، شیرازہ، مقامات اور گورستان

تقسیم ہند کے بعد بھی احسان لاہور ہی میں سکونت پذیر ہیں اور اپنے "مکتبہ دانش" کو چلا رہے ہیں۔

انتخاب کلام

تغزل

جتنی جس انسان کو توفیق خودی ہوتی گئی
زندگی آگاہ راز زندگی ہوتی گئی
عقل نے جب تک دکھائے راہ اُلفت میں چراغ
ہر نظر یکسر حجاب آگہی ہوتی گئی
اُن کا سایہ اک تجلی اُن کے نقش پا چراغ
وہ جدھر گزرے اُدھر ہی روشنی ہوتی گئی
علم بے وجدان کا پرچم ہوا جتنا بلند
آدمی سے آدمیت کی نفی ہوتی گئی
عشرت غم اعتماد زندگی کی بات ہے
جو تصور کر لیا دنیا وہی ہوتی گئی
جتنا سناٹا ہوا گہرا خزاں کی شام کا
آشنا راز چمن سے ہر کلی ہوتی گئی
کر دیا احسان دل کو دل غم و آلام نے
زندگی ناکام ہو کر کام کی ہوتی گئی

خموشی سے مذاق عشق پنہاں ہو نہیں سکتا
یہ شعلہ ہے چراغ زیر داماں ہو نہیں سکتا
در و دیوار دیوانوں کا رستہ چھوڑ دیتے ہیں
ہمیشہ کو جنوں مجبور زنداں ہو نہیں سکتا
حدود بندگی میں دل کو جو آسودگی دیدے
وہ سجدہ باعث تکمیل انساں ہو نہیں سکتا
میں دیوانہ بھلا، مجھ کو مرے صحرا میں پہونچادو!
کہ میں پابند آداب گلستاں ہو نہیں سکتا

اسی کا سلسلہ ہے میرا چاک جامۂ ہستی
گریباں تک فقط چاک گریباں ہو نہیں سکتا
یہ گستاخی تو ہے لیکن میں اس جلوے کا طالب ہوں
بقید رنگ و صورت جو نمایاں ہو نہیں سکتا

خودی کا جب کسی دل میں سرور ہوتا ہے
بہر نگاہ چراغان طور ہوتا ہے
بچا بچا کے نہ رکھ برق حسن سے دل کو
کہ اسکی زد پہ جو آ جائے طور ہوتا ہے
جنوں جنوں ہے تو ترک ادب کے کیا معنی
مذاق عشق، مذاق شعور ہوتا ہے
جو چل رہا ہے وہ منزل سے دور ہوتا ہے
ابھی نہیں ہے، ابھی اُن کی بارگاہ کہاں
یہ خد و خال کے پردے اٹھے تو کیا حاصل
حجاب خاص تو دراصل نور ہوتا ہے

علم و عرفاں کی جہاں تک روشنی دیکھا کئے
زندگی میں بندگی کو لازمی دیکھا کئے
کون سی بجلی کو رحم آیا کہ پابند قفس
آشیاں تک روشنی ہی روشنی دیکھا کئے
ہر قدم پر لغزش نو کا مقام آتا رہا
زندگی کو اک مسلسل بے خودی دیکھا کئے
مطمئن ہوگا کوئی احسان ہم تو عمر بھر
آگہی کو اک فریب آگہی دیکھا کئے

خدا کی دین ہے وہ عجز عشق بھی جس میں
غرور حسن کے انداز پائے جاتے ہیں
مری وفا پہ نہ جا حسن کی شکست کو دیکھ!
تری جفا کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
اگرچہ اب مجھے غم راس آ گیا لیکن
کسی کے لطف و کرم یاد آئے جاتے ہیں
وصال و ہجر کے پردے میں رات دن احسان
حیات و موت کے خاکے بنائے جاتے ہیں

وصل کا خواب کجا لذت دیدار کجا
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے
ضبط بھی صبر بھی امکان میں سب کچھ ہے مگر
پہلے کم بخت مرا دل تو مرا دل ہو جائے
آہ اُس عاشق ناشاد کا جینا اے دوست
جسکو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

اب تو ہر دھڑکن کسی کے پاؤں کی آواز ہے
دل میں یا رب کون مصروف خرام ناز ہے
حاصل صد گفتگو ہے عشق میں مہر سکوت
ہر نگاہ آرزو فریاد بے آواز ہے
چاند کیا شے ہے ترا دھندلا سا اک نقش قدم
چاندنی کیا ہے تری گرد خرام ناز ہے

جوانی نے اُسے اس خوش مذاقی سے سنوارا ہے
نہ عرض شوق کی جرائت نہ ضبط غم کا یارا ہے
سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کے سدھارا ہے
کہ مجھ کو عمر بھر اب رنج محرومی گوارا ہے
معطر سانس، چہرہ رشک گل، مستی بھری آنکھیں
جوانی ہے کہ اک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے
ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں ؟
وہی جور آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے
ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ
مجھے اے نا خدا کس گھاٹ تو نے لا اُتارا ہے

وہ عشق خاک عشق ہے وہ حسن خاک حسن ؟
جو قید ہو فسانۂ ہجر و وصال میں
ہو سوئے آسماں جو دعا کے لئے بلند
یہ پستیاں کہاں مرے دست سوال میں

بڑا کرم ہے کہ بخشا ہے اک دل بے تاب
مگر گھٹا کے جنوں کو نہ شرمسار کیا
کہیں فریب نظر ہے کہیں فریب خیال
نہیں طلسم دو عالم پہ اعتبار مجھے

مجھے چپ سمجھنے والے تجھے کیا خبر کہ گم ہے
ترے نغمۂ سحر میں مرا نالۂ شبانہ
تجھے کس طرح بتاؤں کہ ہے محترم کہاں تک
مرے عشق کی نظر میں ترے حسن کا زمانہ
یہ آڑی آڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

آرزو اک جرم ہے جسکی سزا ہے زندگی
زندگی بھر آرزوؤں کو پشیماں کیجئے
ذرے ذرے میں ہیں احساں اسکے جلوے آشکار
دیکھئے اور دیکھ کر تکمیل ایماں کیجئے

عشق کو تقلید سے آزاد کر دل سے گریہ آنکھ سے فریاد کر
اے خیالوں کے مکیں نظروں سے دور میری ویراں خلوتیں آباد کر
حسن کو دنیا کی آنکھوں سے نہ دیکھ اپنی اک طرز نظر ایجاد کر

مرے سجدوں کی یا رب تشنہ کامی کیوں نہیں جاتی
یہ کیا بے اعتنائی اپنے بندے سے خدا ہو کر
یہ پچھلی رات یہ خاموشیاں، یہ ڈوبتے تارے
نگاہ شوق بہکی پھر رہی ہے التجا ہو کر

عکس جاناں ہم، شہید جلوۂ جانانہ ہم
آشنا کے آشنا بیگانہ کے بیگانہ ہم
تجھ کو کیا معلوم گزری کس طرح فرقت کی رات،
کہہ پھرے اک اک ستارے سے ترا افسانہ ہم

تیرے ہر ذرے پہ تا روز قیامت سجدہ ریز
ہم رہینگے، اے زمین کوچۂ جانانہ ہم
منزل اُلفت میں ہیں احسان دونوں سدّ راہ
کھائیں کیوں آخر فریب کعبہ و بتخانہ ہم

منظومات

بیگانہ انجام

(ایک دوشیزہ کو دیکھ کر)

یہ دوشیزہ جو ہے محفوظ ہاتھوں سے زمانے کے
نہ کیوں کر مسکرائے، ہیں یہی دن مسکرانے کے
جبیں پر تمتاہٹ سرخ ڈورے چشم میگوں میں
نگاہیں سربسر ڈوبی ہوئی نازوں کے افسوں میں
لب لعلیں میں بیکل آرزوئیں گلفشانی کی
حریم ناز میں ضوریز قندیلیں جوانی کی
بھرے شانوں پہ زلف مشکبو کا دور دورہ ہے
سر بزم طرب جام و سبو کا دور دورہ ہے
فضا شاداب ہے اس حوروش کی بے نقابی سے
ادائیں اُٹھ رہی ہیں سو کے خواب ماھتابی سے
رخ رنگین پہ ہے دھکی ہوئی سرخی بہاروں کی
تبسم ہے کہ چکر میں ہے تابانی ستاروں کی
تکلم بربط داؤد کے جوہر دکھاتا ہے
سکوت دلنشیں تسکین کے دریا بہاتا ہے
اکیلی شرم ہے سو شوخیونکی پاسبانی میں
مسرت کھیلتی ہے اس کے دامان جوانی میں
گھنی زلفوں سے وا ہے باب میخانہ فضاؤں پر
مسیحائی فدا ہے اُسکی افسوں گر اداؤں پر
یہ کیا جانے ابھی دلدوز باتیں کیسی ہوتی ہیں
یہ کیا جانے ابھی مجروح راتیں کیسی ہوتی ہیں

ابھی یہ التماس دل کی مجبوری کو کیا جانے ؟
نشاط قرب کیا سمجھے ، غم دوری کو کیا جانے ؟
یہ کیا جانے ابھی سوز نہانی کس کو کہتے ھیں
یہ کیا جانے کہ اندوہ جوانی کس کو کہتے ھیں
ابھی واقف نہیں یہ عشق کی پرھول راھوں سے
ابھی ھے پاک اس کا دامن عصمت گناھوں سے
یہ کیا جانے کہ پردے میں خوشی کے غم بھی ھوتا ھے
رسیلی راگنی کی آوٹ میں ماتم بھی ھوتا ھے
یہ کیا جانے کہ آتی ھے خزاں چھپ کر بہاروں میں
بسر کرتے ھیں کانٹوں پر شگوفے لالہ زاروں میں
یہ کیا جانے کہ فریادوں کے مسکن ھیں ترنم میں
یہ کیا جانے کہ غم پلتا ھے آغوش تبسم میں
نشیلے زمزموں کے ساتھ ھی آتی ھیں آھیں بھی
یہ مقصد ھے کہ جو دن کو ھنسیں شب کو کراھیں بھی
جو انساں ھو گیا آگاہ انجام مسرت سے
قسم ھے تھرتھرا جاتا ھے وہ نام مسرت سے

جشن بے چارگی

ھے داغ دل اک شام سیہ پوش کا منظر تھا ظلمت خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں مچلنے ھی کو تھے رات کے گیسو انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو
یہ وقت اور اک دختر مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی قیامت تھی قیامت
نوشاہ کہ جو سر پہ تھا باندھے ھوئے سہرا بھرپور جوانی میں تھا اترا ھوا چہرہ
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کُرتا بھی پرانا سا تھا پگڑی بھی پرانی مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
نوشاہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی ھر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی
توقیر کے ' الفت کے ' شرافت کے مرقعے ایثار کے ' ایمان کے ' غیرت کے مرقعے
ھمراہ نفیری تھی نہ باجا تھا نہ تاشا آنکھوں میں تھا بے مہرئی عالم کا تماشا
مجمع تھا یہ جس خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وھاں عالم محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے اک درد ٹپکتا تھا عرقناک ہوا سے
اماں کی تھی بیٹی کی جدائی سے یہ حالت چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذبات محبت
تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا اٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا
وہ آپ کہیں اور تھا اور جان کہیں تھی سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی
افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے

لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو سمیٹے
گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب نہ پیشانی پہ ٹیکا اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا
انصاف زمانہ تھا یا تقدیر کا چکر ماں باپ کو آیا نہ تھا جوڑا بھی میسر
یوں کہنے کو دلہن تھی یہ مزدور کی دختر اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
تھرانے لگے ہونٹ ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جان پدر سُن اے وجہ سکوں ، لخت جگر ، نور نظر سُن
گرچہ مری نظروں میں ہے تاریک خدائی حاضر ہے مری عمر کی معصوم کمائی
کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر مجبور ہوں مجبور یہ تقدیر ہے تقدیر
اس سانولے چہرے میں تقدس کی ضیا ہے یہ پیکر عفت ہے یہ فانوس حیا ہے
اس کے لئے چکی بھی نئی چیز نہیں ہے بیٹی ہے مری دختر پرویز نہیں ہے
غربت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے خود داری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے
زنہار یہ زیور کی تمنا نہ کرے گی ایسا نہ کرے گی کبھی ایسا نہ کرے گی
شکوہ اسے تقدیر کا کرنا نہیں آتا ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا
ہے صبر کی خوگر اسے فاقوں کی ہے عادت ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اسکی بھی خوشی ہوگی تمہاری جو رضا ہو
تم اسکے لئے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر آ کے یہ بیٹی سے کہا نرم زباں سے بچی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے
امید ہے ہر بات کا احساس رہیگا ماں باپ کی عزت کا تجھے پاس رہیگا
اے جان پدر ! دیکھ وفادار ہی رہنا آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری ڈاڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جانکاہ نظارہ احسان نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا
تپنے لگی ہر سانس مری سوز نہاں سے اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے

اے خالق کونین ! یہ تو نے بھی سنا ہے		دنیا کا گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے
تو جن کا خدا آن کا ہو گردش میں ستارا		کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا
کس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ		مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ
احساس کبھی دل سے جدا ہو نہیں سکتا
انسان ہے انسان ، خدا ہو نہیں سکتا

طوفانی نغمہ

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی
جلو میں جسکے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں
یہ عالم تھا ہوائے شام کے لب پر بھی آہیں تھی
جو ریلا ہڑ بڑا کر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا
بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا
تھی وحشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی
سر ساحل سراسیمہ تھی پیراکوں کی پیراکی
درختوں کے قدم جمتے نہ تھے سیلاب کے آگے
فلک کی گردشیں بے کار تھیں گرداب کے آگے
عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں
کہ جیسے بُنتی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں
ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور دریڑوں کے
کنارا دھم سے گر کر پاؤں چھوتا تھا تھپیڑوں کے
ہر اک ریلے میں خونی موت کے قدمونکی آہٹ تھی
فضائے بحر میں سیل بلا کی سنسناہٹ تھی
جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا
کسانونکی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا
بہا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہ گزر پیدا
جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا
یقیں ہوتا تھا اکثر جوش طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائیگا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتہ تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک کام کرتی تھیں نگاہیں پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پراں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا ساماں خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشت کاری کا

گھُلا تھا ہر طرف رنگ شفق دریا کے پانی میں
کہ موجیں سرد انگارے اُگلتی تھیں روانی میں

نہ کشتی کا، نہ ساحل پر پتا تھا نا خداؤں کا
تسلط تھا فقط طوفاں کے خونی دیوتاؤں کا

بچارے بے گھرے ہالی موالی روتے جاتے تھے
غریبوں کے مکاں موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے

ہرن دلدل میں پھنس کر رہ گئے تھے خستہ جانی سے
نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے

فلک سے ہانپ کر بیمار سورج گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپر پہ اک اندھا پجاری بھی
جسے قسمت سے حاصل تھا کمال نغمہ باری بھی

بھجن گاتا ہوا آتا تھا اکتارے کی تانوں پر
ہوائیں لے کے تانیں جا رہی تھیں آسمانوں پر

بدن پر جو گیا بانا، لٹیں شانوں پہ آوارہ
ہر اک موج نفس معراج روحانی کا ہرکارہ

نوا میں سوز بھی، بشرے پہ نور حق پرستی بھی
تشکک بھی، خوشی بھی، جذب خود داری بھی مستی بھی

نہ بے صبری، نہ بے ہوشی، نہ بے چینی، نہ بے تابی
وہی مضراب کی ضربت وہی چہرے کی شادابی

ترانے تیرتے تھے جب بھری گنگا کے دھارے پر
تو اک گاتی ہوئی خنکی پہونچتی تھی کنارے پر

بھجن حل کر کے گردابوں میں گنگا پیتی جاتی تھی
جو لے چھڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی
ہوائیں راگ کی پاکیزہ لہروں میں نہاتی تھیں
اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں
اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا اک دم فضا بدلی
ہُوا کم ہانپتا طوفان، دیوانی ہوا بدلی
فسون کم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پر
وہ چھپر رفتہ رفتہ آلگا آخر کنارے پر
نکالا کھینچ کر دیہاتیوں نے اُس پجاری کو
کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غمگساری کو
حریم دل میں غیرت، شرم ہے آنکھوں کے پردوں میں
ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں
گئے گزرے بھی اچھے ہیں یہ شہری کجکلاہوں سے
برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں انکی نگاہوں سے
کہا میں نے پجاری کو یہ آخر ماجرا کیا تھا
کہ یہ کف دردھاں طوفاں اور تو نغمہ پیرا تھا
جواب اُس نے دیا مجھ کو کہ سُن اے شاعر دانا
فنا کو تو نے کیا سمجھا بقا کو تو نے کیا جانا؟
قضا آتی ہے جب دیتی نہیں اک پل بھی جینے کو
ڈبو دیتی ہے ظالم رہگزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک لمحہ کیوں دیں زندگانی کا
کریں کیوں فکر کر کے رنگ پھیکا شادمانی کا
جو موت آتی ہے آئے مرد کو مرنے کا غم کیسا؟
عمارت میں خوشی کی دفتر رنج و الم کیسا؟

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ



سردار موہن سنگھ نام ' دیوانہ تخلص مارچ ۱۸۹۹ء میں سید کسراں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد کا نام سردار شیر سنگھ تھا ۔ دیوانہ صاحب نے اپنی تعلیم کے ابتدائی و ثانوی مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم ۔ اے کیا پھر ''جدید اردو شاعری کے رجحانات'' اور ''تاریخ ادب پنجابی'' پر یکے بعد دیگرے دو مبسوط مقالے سپرد قلم کر کے کلکتہ یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی مؤقر ڈگریاں حاصل کیں ۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء سے آپ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں بحیثیت لکچرار مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ریڈر کے معزز عہدے تک پہونچے ۔ اورینٹل کالج میں تقریباً بیس سال تک پنجابی و انگریزی کی تدریس کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کے بعد جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آپ ہندوستان چلے گئے ۔ وہاں ابتدا میں کچھ عرصہ ڈیرہ دون کے کسی کالج میں ملازمت کی پھر امرتسر چلے آئے ۔ چنانچہ جب سے آپ امرتسر ہی میں مستقل طور پر اقامت گزیں اور پنجابی زبان کی درس و تدریس میں مشغول ہیں ۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ مختلف زبانوں کے علم و ادب سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فطری شاعر بھی ہیں ۔ اردو میں انہوں نے نظم و غزل دونوں پر طبع آزمائی کی ہے اور ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص طرز فکر اور مخصوص انداز بیان کے مالک ہیں ۔ آپ کی منظومات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب فرماتے ہیں ''ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اس عصر کے دوسرے شاعر ہیں جن کی نظمیں حفیظ کی طرح شباب کے مستانہ جذبات سے پر ہیں ۔ لیکن شعر میں حسن اور موسیقی پیدا کرنے کے لئے وہ جدید اسکول کی صنعت گری سے بہت کم کام لیتے ہیں ۔ ہندی بحروں سے بھی دیوانہ نے بہت کم کام لیا ہے ۔ اسی لئے ان کی شاعری قدیم عروضی پابندیوں اور جدید احساسات کا مرکب بن گئی ہے ۔ دیوانہ کی شاعری کا رنگ اختر شیرانی کی طرح عاشقانہ ہے ۔ وہ گویا نظم میں تغزل کا رنگ بھرتے ہیں''

دیوانہ صاحب کے ابتدائی مجموعہ کلام ''دوشیزہ'' کی اکثر منظومات صنفی جذبات پر مشتمل ہیں لیکن ان جذبات کو جس بے تکلفی ' حسن اور شائستگی کے ساتھ انہوں

نے سپرد قلم کیا ہے وہ لائق تحسین ہے - اس کے ماسوا وہ قوم ، وطن اور آزادی کی محبت سے بھی سرشار ہیں - چنانچہ مرحومہ مسز سروجنی نائیڈو اور غازی مصطفیٰ کمال پاشا پر اُنھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس خیال کی پوری پوری تائید کرتی ہیں - ان خصوصیات سے قطع نظر اُن کی منظومات کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ اُن میں ہندو روایات ، عقائد اور مشاہیر کی نہایت کامیاب مرقع کشی کی گئی ہے - ''مخمور بندرابن'' اور ''بھگوات گیتا'' بلاشبہ دیوانہ صاحب کی بہترین نظمیں ہیں -

آپ کے تغزل میں روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی مختلف تحریکات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے - جناب دیوانہ نے غنائی شاعری کے اسالیب کے ساتھ اپنے فلسفیانہ انداز فکر کا پیوند خوب لگایا ہے - اور وہ الفاظ اور بحروں کے انتخاب میں ترنم کا بھی حتی الوسع خیال رکھتے ہیں - اُردو شعرا نے ، ہر واقعہ کے لئے گل و بلبل ، بادہ و ساغر ، ناز و غمزہ ، غرض عاشقانہ اور رندانہ انداز کے بے شمار استعاروں سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جن کو وہ صاف الفاظ میں نہیں کہہ سکتے تھے - جناب دیوانہ شاعری کے اس گر پر اتنا قابو رکھتے ہیں کہ اپنے زمانے کے بہت سے ایسے امور ، جن پر صاف اظہار خیال ممکن نہ تھا ، اُنھیں استعاروں میں ادا کر دیا ہے اور نہایت خوبی سے کیا ہے - جہاں کہیں اُنھوں نے قدیم موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہاں بھی وہ عموماً اپنے ذاتی مشاہدے کا ایک نیا زاویۂ نظر پیش کرتے ہیں مگر اُن کے تغزل کا بیشتر حصہ دراصل عصری حالات ، معتقدات اور مسائل پر تنقید ہے اور اس سلسلہ میں اُن کی فکر نے بعض نہایت نفیس پیرائے نکالے ہیں - تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا مجموعہ کلام ' نئی دنیا'' جس میں کچھ پابند نظمیں ، کچھ آزاد منظومات اور کچھ مفرد اشعار جمع کر دئے گئے ہیں ، اُن کی شاعری کا ایک ایسا نمونہ ہے جسے سچ مچ اُن کے نام سے منسوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - اس مجموعہ کا سارا کلام ماہ اکتوبر ۱۹۴۴ء کے چند دن کی فکر کا نتیجہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُس میں فکر و فن کی بہت سی اغلاط پائی جاتی ہیں - بایں ہمہ اُن کے ''دوشیزہ'' اور ''کیفیات'' جیسے مجموعوں کے کلام میں ایسی جان پائی جاتی ہے کہ اُن کی شاعری کو ہم بھلا نہیں سکتے -

اس وقت تک نظم میں ان کی کتابیں ترانہ قدرت ، دوشیزہ ، کیفیات ، نئی دنیا اور نغمہ دیدار الٰہی اور نثر میں حالی اور چٹکیاں چھپ چکی ہیں - ان کے علاوہ آپ نے ''اردو ادب'' پر ایک مختصر مگر جامع کتاب انگریزی زبان میں بھی لکھی ہے -

انتخاب کلام

دوشیزہ

غنچہ ہے ناشگفتہ ، تو لب ہے نا کشودہ
ناگفتہ راز تو ہے ، تو وصف نا ستودہ

خوابیدہ نغمے ہیں کیا خاموشیوں میں تیری
مستور جلوے ہیں کیا گل پوشیوں میں تیری

شرم و حیا میں تیری ناز و ادا ہے کیا کیا
کیا کیا بلائے جاں ہے، جان بلا ہے کیا کیا

نیچی نگاہیں تیری ڈھاتی ہیں آفتیں کیا
چاند اور کنول نے بخشیں تجھ کو لطافتیں کیا

فطرت کے ساز سے یہ دمسازیاں غضب ہیں
ہمچشمیاں غضب ہیں ہمرازیاں غضب ہیں

آئینہ دار حسن فطرت ہے حسن تیرا
گنجینۂ مراد آلفت ہے حسن تیرا

ہر عضو تیرا روشن شمع کمال خوبی
رشک قد صنوبر تیرا نہال خوبی

سانچے میں نور کے وہ تیرے بدن کا ڈھلنا
آغوش نغمہ ہائے فردوس میں وہ پلنا

یکسر نیاز ہے تو، ہے ناز سر بسر تو
اپنی کرامتوں سے کیسی ہے بے خبر تو

شرما رہی ہے گل کو ساڑی تری گلابی
سینے سے تیرے نادم مہتاب ہے سہابی

چاندی کی چوڑیاں یہ غیرت دہ قمر ہیں
یا حلقہ ہائے گوش دوشیزۂ سحر ہیں

برگ و گل و ثمر ہیں کیا کیا نثار تجھ پر
قربان ہو رہی ہے کیا کیا بہار تجھ پر

غمگینیاں یہ تیری یہ اضطراب تیرا
سر تا سر آرزو و حسرت شباب تیرا

اے غنچہ کس صبا کا ہے انتظار تجھ کو
کس لب کی تشنگی ہے لیل و نہار تجھ کو

کس رازداں سے تجھ کو ملنے کی آرزو ہے
کس ترجماں کی تجھ کو ہرلحظہ جستجو ہے

دل میں ترے طلب ہے کس زخمۂ وفا کی
ہر دم ہے منتظر تو کس طُور آشنا کی

تیرے لئے ھے کس کا ہر ہر نفس بہاراں
ہر ہر نگاہ کس کی ھے رشک برق خنداں
نخل شباب کو جو تیرے ثمر دلادے
ہر عضو کو جو تیرے مینائے مے بنا دے
تجھ نا تمام کو جو آ کر تمام کر دے
تجھ تشنہ کام کو جو مدھوش جام کر دے
راز نہان خلقت تجھ کو ترا بنا دے
ہستی کو اپنی تیری ہستی میں جو مٹا دے
اے کان حسن و خوبی دوشیزۂ حیا کوش
نیل مرام کی ہے میری دعائے پر جوش

بھگوت گیتا

سن اے دیدہ و دل خستۂ پیکار حیات
چاہئے فتح اگر رزم مکانی میں تجھے
حسن ایماں کی جو تو جلوۂ نمائی چاھے
صدق دل سے جو طلبگار ھے راحت کا تو
روح تیری ھے اگر حسن ازل کی شیدا
صفت و ذات کے اظہار' خفا کے اسرار
آئینہ خانۂ امکاں کی وہ خوش نیرنگی
کیا ترے دل میں ھے بیتابئی دیدار جمال
کیا تو ھے صبح و مسا تشنۂ آب ظلمات
پردۂ حائل جاناں جو اٹھانا چاھے

بانسری والے کا تو نغمۂ اسرار حیات
چاہئے عیش اگر بزم جہانی میں تجھے
عشق جاناں کی جو تو عقدہ کشائی چاھے
راز جویا ھے اگر حسرت و حیرت کا تو
قلب تیرا ھے اگر علم و عمل کا جویا
نور کے نار کے ہستی کے قضا کے اسرار
نغمۂ فطرت و انسان کی وہ ہم آہنگی
کیا تری عقل کو ھے جستجوئے کنہ کمال
کاٹتا ھے تجھے کیا سلسلۂ مرگ و حیات
شرر جلوہ سے پھر طور جلانا چاھے

بانسری والے کا تو نغمۂ عرفاں سن لے
مژدۂ وصل تو اے کشتۂ ہجراں سن لے

دردِ مسلسل

جو حکمت مولیٰ نے کیا بندے کو تفویض
اُس درد میں پوشیدہ ھیں درمان ہزاروں

اس درد کے کاشانۂ تاریک میں یعنی
اس دل میں ہیں پر نور گلستان ہزاروں

اس درد کی توفیق سے پہنچا ہوں میں اکثر
اُس سطح پہ آرام و مصیبت ہیں جہاں ایک
ہم رشتہ نظر آتی ہیں عالم کی کل آشیا
ہیں نغمۂ و نور ایک وہاں وقت و مکاں ایک

ہر طالبِ حرّیت و شیدائے محبت
ہے درد کی افراط کا شدت کا طلبگار
ہاتھ اپنے کلیجے پہ ذرا رکھ کے تو کہئے
ہے درد کی اہمیتوں سے واقعی انکار

دنیا کے لئے درد کی یہ قدر یہ قیمت
اللہ کے لئے درد سے کیا کچھ نہ ملے گا
شاہد ہے میرا تجربہ اس کہنہ خدا پر
دل کا کنول اس درد مسلسل سے کِھلے گا

اس درد کی ہیں دو ہی شرائط ' میں رہوں گا
اُس دل میں جو ہے ضبط کا اور صبر کا ڈیرا
کر سکتا ہے جو دست کشی دیکھ کے جلوے
تسلیم کی آغوش میں ہے جس کا بسیرا

ایشیا اور یورپ

ایشیا میں یورپی ہنگامے برپا ہو چلے
آئی تفریق جماعت ' آئی تمئیز وطن
ہر طرف جاری ہوئے آئین نو احکام نو
محو ہو جانے کو ہیں اپنی روایات کہن

حسن کی عریانیوں سے اب ہوئی دلبستگی
نغمہ راحت سوز ہے اور بادہ ہے توبہ شکن
بے توازن بے سکوں علم و ہنر قول و عمل
اپنے آقا کا نہیں بندے میں اب کوئی چلن
رنگ و بو سے مدعا حیوانیت کا اشتعال
واقعیت ہو حقیقت پر نہ کیوں کر طعنہ زن
خون انسانی کی ارزانی ہے بے حد ہر طرف
ضبط اور سنجیدگی کو چھوڑ بیٹھے مرد و زن
عشرت فانی کا مضموں شاعروں کو ہے پسند
ہیں ملمع ساز و قصہ باف اب ارباب فن
رہ گیا اک میں طلبگار دوام معرفت
بک چکے آسائشوں کے ہاتھ ابنائے وطن

دو شعر

مرے اللہ کو ہے اک سجدہ کافی ، دور سے وہ بھی
در انساں پہ سو سو بار دستک دینا پڑتی ہے
مری تدبیر تیغ و تیر و بم کب کام آتی ہے
رضائے حق برنگ خوبئی تقدیر لڑتی ہے

تغزل

بدل لی نظر دوستوں نے تو جانا ہوا ہے کسی کا نہ ہوگا زمانہ
میں سب جانتا ہو جو تقدیر میں ہے فضول آزمودہ کا ہے آزمانا !

مزہ یہ تو دیکھو کہ خود بے وفا ہے مگر ہم سے دنیا وفا چاہتی ہے

بہت سے دوست دشمن سے زیادہ رنج دیتے ہیں
بگڑتے زخم کو دیکھا ہے اکثر ہم نے مرہم سے

دیکھ لو مہربانیاں اپنی مجھ ستمکش کے حال ابتر میں

آشیاں کے خار و خس کا غم نہیں لیکن اپنا تھا بس اتنی بات ہے
کامیابی ایسی کچھ مشکل نہ تھی کیوں اسے چاہا نہ یہ اک بات ہے

جس نے دیکھا ہے تری چشم خمار آلود کو جمع خاطر سے مئے رنگین پئے وہ کس طرح

تمنائے حیات جاوداں کو لئے پھرتا ہوں دنیائے فنا میں

عقل اور آگے جتنا بڑھتی ہے دور تر دیکھتی ہے منزل کو
جب لگائی تھی اب بجھائیں آپ کوئی سمجھائے حضرت دل کو

ملتے بھی ہیں کبھی تو وہ ملتے ہیں اسطرح
گویا کبھی میں اُن سے کہیں بھی ملا نہیں

یہ کام فصل گل میں تو کرنا نہ تھا ہمیں کیا وقتِ بد میں ہائے غضب ترک مے ہوا

ترک ہم نے نہ بت پرستی کی ٹوٹتا اس سے حوصلہ دل کا
جھیلنا اس میں جو پڑا ، جھیلا کر تو ڈالا مگر کہا دل کا
تیرے کوچے میں ہم ذلیل ہوئے بارے ارماں نکل گیا دل کا

اللہ سے خیر مانگتے ہیں آشیانے کی گو ہم قفس سے جائینگے کیا آشیانے میں

اب خدا پر ہے فیصلہ اپنا تم کو شک ہے مری محبت پر

میں پہنچ جاتا کسی دن کعبے تک لیکن آدھی راہ پر بت خانہ تھا
سن کے اُس کا ہوشمندانہ کلام
پوچھتے ہیں سب کہ یہ دیوانہ تھا

تھا کبھی دیوانہ سے کچھ ارتباط　　تم کو شاید وہ زمانہ یاد ہو

اپنی نظر کی وسعت دیکھی　　اور کسی نے یاں کیا دیکھا

فرصت ملی ہے معرفت عشق کے لئے　　ہے حاصل حیات تماشا کہیں جسے

سنتے ہیں اک غلام پہ محمود مر مٹا　　کچھ بت شکن نے سیکھ لیا بت پرست سے

پھر بھی دیتے ہیں اک نظر پہ تمہیں　　سو مصیبت سے دل کو پالا ہے
نکلو دل سے ہمارے جب جانیں　　بزم سے تو ہمیں نکالا ہے

نہیں دیکھتے خلق میں جو خدا کو　　خدا جانے وہ لوگ کیا دیکھتے ہیں

دل پر نہ اختیار نہ دلبر پر اختیار　　ہم ناصحوں کی پند و نصیحت کو کیا کریں
دو دن کی بات ہو تو خوشی سے گزار دیں　　لیکن ہم آئے دن کی مصیبت کو کیا کریں

اک تمہیں خوش نہ کر سکے ورنہ　　کیا ہمیں بات کر نہیں آتی

تجھے دیکھتے ہیں جو اہل نظر ہیں　　وہ کب تیرا لطف و ستم دیکھتے ہیں

جو لایا ہے آغوش میں لا مکاں کو　　تصور کو اپنے ہزار آفریں ہے

محبت چاہتی ہے اور بھی کچھ　　یہ مانا تو ہمارے روبرو ہے

نہ وہ سمجھے مرے دل کو نہ میں سمجھا مزاج اُن کا
محبت میں نیاز و ناز دونوں ہی پریشاں ہیں

اللہ رے جوانی کی وہ دو چار بہاریں
جب شہرۂ آفاق تھا دیوانہ پن اپنا

کفر و دیں کے معاملے دیکھے — اب طبیعت ادھر نہیں آتی
درمیاں سے اب اٹھ گیا پردہ — کوئی ہستی نظر نہیں آتی

شاهد پرست هی نہیں دیوانۂ شباب — رهن سرور و شعر وہ مے خوار بھی تو هے
دنیا پرست هی نہیں مصروف کشت و خوں — جنگ و جدل میں شرکت دیندار بھی تو هے

دنیا کہے کہ پیتا هے بے صرفه یه عزیز — کسب کمال اتنا تو اے بادہ نوش کر

آتا هے تو آتا هے نظر اپنے کرم سے — دیدار کو هے کوشش ارباب نظر هیچ

هر چند یہاں خار و خس و زاغ و زغن هیں — اے همنفسو پھر بھی هے اپنا چمن اپنا

جب کہتا هوں میں آپ رقیبوں سے نه ملئے
فرماتے هیں هنس کر، ارے یه تنگ دلی چھوڑ

کچھ لطف اٹھا سکا نه حریف اپنی فتح سے
دیکھا جو هم حزیں نہیں اپنی شکست سے

تجھ کو خدا نے دی تھی بہار آفریں نظر
تو نے نظر کو بیچ دیا برگ و گل کے هاتھ

عشق میں هے شگفتگئی حیات — عشق سے گرچه کچھ نه حاصل هو

کہتا هے هم سے وقت ملاقات کوئی شوخ — بے باک هو نه اتنی تمنا سے تم کہو

بگڑے کسی کا کام نه بننے سے اپنا کام — اس ڈر سے اپنا خون تمنا کرینگے هم

عروج فرد منحصر ہے قوم کے عروج پر ہیں اپنی کامیابیاں وطن کی کامرانیاں

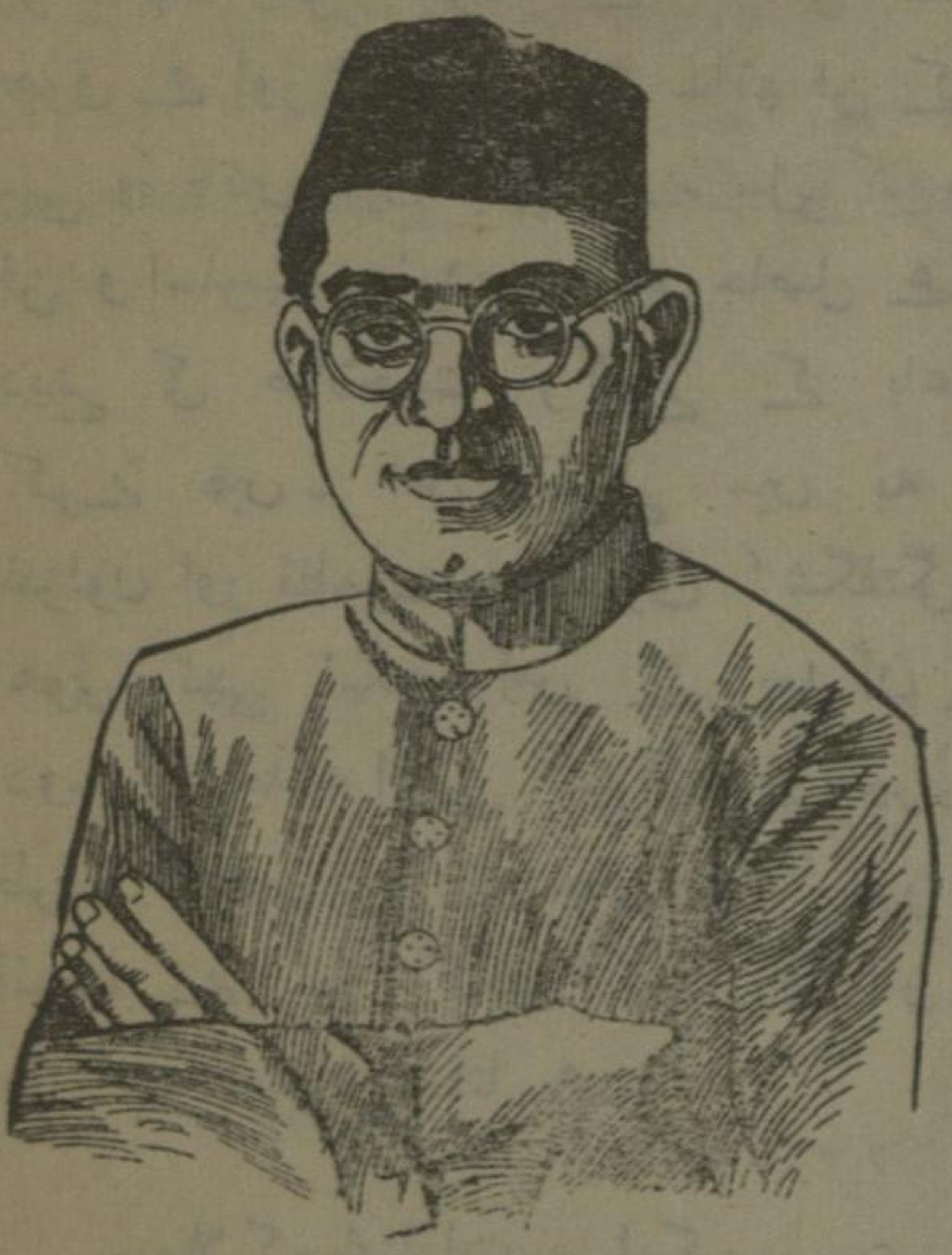
اے کعبہ و کلیسا بالفعل مل کے بیٹھو جھگڑے کو اپنے چھوڑو کل کیلئے خدا پر

ہو قوم میں کس طرح صلاحیتِ نیکی افراد میں جب خوبئ کردار نہیں ہے

پہلے تو دنیا تھی درویش و تو نگر میں بٹی اب سنا یکرنگئ انساں کے ساماں ہو گئے

بس حسرت کی شاگردی ہے کیا اپنی اُستادی

آنند نرائن مُلّا



پنڈت آنند نرائن نام مُلّا تخلص اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے آبائی مکان محلہ رانی کڑہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے - خاندانی لحاظ سے ملا صاحب کا تعلق کشمیری پنڈتوں کی اس شاخ سے ہے جس کی داغ بیل اُن کے دادا پنڈت کالی سہائے ملا آنجہانی کے لکھنؤ میں مستقلاً بود و باش اختیار کرنے سے پڑی - ملا صاحب کے والد پنڈت جگت نرائن ملا لکھنؤ کے مقتدر و معروف لوگوں میں سے تھے - ملا صاحب کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی - آپ نے انٹرنس جوبلی گورنمنٹ اسکول سے پاس کیا - پھر کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم - اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل - ایل - بی کے امتحانات پاس کئے - ۱۹۲۴ء میں وہ آئی - سی - ایس کے امتحان میں بھی شریک ہوئے لیکن اس میں ناکامیاب ہونے کے بعد اُنھوں نے وکالت شروع کردی، جسے اُن کا آبائی پیشہ کہنا چاہئے - ۱۹۲۶ء سے وہ برابر لکھنؤ میں پریکٹس کر رہے ہیں -

اسکول و کالج کی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملا صاحب نے اُردو و فارسی کی تعلیم گھر پر مولانا محمد برکت‌اللہ صاحب رضا مرحوم فرنگی محلی سے حاصل کی اور یہی وہ زمانہ ہے جب اُنھوں نے اپنے فطری ذوق کے ماتحت انگریزی میں نظم گوئی شروع کی اور انیس، غالب اور اقبال کے اشعار کے ترجمے بھی کئے - لیکن ۱۹۲۷ میں پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اُن کی اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور اُنھوں نے اُردو میں شعر کہنے شروع کر دئے - تاہم اس فن لطیف میں اُنھیں کسی سے تلمذ حاصل نہیں اور نہ اُنھوں نے اپنے کلام پر باقاعدہ اصلاح لی ہے بلکہ اپنی انفرادیت و ذوق سلیم ہی کو سہارا بنایا ہے - بظاہر اُن کی یہی انفرادیت پسندی اور انگریزی میں ایم - اے کرنے کی وجہ سے اُنھیں جو عالمی ادب کے میلانات و رجحانات سے واقفیت حاصل ہوئی ہے اسی کی بدولت اُن کی شاعری تمام صالح ادبی رجحانات کی حامل ہے - اور وہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی لکھنؤ کے مخصوص رنگ سخن یا کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے - لے دے کے چکبست کا کچھ رنگ ہے ورنہ وہ غالب و اقبال سے زیادہ متاثر ہیں -

آنند نرائن ملا عصر حاضر کے اُن شعرا میں سے ہیں جو زندگی کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے ہیں اور مکانکی طور پر بنے بنائے راستہ پر چل کھڑے ہونے کے بجائے ذاتی

جذبات ، احساسات اور تجربات کو فن کے لوازم کے ساتھ شعر میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہر بات سوچی سمجھی ہوئی ہوتی ہے ، ہر خیال فکر کی کسوٹی پر کسا ہوا ہوتا ہے ، ہر تصور میں خلوص کی گرمی اور احساس کی سچائی شامل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فن کے مطالبات پر بھی اُن کی نگاہ ہوتی ہے۔ مختصراً یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے مل کر ملا کی شاعری کو رنگین اور ٹھوس بنا دیا ہے۔ اُنھیں فن و اسلوب دونوں پر قابو حاصل ہے اور وہ خیالات کو حسن کارانہ طور پر تربیت دینے کی صلاحیت رکھنے کے باعث نظم و غزل دونوں میں اپنے جذبات ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات کہنا بے محل نہ ہوگی کہ ۱۹۳۵ء تک ملا کی غزلوں اور نظموں میں تازگی ، شگفتگی اور لطافت کے علاوہ کوئی انفرادیت نہیں پیدا ہوئی تھی لیکن اُس کے بعد اُن کے فکر و فن میں بقول آل احمد سرور صاحب ''انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کی طرف نگاہیں فوراً اُٹھ جاتی ہیں'' اور اس میں شک نہیں کہ پچھلے اٹھارہ اُنیس سال میں اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے اُس میں رفعت تخیل ، بلند نصیب‌العین اور دل نشینی کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔

ملا کی غزلیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ قدیم لکھنویت اب لکھنؤ میں بھی ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُن کی غزلوں میں روائتی غزل کی آن بان کے ساتھ ذاتی تجربات و جدید نفسیات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے خیالات کی پختگی اور ندرت بیان سے اپنے کلام کو فرسودگی کی زد سے بچا لیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اُن کی غزلوں میں بہت سے روکھے پھیکے شعر بھی ملیں گے چونکہ اُن کے عشق میں وہ چمک دمک اور سپردگی نہیں ہے جو مثال کے طور پر آپ کو جگر کے یہاں نظر آتی ہے لیکن اُن کا عشق ذرا مہذب اور سنبھلا ہوا ضرور ہے بنا بریں اُن کے تغزل کی صداقت و دل گدازی پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔

ملا کی پہلی نظم ''پرستار حسن'' ہے جو ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی لیکن اس پہلی نظم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی رو میں حقیقت کے تصور کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ اور یہ خوبی اُن کی تمام نظموں کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ وطن پرستی ، سیاسی جد و جہد ، قومی تحریک ، آزادی کی خلش ، انسان دوستی وغیرہ کا جذبہ بھی اُن کی نظموں سے آشکار ہوتا ہے اور اس ضمن میں اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی منظومات میں تغزل کا رنگ بڑی کامیابی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ملا کی منظومات کی یہ ایک خصوصیت ایسی ہے جو اس انداز میں دوسرے نظم گو شعرا کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے۔ اُن کی طویل نظموں میں ''تم مجھے بھول جاؤ گے'' ''سماج کا شکار'' ''دو شیزہ کا راز'' ''ٹھنڈی کافی'' '' آخری سلام'' وغیرہ میں شعریت و حقیقت کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ پڑھنے والا سچ مچ جھوم اُٹھتا ہے۔ ان کے علاوہ اُن کی ایسی نظمیں جن میں سیاسی عنصر کے ساتھ فکر کی جولانیاں بھی کارفرما ہیں اُن میں شعریت کے ساتھ بڑا وزن اور گہرائی بھی ہے مثال کے طور پر ''میری دنیا'' ''لال قلعہ'' ''جہاں میں ہوں'' ''صبح آزادی'' ''سروجنی نائیڈو'' وغیرہ اُن کی ایسی منظومات ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

الغرض حضرت ملا کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی و ہمہ گیری کی ایک زندہ و تابندہ تصویر ہے اور اُن کا کلام ہمارے قدیم و جدید ادب کے تمام صالح میلانات کا آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے دل سوزی ، جگر کاوی اور پاکیزگئی خیال کا بڑا اچھا مرقع ہے ۔ اُن کے کلام کا مجموعہ ''جوئے شیر'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں طبع ہو کر نہ صرف ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے بلکہ ملک کے مقتدر نقادوں نے اس کی دل کھول کر تعریف بھی کی ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

تاب جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا
چشم موسیٰ بے کے عشق تشنہ کام آیا تو کیا
خون دل ضائع نہ ہو مجھ کو بس اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

آئینۂ رنگین جگر کچھ بھی نہیں کیا
کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا
نا گفتہ اشارے بھی ہیں جن کے مجھے احکام
اُن پر مرے نالوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا
مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

مہر وہ ہے خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار
اُونچی اُونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

اظہار درد دل کا تھا اک نام شاعری
یاران بے خبر نے اُسے فن بنا دیا

پھر ہوس نظارہ کر بزم جمال یار میں
پہلے نظر کو تاب دے آتش انتظار میں
ایک جگر کا سوز و ساز کشمکش اُمید و یاس
ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں
سختئ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دئے دامن کوہسار میں

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کی
خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور خزاں میں نہیں

میرے ہر آنسو میں خوشبو میرے ہر نالہ میں راگ
اب تو ہر ہر سانس میں شامل تمہیں پاتا ہوں میں
اب تمنا بے صدا ہے اب نگاہیں بے پیام
زندگی اک فرض ہے جیتا چلا جاتا ہوں میں

خروش بزم میں بھی ساز دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو
کبھی تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹانا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

میرے جگر کی تاب دیکھ، رخ کی شکستگی نہ دیکھ
فطرت عاشقی سمجھ، قسمت عاشقی نہ دیکھ
تجھ پہ عیاں ہے راز دل جان کے بے خبر نہ بن
معنئ خامشی سمجھ، صورت خامشی نہ دیکھ

وہ دیکھتے تو ہیں مجھ کو مگر چرا کے نظر
حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی
کسی کے لطف بے پایاں نے کچھ یوں سُوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی
یہ بزم دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحن میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی
نظر جھوٹی ، شباب اندھا ، وہ حسن اک نقش فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی
نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی

اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کئے کٹ سکی نہ رات کبھی
بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رکی تھی تری چشم التفات کبھی

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی
جسے جہاں میں محبت کی زندگی نہ ملی
یہ کہہ کے آخر شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی
لبوں پہ پھیل گئی آ کے موج غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی
ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی
فلک کے تاروں سے کیا دور ہو گی ظلمت شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی
وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے "ملاّ"
کسی نگاہ کے سائے کی چاندنی نہ ملی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمہیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویر خواب آئی ؟
جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے
مرے حصہ میں کیوں میری نگاہ انتخاب آئی !
کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جان تسکیں تھی
یہی ذروں میں کیا آئی کہ موج اضطراب آئی

شیخ ! میں اور ترک عصیاں وہ بھی جنت کے لئے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنت نہ تھی

جفا صیاد کی اہل وفا نے رائیگاں کر دی
قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کر دی
یہ دل کیا ہے کسی کو امتحان ظرف لینا تھا
تن خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی
بھرم حسن حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی
تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی
اسیر آنکھیں کہاں سے سیر گلشن کے لئے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرف تلاش آشیاں کر دی

دل بجھا شمع کائنات گئی زندگی کی آجالی رات گئی

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائیگاں کبھی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مجھ کو غم انساں کی حقیقت نظر آئی
دنیا ابھی محتاج محبت نظر آئی
تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمہارا
مجھ کو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

مائل بہ ستم چرخ، زمیں بر سر کیں ہے
آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے
دل مرکز احساس ہے ایذائے جہاں کا
لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد نہیں ہے
صبر آنے کو آجائے مجھے حسرت دل پر
لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے

میکشوں نے پی کے توڑے جام سے ہائے وہ ساغر جو رکھّے رہ گئے

سر محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بُکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگ درا سے پہلے
اڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیم خطا سے پہلے
راز مے نوشئی ''ملا'' ہوا افشا ورنہ
کیا وہ بد مست نہ تھا لغزش پا سے پہلے

ذرہ ذرہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل
پہلے تقصیر نے پھر ذوق جبیں سائی نے

پیہم رہ طلب میں مشکل کا سامنا ہے
ہر گام پر فریب منزل کا سامنا ہے
ہشیار حسن ! حیرت ارمان بن چلی ہے
پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

ظالم مری حیات کا دور شباب ہے
ہاں ہاں تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے

قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ نظر جتنی ہے صرف آشیاں ہے
گل خنداں ابھی غافل ہے شاید وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

ابھی شباب ہے کرلوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمر رواں ملے نہ ملے

مری باتوں پہ دنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے
مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے
ابھی سن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو
کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے

خالی ہے مرا ساغر تو رہے ساقی کو اشارہ کون کرے
خود داریٔ سائل بھی تو ہے کچھ ہر بار تقاضا کون کرے
دنیائے محبت بھی ہے عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں
لیکن یہ تکلف ہے حائل پہلا وہ اشارا کون کرے
جب دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کانٹا سی چبھتی تھی
اب ایک فسردہ دل لے کر گلشن کی تمنا کون کرے

بسنے دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیر چمن
جب تک کہ نشیمن اجڑا ہے پھولوں کا نظارا کون کرے

جس کے خیال میں ہوں گم اس کو بھی کچھ خیال ہے
میرے لئے یہی سوال سب سے بڑا سوال ہے

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں، ہم نہ تمہیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی یاد تمہیں نہ آ سکے
زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے
قفل سا کچھ زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی
ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے
اپنے ہی شوق کی خطا اپنی ہی آنکھ کا قصور
وہ تو اٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اٹھا سکے

مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے
یہ تو ٹھیک ہے کہ تری جفا بھی ہے اک عطا مرے واسطے
مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

میں آج ہی اسے کیوں صرف دل نہ کر ڈالوں
یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے
متاع شوق کو اشکوں کے ساتھ بھیج بھی دوں
پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

اپنے جی میں یہ کہ دنیا چھوڑ دیں — اور دنیا کو ہمیں سے کام ہے
جل چکے چشم اعزہ میں چراغ — سو بھی جا ملّا کہ وقت شام ہے

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے
سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

سو کھنے پائے نہ دل میں دیکھ خوئے آرزو
سیکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

کھنچی آتی ہیں اس ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذب بے اماں معلوم ہوتی ہے

چشم خوں بار میں باقی نہ رہا کیا کوئی اشک
آج بیمار محبت کو ہنسی آئی ہے

شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جاں آئی ہے

ساقیا جب مے ہر اک میکش کی قسمت میں نہیں
سب کو اس محفل میں پیمانے عطا کیوں ہو گئے

شب غم میں بھی اے تصور دوست زندگی کا مزا دیا تو نے

جمال حسن میں تھا اک جلال عفت بھی
گناہگار خیال گناہ کر نہ سکے

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاج دل نہ بن جائے

منظومات

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوش اضطراب
آرزؤوں میں آئیگا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈھ ہی لے گی نگاہ انتخاب
زیست ہے زیست ، دل ہے دل ، اور شباب پھر شباب
عہد وفا ہے ایک خواب
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
جس کی تجلیوں سے تھی بزم آمید حشر خیز
جس کے تبسموں سے تھا ساز حیات نغمہ ریز
جسکے نفس نفس سے تھی محفل دوش مشک بیز
رکھ کے کبھو جگر پہ ہاتھ آج بھی ہے وہی عزیز
وقت ہے کچھ عجیب چیز
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
رسم جہاں ہے انقلاب ، دور کا نام کائنات
دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں بھی دے حیات
آرزؤں کی دل میں ہے ایک سجی ہوئی برات
ایک نگاہ اک آمنگ ، ایک آمنگ ایک رات
ہستئی عشق بے ثبات
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں
تیر نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی مرا نہیں
بن کے کھرنڈ کون سا داغ جگر آڑا نہیں
سنگ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں آگا نہیں
تم کوئی لا دوا نہیں
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگارخانۂ شوق کو تم سجاؤ گے
پھر کسی بت کے واسطے فرش نظر بچھاؤ گے
آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے
نام مرا اگر کوئی لے گا تو مسکراؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
تم مجھے بھول جاؤ گے

جہاں میں ہوں

وہی حرص و ہوس کا تنگ میداں ہے جہاں میں ہوں
وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

تمنا قید، ہمت پا بجولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیر امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اٹھے
ابھی تو اشک بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سرخ ہو جائے
ابھی پانی کا ایسا خون دھقاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدم خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں

کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی
مگر جنس خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں

ہوائے علم شمعیں روح کی گل کرتی جاتی ہیں
خرد کے ہاتھ میں دل کا گریباں ہے جہاں میں ہوں

اُفق پر ہوں تو ہوں دھندے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک خواب ارماں ہے جہاں میں ہوں

غرض مندی کی پوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں
محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

ابھی رُوئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن کوئی چنگاری نہ دنیا کو جلا ڈالے
جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں

غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اک آواز بے نغمہ
بہار باغ ہمرنگ بیاباں ہے جہاں میں ہوں
نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں
فقط ہلکی سی سطح آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اک ذکر طوفاں ہے جہاں میں ہوں
خدا وہ دن بھی لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوز پنہاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں
بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی ملاّ
وہی دنیائے برق و باد و باراں ہے جہاں میں ہوں

میری دنیا

(۱)

بزم جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکوں گا
افسردہ دل ہوں زیب محفل نہ بن سکوں گا
اک عارضی نمائش روح نظام تیری
رنگینئی تصنع جان کلام تیری
طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنم کدوں میں
دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے
لاشوں پہ ہے بنائے ایوان کامیابی
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی
سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں
انساں اتر رہا ہے رسم درندگی پر
تہذیب آ گئی ہے حد برہنگی پر

کیا جہد زندگی میں طبع بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

(۲)

اک بار دور گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ تیر ستم نہ ڈھونڈے
ایوان شادمانی بنیاد غم نہ ڈھونڈے

اک آرزوئے باطل فکر سکوں نہ ٹھہرے
اُلفت فقط مذاق اہل جنوں نہ ٹھہرے
تصویر نا مرادی نقش جبیں نہ نکلے
راحت دل حزیں کا خواب حسیں نہ نکلے

کھوٹے تکلفوں میں اُلجھی نہ گفتگو ہو
دل کی کھری زباں میں اظہار آرزو ہو
انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانئی بشر کا تیور پلٹ چکا ہو

برف خرد میں جل کر دل سُن نہ ہو گئے ہوں
آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں
غیروں کے درد پر بھی دل میں ذرا کسک ہو
خون سفید میں کچھ سرخی کی بھی جھلک ہو

انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں
ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیر آسماں ہے
میرے خیال بتلا دینا مری کہاں ہے

میرا جی

میرا جی کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا مگر وہ اپنے ادبی نام و تخلص میراجی سے ھی ادبی حلقوں میں متعارف و مشہور ہوئے ۔ اُن کا سال ولادت ۱۹۱۲ء ھے میراجی کے والد منشی مہتاب الدین صاحب ریلوے انجینیر تھے اور اس ملازمت کی بدولت اُنھیں اکثر مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر رہنے کا اتفاق ھوتا تھا ۔ منشی صاحب کے کسی ایک جگہ مستقل قیام نہ ھونے کی وجہ سے میرا جی کی تعلیم و تربیت بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوئی ۔ غالباً سات سال کی عمر میں قصبہ مالول (گجرات کاٹھیاواڑ) کے اسکول میں داخل کئے گئے ۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ اُنھیں بوستان (بلوچستان) اور پھر وہاں سے سکھر (سندھ) جانا پڑا ۔ یہاں میرا جی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے لیکن اُن کے بھائی کامی صاحب کا کہنا ھے کہ اُنھوں نے اس زمانہ میں اپنے بڑھتے ہوئے ذوق کتب بینی کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہنا شروع کر دی تھیں اور اپنے اس ابتدائی دور شاعری میں ساھری تخلص کرتے تھے ۔ سکھر کے بعد میرا جی کا قیام کچھ عرصہ جیکب آباد اور ڈابھے جی میں رہا اور بالاخر وہ لاھور چلے آئے ۔ لاھور کے دوران قیام میں اردو کے اس باغی شاعر کی زندگی میں میرا سین (ایک بنگالی لڑکی) والے واقعہ نے ایسا انقلاب پیدا کیا کہ وہ ثناء اللہ ساھری سے میرا جی بن گیا اور اُس کی زندگی کی ہر بات کچھ اس طر ح بدل گئی گویا اُس نے ایک نیا جنم لیا ھو ۔

اس واقعہ کے بعد جیسا کہ ھونا چاھئے تھا میرا جی انٹرنس کا امتحان پاس نہ کر سکے مگر کتب بینی کا شوق برابر جاری رھا ۔ کچھ دنوں کے بعد میرا جی نے ’’حلقہ ارباب ذوق‘‘ میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کی ۔ یہی دلچسپی اُنھیں ایک دن رسالہ ادبی دنیا کے دفتر لے گئی جہاں مولانا صلاح الدین نے اُن کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ھوکر انھیں نائب مدیر بنا لیا ۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک میرا جی ادبی دنیا سے منسلک رھے اور اس میں شک نہیں کہ میرا جی کے یہ چار سال ادبی دنیا میں فنی فروغ کے چار بہترین سال تھے ۔ ادبی دنیا سے قطع تعلق کر کے میرا جی آل انڈیا ریڈیو دھلی میں ملازم ھوئے ۔ ریڈیو کے مسودات لکھنے میں اُنھوں نے کافی مہارت حاصل کر لی تھی اور حسب ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے ۔ گیت بھی میرا جی نے ریڈیو ھی میں جا کر لکھے اور پھر اتنے کہ اُن کا مجموعہ ’’گیت ھی گیت‘‘ کے نام سے شائع ھوا ۔ مگر دلی پہنچ کر میرا جی کا ذوق مطالعہ غرق مئے ناب ھو گیا ۔ بہر حال چند سال دلی میں گزارنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں کچھ دنوں ایک ادبی رسالہ ’’خیال‘‘ نکال کر آخر ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال کیا ۔

میرا جی قطع نظر اس کے کہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور اچھے ادیب تھے، ایک ایسے شاعر بھی تھے جنھیں اردو کے باغی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - باغی اس لئے کہ انھوں نے ن - م راشد کی طرح اردو نظم کی روایت سے مکمل بغاوت کی اور اپنی منظومات کو موضوع اور تکنیک ہر دو لحاظ سے بالکل نئے رنگ میں پیش کیا - اس میں شک نہیں کہ ان کی اکثر نظمیں بڑی پیچیدہ اور مبہم ہیں لیکن اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ خود میرا جی کی زندگی خاصی پر اسرار اور پیچیدہ تھی - ساتھ ہی وہ اس تصادم اور کشمکش کی پیداوار تھے جو ہماری انفرادی آزادی اور سماجی اور اخلاقی پابندیوں میں پائی جاتی ہے - تاہم ایک عجیب بات یہ ہے کہ میرا جی نے یہ ابہام اور نئے نئے اشارے اور کنائے صرف آزاد نظم تک ہی روا رکھے ہیں اس کے علاوہ جب وہ دوسری شعری اصناف پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان میں نہ تو کوئی ابہام ہوتا ہے اور نہ کوئی خلا نظر آتا ہے بلکہ وہ روایات کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہیں -

میرا جی کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم عروض سے بخوبی واقف اور جملہ اصناف شعر پر حاوی ہیں - بالخصوص ان کی غزلیں ستھری اور گیت نہایت مترنم اور میٹھے ہیں وہ حسن کا شعور بھی رکھتے تھے مگر -

کوئی چھینے لئے جاتا ہے ستاروں کی چمک   کوئی مسموم کئے دیتا ہے شعلوں کی لپک

گرد و پیش کے حالات کا ادراک و اثر بھی لازمی تھا چنانچہ انھوں نے ایک حساس انسان کی حیثیت سے زندگی کی بہت سی تلخ حقیقتوں کا مشاہدہ کر کے اپنے جذبات و احساسات کو بڑے بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے - اس سلسلے میں جہاں ان کا موضوع سخن جنسی جذبات ہیں وہ بڑی حد تک الجھے ہوئے اور بے راہرو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے علاوہ جب وہ زندگی کے دوسرے مسائل کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں تو ان کے یہاں وضاحت کے ساتھ ساتھ بڑی دلکشی، روانی اور سوز و گداز ملتا ہے -

میرا جی کے اسلوب بیان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات ہمیں شروع میں ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آزاد نظم اردو میں ایک غیر روایتی چیز ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ ہماری شاعری میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے لہذا ایسی غیر روایتی صنف کے لئے اگر میرا جی نے بھی روایت سے ہٹ کر ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ہے تو وہ کم از کم اس وقت مورد الزام نہیں - اس آزاد نظم کے علاوہ دوسری اصناف میں میرا جی کا اسلوب بڑی حد تک روایتی اور دلکش ہے - انھوں نے صحیح زبان استعمال کی ہے ساتھ ہی چونکہ وہ ہندی زبان کی سرشت سے بخوبی واقف تھے اس لئے انھیں ہندی کے نہایت موزوں بلکہ رسیلے الفاظ کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل تھی جو ان کی غزلوں بالخصوص گیتوں میں ترنم و نغمگی اور سوز و گداز جیسی خوش آیندہ خوبیوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے -

بحیثیت مجموعی میرا جی کا کلام بیک وقت روایت کی اہمیت و بغاوت دونوں کا حامل ہے اور یہ تضاد اس لیے ہے کہ میرا جی خود متضاد عناصر کا مجموعہ تھے - وہ جنسی جذبات کا شکار تھے شاید اسی لئے وہ جب اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو نئے نئے

استعارے ، اشارے اور کنائے استعمال کر کے کچھ مبہم سی باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن اس موضوع کے علاوہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں تو کلام میں کوئی سقم راہ نہیں پاتا ۔ اس پر شاعر کے جذبات کا خلوص اور اُن کا دیانت‌دارانہ اظہار اس کے فن پاروں کو اور بھی قابل قدر بنا دیتا ہے ۔ مرحوم کے کئی مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں لیکن ابھی کئی ایسے مجموعے باقی ہیں جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہو گا
چپکے چپکے بہا کر آنسو دل کے دکھ کو دھونا ہو گا

پیاروں سے مل جائیں پیارے، انہونی کب ہونی ہو گی
کانٹے پھول بنیں گے کیسے، کب سکھ سیج بچھونا ہو گا

بہتے بہتے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہو گا

میرا جی کیوں سوچ ستائے ، پلک پلک ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے ، اپنے دل میں سمونا ہو گا

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا ، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو ، اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں ، کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ، ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بری جیسی بھی گزری ، اُن کے سہارے گزری ہے
حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں ، ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانا آگے آگے ، پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے ، منزل کا اعلان کریں

میر ملے تھے میرا جی سے ، باتوں سے ہم پہچان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے ، حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

گیت

انجانے نگر من مانے تھے

انجانے نگر من مانے تھے ، من مانے نگر انجانے رہے
اپنی باتوں کی مستی میں
سنتے رہے دلکی بستی میں
وھی گیت جو کچھ من مانے رہے ، وھی راگ جو سکھ کے بہانے رہے
راتیں بیتیں ، دن بیت گئے
رات بھی نئی پھر دن بھی نئے
مورکھ من ایسا ہٹیلا ہے ، اسے یاد وہ رنگ پرانے رہے
ان ہونی کا جسے دھیان رہا
ھونی نے اُسے چپکے سے کہا
نہ وہ باتیں رھیں نہ زمانے رہے ، جو رہے بھی تو باقی فسانے رہے
اب گیت میں رس ٹپکاتے ھیں
یوں دل کی آگ بجھاتے ھیں
اب دل کیلئے وھی باؤے ھیں ، جو بیتے سمے میں سیانے رہے

اب سکھ کی تان سنائی دی

اب سکھ کی تان سنائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب سکھ نے بدلا بھیس نیا اب دیکھیں گے ہم دیس نیا
جب دل نے رام دھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اس دیس میں سب انجانے ھیں اپنے بھی یہاں بیگانے ھیں
پیتم نے سب سے رھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی

ہر رنگ نیا ہر بات نئی — اب دن بھی نیا اور رات نئی
اب چین کی راہ سجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب اپنا محل بنائیں گے — اب اور کے در پہ نہ جائیں گے
اک گھر کی راہ سجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی

منظومات

لبِ جوئیبارے

ایک ہی پل کے لئے بیٹھ کے پھر اُٹھ بیٹھی
آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نشستہ بت ہے
یہ بصارت کو نہ تھی تاب کہ وہ دیکھ سکے
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا

پیچ کھاتے ہوئے یہ لہر اُٹھی دل میں مرے
کاش یہ جھاڑیاں اک سلسلۂ کوہ بنیں
دامنِ کوہ میں میں جا کے ستادہ ہو جاؤں
ایسی انہونی جو ہو جائے تو کیوں یہ بھی نہ ہو
خشک پتوں کا زمیں پر جو بچھائے بستر
وہ بھی اک ساز بنے ۔ ساز تو ہے ! ساز تو ہے !
نغمہ بیدار ہوا تھا جو ابھی، کان ترے
کیوں اسے سن نہ سکے ! سننے سے مجبور رہے
پردۂ چشم نے صرف ایک نشستہ بت کو
ذہن کے دائرۂ خاص میں مرکوز کیا

یاد آتا ہے مجھے ۔ کان ہوئے تھے بیدار
خشک پتوں سے جب آئی تھی تڑپنے کی صدا
اور دامن کی ہر اک لہر چمک اُٹھی تھی

پڑ رہا تھا اُسی تلوار کا سایۂ شائد
جو نکل آئی تھی اک پل میں نہاں خانے سے
جیسے بے ساختہ انداز میں بجلی چمکے

لیکن اُس دامن آلودہ کی ہر لہر مٹی
جل پری دیکھتے ہی دیکھتے رو پوش ہوئی
میں ستادہ ہی رہا میں نے نہ دیکھا (افسوس !)
کیسے تلوار چلی ' کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا

دامن کوہ میں استادہ نہیں ہوں اس وقت
جھاڑیاں سلسلۂ کوہ نہیں ' پردہ ہیں
جس کے اُس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
منظر انجان ' اچھوتی سی دلہن کی صورت

ہاں تصور کو میں اب اپنے بنا کر دولھا
اسی پردے کے نہاں خانے میں جاؤں گا کبھی
کیسے تلوار چلی ' کیسے زمیں کا سینہ
دل بے تاب کی مانند تڑپ اُٹھا تھا !
زندگی گرم تھی ہر بوند میں آبی پاؤں
خشک پتوں پہ پھسلتے ہوئے جا پہنچے تھے !

میں بھی موجود تھا ۔ اک کرمک بے نام و نشاں
میں نے دیکھا کہ گھٹا شق ہوئی ' دھارا نکلی '
برق رفتاری سے اک تیر کماں نے چھوڑا
اور وہ خم کھا کے لچکتا ہوا تھرا کے گرا
قلۂ کوہ سے گرتے ہوئے پتھر کی طرح
کوئی بھی روک نہ تھی اُس کے لئے ' اُس کے لئے
خشک پتوں کا زمیں پر ہی بچھا تھا بستر !
اُسی بستر پہ وہ انجان پری لیٹ گئی !

اور میں کرمک بے نام ' گھٹا کی صورت
اسی اُمید میں تکتا رہا ' تکتا ہی رہا

اب اسی وقت کوئی جل کی پری آ جائے
بنسری هاتھ میں لے کر میں گوالا بن جاؤں
جل پری آئے کہاں سے ! وہ آسی بستر پر
میں نے دیکھا ، ابھی آسودہ هوئی ، لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا هوں تنہا !
هاتھ آلودہ هے ، نمدار هے ، دھندلی هے نظر ،
هاتھ سے آنکھوں کے آنسوں تو نہیں پونچھے تھے!

ابوالہول

بچھا هے صحرا اور آس میں ایک ایستادہ صورت بتا رهی هے
پرانی عظمت کی یادگار آج بھی هے باقی ،

نہ اب وہ محفل ، نہ اب وہ ساقی
مگر آنھیں محفلوں کا اک پاسباں کھڑا ،
فضائے ماضی میں کھو چکی داستان فردا
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا هے ،
زمانہ ایوان هے ، یہ آس میں سنا رها هے پرانے نغمے ،
میں ایک نا چیز و هیچ هستی
فضائے صحرا کے گرم و ساکن ، خموش نغمے
مجھے یہ محسوس هو رها هے
ابھی وہ آ جائیں گے سپاهی
وہ تند فوجیں
دلوں میں احکام بادشاهوں کے لے کے آ جائیں گی آفق سے
هوائے صحرا نے چند ذرے کئے پریشاں
هے یا وہ فوجوں کی آمد آمد!
خیال هے ، یہ فقط خیال اک خیال سے دل میں ڈر گیا هوں ،
مگر یہ ماضی کا پاسباں پر سکون دل سے
زمیں پہ اک بے نیاز انداز سے هے قائم ۔

نارسائی

رات اندھیری ، بن ہے سونا ، کوئی نہیں ہے ساتھ
پون جھکولے پیڑ ہلائیں ، تھر تھر کانپیں پات
دل میں ڈر کا تیر چبھا ہے ، سینے پر ہے ہاتھ
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہو گی رات ؟

برکھا رت ہے اور جوانی ، لہروں کا طوفان ،
پیتم ہے نادان ، مرا دل رسموں سے انجان ؛
کوئی نہیں جو بات سجھائے ، کیسے ہوں سامان
بھگوان ! مجھ کو راہ دکھا دے ، مجھ کو دے دے گیان ،

چپو ٹوٹے ، ناؤ پرانی ، دور ہے کھیون ہارا ،
بیری ہیں ندی کی موجیں اور پیتم اس پار
سن لے سن لے دکھ میں پکارے اک پریمی بیچارا
کیسے جاؤں ، کیسے پہنچوں ، کیسے جتاؤں پیار ؟

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کی آگ
کیسے بجھاؤں پریم پہیلی ، کیسے کروں سنجوگ ؟
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دور ہے اسکا دیس ،
دور دیس ہے پیتم کا اور میں بدلے ہوں بھیس ،

حفیظ ہوشیارپوری



شیخ عبدالحفیظ سلیم متخلص بہ حفیظ ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں - آپ ۵ جنوری ۱۹۱۲ء مطابق ۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ کو لائل پور سے بارہ میل کے فاصلے پر ضلع جھنگ کے ایک گاؤں دیوان پور میں پیدا ہوئے - آپ کے والد مرحوم کا اسم گرامی شیخ فضل محمد خاں تھا - حفیظ صاحب کی ابتدائی تعلیم کا بیشتر زمانہ اسلامیہ ھائی اسکول ہوشیار پور میں گزرا - وھیں سے آپ نے ۱۹۲۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا - پھر ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے ایف - اے میں کامیابی حاصل کر کے گورنمنٹ کالج لاھور میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں بی - اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم - اے (فلسفہ) کی ڈگریاں حاصل کیں - تعلیم سے فراغت کے بعد حفیظ صاحب نے کچھ عرصہ محض علمی و ادبی مشاغل میں گزارا اور میاں بشیر احمد سکریٹری ''انجمن اردو پنجاب'' کی معیت میں انجمن مذکور کے اسسٹنٹ سکریٹری رھے - پھر تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی تو آل انڈیا ریڈیو لاھور سے وابستہ ہو گئے - قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے کراچی میں پروگرام ڈائرکٹر رھے - کچھ عرصہ بعد لاھور تبدیل ہو کر آئے اور اسٹیشن ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتے رھے - جون ۱۹۵۳ء میں دوبارہ کراچی واپس چلے گئے اور آجکل آپ کا قیام وھیں ھے -

حفیظ صاحب کو خاندانی روایات کی وجہ سے بچپن ھی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا - گھر میں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رھتا تھا - آپ کے نانا شیخ غلام محمد صاحب مرحوم جو پرانے مکتبوں کے فارغ التحصیل تھے فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے - انھیں اردو فارسی کی نظم و نثر کی بہت سی کتابیں حفظ تھیں - چنانچہ وہ فرصت کے وقت کسی کتاب کا کوئی حصہ زبانی سناتے اور پھر اس کی تشریح کرتے - ۱۹۳۰ء میں ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا - اس کے بعد حفیظ صاحب کا ذوق سخن زیادہ تر اپنے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید خاں راحل کے فیضان صحبت کا مرھون منت رہا - انھیں کے ہمراہ حضرت حفیظ مولانا گرامی مرحوم تک پہنچے اور ان کی دلچسپ صحبتوں میں شریک ہو کر اپنے مذاق سخن کو اور بھی نکھارا -

حضرت حفیظ گورنمنٹ کالج لاھور میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید احمد شاہ بخاری پطرس کی صحبتوں سے بہت اثر پذیر ہوئے - ابتدا سے ھی انگریزی شاعری کی طرف بہت رغبت تھی چنانچہ آپ نے چند انگریزی نظمیں بھی لکھیں - اردو میں آپ نظم و غزل

دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن طبیعت کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے اور بلا شبہ غزل ہی میں اُن کے فکر و فن کے جوہر کھلتے ہیں۔ آپ کی غزلیں اُردو غزل کی کامل شائستگی و تہذیب کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن میں غم جاناں و غم دوراں کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اُن کے تغزل کی سب سے امتیازی خصوصیت تخیل کی گہرائی ہے۔ یہ تفکر اور فلسفیانہ انداز بیان غالباً اُن کے یہاں اس لئے پیدا ہوا ہے کہ اُنھیں فلسفہ کے مضمون سے طالب علمی کے زمانے سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ وہ غزل کے پامال مضامین کو بھی ایک ایسے انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو نئی باتوں کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھر چونکہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دستگاہ رکھتے اور اساتذہ کے کلام کا وسیع مطالعہ کر چکے ہیں اس لئے زبان و بیان کی خوبیاں بھی اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

حفیظ صاحب نے غزلوں کی بہ نسبت نظمیں کم کہی ہیں مگر اُن میں بھی وہی شگفتگی و کشش ہے جو اُن کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ نے رومانی نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ جن میں جذبات کی فراوانی اور خیال کی رعنائی سب کچھ موجود ہے۔ یہ نظمیں در حقیقت اُن کی پریت کے گیت ہیں لیکن ان گیتوں میں سموئی ہوئی ذہنی و جذباتی کیفیات صحت مند ضرور ہیں۔ جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے وہ بھی گیتوں کی سی ہے یعنی اُس میں اُردو کے نرم اور مترنم الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی کے رس بھرے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے منظومات کے درد و موسیقیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

حفیظ صاحب کے بارے میں ایک بات اور کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ آپ کو تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے۔ غرض حضرت حفیظ پاکستان کے خوش فکر شعرا میں سے ہیں اور اُن کا کلام پختگی و روانی، سلاست و شگفتگی اور درد و اثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ موصوف نے کم کہا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جو کچھ ہے اُسے انتخاب کا شرف حاصل ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

راز سر بستہ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ! اللہ!
جلوے آنکھوں سے اُتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہمرنگ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسن بیاں تک پہنچے

نہ پتہ سنگ نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبار رہ منزل ہے نہ آواز جرس
کون مجھ رہرو گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ درد محبت کی ''حفیظ''
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے — تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک — شریک گریۂ شبنم نہ ہوں گے
زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم — یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے — تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

''حفیظ'' اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

تو نے اسے تعبیر کیا عشق سے ورنہ
کس کے لئے اے دوست پریشاں نہ ہوئے ہم

محدود ہے غم ایک نہ اک آفت جاں تک
افسوس حریف غم انساں نہ ہوئے ہم

دل کا ہے وہی حال خزاں ہو کہ بہاراں
صد شکر کہ رسوائے بہاراں نہ ہوئے ہم

جلتے ہیں مگر دیکھ کے دلسوزئ احباب
یعنی سر ہر بزم فروزاں نہ ہوئے ہم

توہین غم عشق نہ تھی ہم کو گوارا
توفیق خداداد پہ نازاں نہ ہوئے ہم

شرمندہ رہے سہل پسندان جہاں سے
وہ عقدۂ مشکل تھے کہ آساں نہ ہوئے ہم

ضرور عشق سے بڑھ کر بھی کوئی غم ہو گا
که آج دل پہ گراں یاد یار گزری ہے
غم جہاں نہ کہیں اس میں کار فرما ہو
که دل سے تیری نظر شرمسار گزری ہے
بہار ہو کہ خزاں دل کا ہے وہی عالم
که زندگی به اُمید بہار گزری ہے
خزاں نصیب یہ سمجھے کہ آ گئی ہے بہار
''حفیظ'' جب بھی چمن سے بہار گزری ہے

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
حدود شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے
غرور جادہ شناسی بجا سہی، لیکن
سراغ منزل مقصود بھی کوئی پائے
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر یہ کہے
چلے تھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے
نہ جانے اُن کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے
کوئی فریب نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے
غم زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب اُن گیسوؤں کے بھی سائے
''حفیظ'' اپنا مقدر، ''حفیظ'' اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

غم زندگانی کے سب سلسلے
بالآخر غم عشق سے جا ملے
روایات وصل و فراق اب کہاں
نئی قربتیں ہیں نئے فاصلے
تری یاد یوں دل میں آئی کبھی
کوئی جس طرح اتفاقاً ملے
بہاریں کئی آ کے رخصت ہوئیں
پر اہل جنوں کے نہ دامن سلے
نہ یہ معتبر ہیں نہ وہ معتبر
جفا کے تقاضے وفا کے صلے

ایسی بھی کیا جلدی پیارے، جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ، بیٹھ بھی جاؤ، سن لو کوئی دم
وصل کی شیرینی میں پنہاں، ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے، تم سے جدا ہونے کا بھی غم
حسن و عشق جدا ہوتے ہیں، جانے کیا طوفان اٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پرنم، عشق کی آنکھیں بھی ہیں پرنم

پروانے کی خاک پریشاں ، شمع کی لو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں ، کون کرے اب کس کا ماتم
کچھ بھی ہو پر ان آنکھوں نے، اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا ناز سراپا ، حسن کی دنیا عجز مجسم

ہجوم اندوہ و غم سراسر ترے غم عشق تک رسائی
ہزار غم بہر آزمائش ترے غم کارگر سے پہلے
وہی ہیں دیکھے ہوئے سے منظر، وہی ہیں مانوس سی فضائیں
کہیں وہیں پھر نہ آگئے ہوں چلے تھے جس رہگزر سے پہلے

کہیں دیکھی ہے شاید تیری صورت اس سے پہلے بھی
کہ گزری ہے مرے دل پر یہ حالت اس سے پہلے بھی
ترا نور جبیں تھا اور شام غم کی تاریکی
تجھے دیکھا ہے اے صبح مسرت اس سے پہلے بھی
نہ جانے کتنے جلوے پیش رو تھے تیرے جلووں کے
تجھی سے بارہا کی ہے محبت اس سے پہلے بھی
سناتی ہیں کوئی افسانہ تیری سہمگیں نظریں
ہوئی ہے مجھ سے گستاخانہ جرأت اس سے پہلے بھی
مری قسمت کہ میں اس دور میں بدنام ہوں ورنہ
وفاداری تھی شرط آدمیت اس سے پہلے بھی

نہ آسماں پہ نہ مژگاں پہ ہے ستارہ کوئی
شب سیاہ میں اندازۂ سحر کے لئے
ہنوز گوش بر آواز ہیں در و دیوار
نجانے کس کی ملاقات کی خبر کے لئے
نہ اب وہ ذوق طلب ہے نہ اب وہ عزم سفر
رواں ہے قافلہ تسکین راہبر کے لئے
نظر سے حد نظر تک تمام تاریکی
یہ اہتمام ہے اک وعدۂ سحر کے لئے

خدا دراز کرے عمر اهل شوق ''حفیظ''
کہ جی رهے هیں کسی دور منتظر کے لئے

چند آنسو بے ارادہ بے سبب
محفل غم بن گئی بزم طرب

دل کی دنیا اس قدر آباد هے
جس قدر ویران هیں چشم و گوش و لب

عشق اور خمیازۂ اظہار غم
حسن اور اندازۂ حسن طلب

کیا دل گرفتہ هم تری محفل سے آئے هیں
آنکھوں میں اشک بھی بڑی مشکل سے آئے هیں

مجبور هو کے پھر تری محفل میں جائیں گے
مایوس هو کے جو تری محفل سے آئے هیں

اپنی نظر میں اب کوئی جچتا نہیں ''حفیظ''
اُٹھ کر نہ جانے کس کے مقابل سے آئے هیں

تجھے یاد آئیں گے حسن پشیماں هم نہ کہتے تھے
ستائے گا تجھے بھی درد هجراں هم نہ کہتے تھے

چھپائے سے بھی اب چھپتا نہیں احساس محرومی
عذاب جاں بنے گا ربط پنہاں هم نہ کہتے تھے

علاج رنجش بے جا نہیں ترک تعلق بھی
یہ مشکل اس طرح هوگی نہ آساں هم نہ کہتے تھے

همیں ویرانئی پیهم سے لذت آشنا کر کے
تری دنیا بھی هو جائے گی ویراں هم نہ کہتے تھے

آ گئی اُن کی جدائی دل کو راس
پھر بھی هے ملنے کی اک موهوم آس

هوتے هوتے خشک آنسو هو گئے
بجھتے بجھتے بجھ گئی آنکھوں کی پیاس

اب ملے گی عمر بھر اس کی سزا
عشق میں باقی رهے هوش و حواس

یہ در و دیوار سے باتیں ''حفیظ''
جس طرح بیٹھا هو کوئی میرے پاس

کون جانے هو گئی کس کے بغیر
زندگی وهم و گماں، خواب و خیال

تیرے غم میں تیرے صورت آشنا
بن گئے آئینہ حسن و جمال

فرصت غم کو ہے اب جنکی تلاش — کاش بن سکتے وہ لمحے ماہ و سال
زندگی میں اور بھی غم تھے کئی — کیوں ہمیں آیا ترے غم کا خیال
کھل گیا ترک محبت کا فریب — اب انہیں دل سے بھلانا ہے محال
گر مقدر میں یہی کچھ تھا ''حفیظ''
عشق ہوتا بر تر از ہجر و وصال

ہر ایک درد کو درماں بنا دیا کس نے — غم حیات کو آساں بنا دیا کس نے
لب بہار پہ یہ مسکراہٹیں کب تھیں — کلی کلی کو گلستاں بنا دیا کس نے
سکون گوشۂ زنداں کو جی ترسنے لگا — اسیر دشت و بیاباں بنا دیا کس نے
ادائے پرسش غم سے غم جہاں کو حفیظ
کبھی کبھی غم جاناں بنا دیا کس نے

جبیں پہ گرد سفر ہے، نظر میں عزم جواں
یہ کس دیار میں پہنچے ہیں کس دیار سے ہم
فضا پہ چھائینگے طوفان رنگ و بو بن کر
بہار بن کے جو نکلے ہیں شعلہ زار سے ہم
تمام عمر رہا ہم کو انتظار بہار
بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم
افق پہ حد نظر تک غبار چھایا ہے
''حفیظ'' ابھریں گے آخر اسی غبار سے ہم

اتنا بھی مرا حال پریشاں تو نہیں ہے — آخر ترا غم ہے غم دوراں تو نہیں ہے
کیوں دیکھ رہے ہو مری افسردہ نگاہی — اندازۂ غم اس قدر آساں تو نہیں ہے

دولت غم بھی ہے بہت نایاب — دولت غم کو پائمال نہ کر

آپ کی یاد تک رہا شام و سحر کا سلسلہ
اب کوئی صبح بھی نہیں اب کوئی شام بھی نہیں

بات کہنے لگیں تو ختم نہ ہو　　بات کہنے کو مختصر سی ہے

تیرے لطف و کرم ہیں، تو بھی ہے، تیری وفا بھی ہے
مگر کوئی مداوا اس دل بے تاب کا بھی ہے

کچھ مجھے جرأت ہوئی ، کچھ اُن کی آنکھیں جھک گئیں
ہوتے ہوتے یوں ہی اظہار تمنا ہو گیا

لطف آنے لگا جفاؤں میں　　وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے

تم سے رخصت ہوئے تھے جو ہنس کر　　سر منزل پہنچ کے روئے ہیں
کیا ہوا میرے غمگساروں کو　　آج کچھ وہ بھی کھوئے کھوئے ہیں
ہجر کی رات جاگنے والے　　وصل کی رات خوب سوئے ہیں

ظلمت شب کا دھڑکتا ہے دل　　اس میں نا دیدہ سحر ہے کوئی
منتظر ہے مری آغوش وفا　　کاش آ جائے اگر ہے کوئی

منظومات

آج کی رات

چاندنی رات ہے جوانی پر
دست گردوں میں ساغر مہتاب　　نور بن بن کے چھن رہی ہے شراب
ساقئی آسماں پیالہ بدست　　میں شراب سرور سے سرمست
فکر دوزخ نہ ذکر جنت ہے　　میں ہوں اور تیری پیاری صورت ہے
رس بھرے ہونٹ مد بھری آنکھیں !
کون فردا پہ اعتبار کرے　　کون جنت کا انتظار کرے
جانے کب موت کا پیام آئے　　یہ مسرت بھی ہم سے چھن جائے
دامن عقل چاک ہونے دے　　آج یہ قصہ پاک ہونے دے

غم کو نا پائدار کر دیں ہم
موت کو شرمسار کر دیں ہم
لب سے لب یوں ملیں کہ کھو جائیں
جذب اک دوسرے میں ہو جائیں
میں رہوں اور نہ تو رہے باقی !

کس قدر دل نشیں ہیں لب تیرے
بادۂ احمریں ہیں لب تیرے
تیرے ہونٹوں کا رس نہیں ہے یہ
آج کوثر ہے ، انگبیں ہے یہ
شہد کے گھونٹ پی رہا ہوں میں
آج کی رات جی رہا ہوں میں
آج کی رات پھر نہ آئے گی !

آگ لگے اس من میں آگ

لو پھر رات برہ کی آئی
جان مری تن میں گھبرائی
چاروں اور اداسی چھائی
اپنی قسمت اپنے بھاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کالی اور برستی رین !
آس بن نیند کو ترسیں نین
جسکے ساتھ گیا سکھ چین
آس کی یاد کہے اب جاگ
آگ لگے اس من میں آگ

جس دن سے وہ پاس نہیں ہے
کوئی خوشی بھی راس نہیں ہے
جینے تک کی آس نہیں ہے
جان کو ہے اب تن سے لاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کون جئے اور کس کے سہارے
میٹھے میٹھے بول سدھارے
گیت کہاں وہ پیارے پیارے
اب وہ تان نہ اب وہ راگ
آگ لگے اس من میں آگ

درس دکھا کر جو چھپ جائے
کون ایسے سے پیت لگائے
کیوں اپنی کوئی دسا سنائے
چھوڑ محبت کا کھڑاگ
آگ لگے اس من میں آگ

تاریخیں

(۱) ماتم تاثیر

(۱)

غم تاثیر میں احباب گریاں
بہ زیر خاک محو خواب "تاثیر"
کہاں سے لائیں اس کو ڈھونڈ کر ہم
"محب صادق احباب تاثیر"

۱۳۷۰ھ

(۲)

اجل سے آج پیمان وفا ہے
بہت کوتاہ تھا پیمان "تاثیر"
نصیب اس کو بہشت جاودانی
نصیب دوستاں "ھجران تاثیر"

۱۳۷۰ھ

(۲) کراچی میں ٹرانسمیٹر لگنے کی تاریخ:-

ع تری آواز مکے اور مدینے

(۳) لیاقت علی خاں مرحوم کی تاریخ وفات:-

ع صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

اختر انصاری

اختر انصاری یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوئے مگر بدایوں میں اپنی زندگی کے صرف چند ماہ ہی بسر کئے شاید اسی بنا پر وہ بدایوں سے زیادہ دھلی کو اپنا وطن مانتے ہیں - آپ کے والد پنجاب میڈیکل سروس کے رکن تھے چنانچہ زندگی کے ابتدائی تین چار سال اختر صاحب نے پنجاب کے مختلف شہروں میں گزارے - پھر والد صاحب دھلی منتقل ہو گئے اور کئی سال اسٹنٹ سول سرجن رہ کر جب ریٹائر ہوئے تو وھیں سکونت اختیار کر لی - بنا بریں اختر انصاری صاحب بھی تین چار سال کی عمر سے مستقل طور پر دھلی میں رہے - وھیں ہوش سنبھالا اور وھیں تعلیم و تربیت کی مختلف منازل طے کیں - ۱۹۳۰ء میں دھلی یونیورسٹی سے بی - اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کر کے ۱۹۳۱ء میں انگلستان گئے لیکن حالات کی نا مساعدت کی بنا پر وھاں سے کچھ حاصل کئے بغیر جلد واپس آ گئے - ھندوستان پہنچ کر قانون پڑھنا شروع کیا مگر ایک ھی سال گزرا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہو گئی اور بی - ٹی میں داخلہ لے لیا - ۱۹۳۴ء میں ٹریننگ کالج علیگڑھ سے امتیاز کے ساتھ بی - ٹی پاس کر کے مسلم یونیورسٹی ھائی اسکول میں انگریزی کے اُستاد مقرر ہو گئے اور کافی عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - اس دوران میں اُردو ادب کا مطالعہ برابر جاری رہا - تقسیم ھند سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم - اے کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد عارضی طور پر وھیں شعبۂ اُردو میں لکچرر ہو گئے - آجکل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں -

اختر انصاری صاحب نے ۱۹۲۸ء سے شعر کہنا شروع کئے - ابتدا میں علامہ اقبال کے اثرات کے ماتحت قومی ' ملی اور منظریہ نظمیں لکھنے کا شوق زیادہ تھا اور غزلگوئی سے دلچسپی نہیں تھی - لیکن بہت جلد طبیعت کا اصلی رنگ غالب آ گیا اور قومیات کو پس پشت ڈال کر غنائی و جذباتی شاعری پر اپنی پوری توجہ صرف کرنا شروع کی - ۱۹۳۲ء میں نظموں ' غزلوں اور قطعات کا ایک مختصر سا مجموعہ ''نغمہ روح'' کے نام سے شائع کرایا جو بعد میں کچھ اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں دوبارہ شائع ہوا اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں تو زیادہ بہتر نہیں تھیں مگر قطعات ضرور انفرادیت کے حامل تھے چنانچہ ملک کے مقتدر جرائد میں جب ''نغمہ روح'' پر تبصرے ہوئے تو بلا مبالغہ ہر تبصرہ نگار نے اُنکے قطعات کی تعریف کی - غالباً انہیں ھمت افزا تبصروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اختر صاحب نے اُس کے بعد دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں قطعات پر زیادہ توجہ دی - حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں اُن کے محض قطعات کا ایک مجموعہ ''آبگینے'' شائع ہوا -

اختر صاحب کا حقیقی جوہر اُن کے قطعات میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ رباعی نما شعر جنہیں وہ قطعوں کا عنوان دیتے ہیں آنکی جدت طبع کا نتیجہ ہیں ۔ یہ قطعے رباعی سے اس خاص باب میں مختلف ہیں کہ رباعی میں بیشتر پہلے تین مصرعے چوتھے مصرعے کی خاطر برداشت کر لئے جاتے ہیں مگر ان قطعات میں پہلے تین مصرعے بھی اُس فضا کے پیدا کرنے کے کام آتے ہیں جو چوتھے مصرعے کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے ۔ ان قطعوں میں آپ نے مختلف موضوعات پر انتہائی برجستگی ' چستی اور صفائی کے ساتھ قلم آٹھایا ہے اور بعض اوقات تو سچ مچ شاعر کی چابکدستی و زور بیان پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔

اختر صاحب کی نظموں میں ' ابتدائی منظومات کو چھوڑ کر جن میں جذباتیت اور اظہار و ابلاغ کی بھی کہیں کہیں خامیاں موجود ہیں ' بڑی نغمگی ' ترنم ' ندرت بیان اور سب سے زیادہ خلوص کی کارفرمائی نظر آتی ہے نیز اُن کی تشبیہات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالعموم مادی و محسوس چیزوں کا موازنہ غیر مادی و غیر محسوس چیزوں سے کر کے اُن میں ایک خاص کیفیت و اثر پیدا کر دیتے ہیں ۔ آپ کی صرف نظموں کا ایک مجموعہ ''خندۂ سحر'' کے نام سے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہو چکا ہے ۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم نگاری میں بھی آنہوں نے گونہ ترقی کی ہے اور زندگی کے مختلف مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی منظومات کو حقیقت افروز بنا دیا ہے ۔ تاہم اختر صاحب چونکہ فطرتاً ایک متشائم انسان ہیں اسلئے اُن کی اکثر نظموں میں اندوہ و ملال کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔ اور اُن کی فطرت کی اس خصوصیت نے ہمارے تغزل کے روایتی قنوطی لب و لہجہ میں گم ہو کر غزل میں بڑی تاثیر پیدا کر دی ہے ۔ چنانچہ اختر صاحب کی غزلیات کے مجموعے ''خوناب'' کی غزلوں میں قوت تخئیل اور زبان و بیان کی دوسری خوبیوں سے قطع نظر جو درد اور کسک پائی جاتی ہے وہ در اصل اسی ذاتی وصف کی بدولت پیدا ہوئی ہے ۔

بحیثیت مجموعی اختر صاحب ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے علاوہ اچھے شاعر بھی ہیں اور نوجوان شعرا کی صف میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں لیکن کاش وہ اپنی دوسری ادبی مصروفیتوں کو کم کر کے اس طرف زیادہ توجہ دے سکتے تا کہ اُن کے کلام میں زیادہ مشاطگی اور ہمہ گیری پیدا ہو سکتی ۔

انتخاب کلام

قطعات

مسکراہٹ اور ہنسی

مسکرائی وہ جب تو میں سمجھا
کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا

ہنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم
دست ساقی سے جام چھوٹ پڑا

مغنّیہ کی آواز

یہ ترنم، یہ لطافت اور یہ رنگینیاں
کیوں نہ صدقے جائیے اس سحر کار آواز کے
جانفزائی، قلب سوزی، دلفریبی، رہزنی
واہ! کیا انداز ہیں اس خانہ بر انداز کے

مبتلائے محبت

تو جو راتوں کو اٹھ کے روتا ہے
آہ کیوں اپنی جان کھوتا ہے
ہم تمہیں چاہتے ہیں تم ہم کو
بس فسانوں میں یہی ہوتا ہے

برسات

مہین پھوار کے قطرے میں برف کے ریزے
بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر
فضا ہے بھیگی ہوئی اور جل رہا ہوں میں
خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر

رازِ دروں

تکلیف یہ ہر وقت کی ہوتی نہیں برداشت
یہ بار الم آہ اٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے
سینے میں بھی للّٰہ چھپایا نہیں جاتا

آرزو

دل کو برباد کئے جاتی ہے
غم بدستور دئے جاتی ہے
مر چکیں ساری امیدیں ''اختر''
آرزو ہے کہ جئے جاتی ہے

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائینگے یہ انگارے

شعلہ نوائی

کسی کی آنگلیوں کی جنبش پر
ارغنوں سے نکل رہے ہیں راگ
میرے سینے کی کیفیت ' توبہ
جیسے جنگل میں لگ رہی ہو آگ

حسین رات

نسیم ' پھولوں کی رونق' کِھلے ہوئے تارے
فضا میں چھوٹ رہے ہیں ضیا کے فوّارے
رخ حسینۂ فطرت سے آٹھ گئی ہے نقاب
نظر کو ڈھونڈ رہے ہیں حسین نظارے

منظومات

مغنّیه

نغموں کی نذر ہو گیا پہلے ھی جوش دل
کیا داد دوں مغنیہ ! نغمہ سرائی کی
افسوں کیا وہ دل پہ کہ دل دل نہیں رہا
گویا کوئی ادا تھی یہ رنگیں نوائی کی
آواز لہلہاتی ہوئی اور فرح بار ،
جس میں بھری تھیں نزھتیں ساری خدائی کی
اللہ ! یاد ھے مجھے اب تک وہ کیفیت
جب دل سے آ رھی تھیں صدائیں دھائی کی
وہ بات تو نہیں مگر اب بھی مغنیہ
کھاتا ھے دل قسم تری شیریں نوائی کی

امنگ

بہار خلد کا سینے میں بول بالا ھے
تری ضیا سے مری روح میں آجالا ھے
شعاع نور سے آنکھوں میں ھے چمک پیدا
تیرے جمال کے پرتو سے ھے دمک پیدا
فروغ رنگ سے رعنائیوں کا عالم ھے
مرے دماغ میں انگڑائیوں کا عالم ھے
آبل رہا ھے نشاط و سرور کا دریا
رواں جگر سے نظر تک ھے نور کا دریا
تو ایک شمع ھے جو دل میں دے رھی ھے لو
بنا رھی ھے چراغاں جہاں کو تیری ضو
مری نگاہ میں ھے رشک طور ہر ذرہ
ترے جمال کا در اصل عکس ھے دنیا
فضا میں موج صبا بن کے کھیلتی ھے تو
شراب حسن کے ساغر آنڈیلتی ھے تو

شباب حسن بہاراں میں رنگ تیرا ہے
گلوں کی مست اداؤں میں رنگ تیرا ہے
بہار زیست کو تجھ سے ثبات حاصل ہے
ترے وجود سے دل کو حیات حاصل ہے
مئے نشاط کا تو ایک جام ہے گویا
مجھے حیات ابد کا پیام ہے گویا

جبرِ حیات

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہمدم!
تجھے بھی دل سے بھلاؤں میں، خود کو بھی بھولوں
اُڑوں لگا کے تخیّل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر، ستاروں کو چھولوں
نہاؤں دھو میں کبھی کہکشاں میں، اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں
بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاض انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں
مگر اُڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں؟
بلندیوں سے گروں گا تو کیا کروں گا میں؟

طیارہ

یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارا
یہ اس کی نفاست، یہ اس کی لطافت
یہ پرواز اس کی کہ ہے ایک آفت
یہ قوت، یہ جودت، یہ چستی، یہ تیزی
یہ تندی، یہ شدت، یہ طوفان خیزی
پھر اس ساری ہنگامہ زائی کے با وصف

یہ نرمی کا انداز، یہ لوچ کا وصف
یہ مستی بھرے گیت کی سی روانی
یہ سازوں کے سنگیت کی سی روانی
رسیلی ہواؤں کے مانند بہنا
نشیلی ضیاؤں کے مانند بہنا

ہماری فراست کا شہ کار ہے یہ
جنوں اور حکمت کا شہ کار ہے یہ
عروج ذہانت کا شہ کار ہے یہ

عبارت ہے جس سے ہمارا تمدن
مڑا ہے بلندی کی جانب وہ دھارا
ترقی نے اپنی بھرا ہے طرارہ

فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ، یہ رنگیں شرارہ
یہ فردا کی انسانیت کا سہارا
یہ آئندہ تہذیب کا گہوارہ

ہمیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر
شقاوت بھری بستیوں سے اٹھا کر
تمدن کی بد مستیوں سے اٹھا کر

ستاروں کی دنیا میں لے جا رہا ہے
بہاروں کی دنیا میں لے جا رہا ہے
جہاں یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا نہ ہوگا
تعصب کی ظلمت کا ڈیرا نہ ہوگا
روایات کا کوئی گھیرا نہ ہوگا
یہ ہر بات میں تیرا میرا نہ ہوگا
نہ ہوں گی سیاسی غرض مندیاں یہ
نہ ہوں گی زمیں کی سی حد بندیاں یہ
یہ ہند اور ایران، چین اور جاپان
یہ اسپین، بلغاریہ اور سوئستان
فرانس اور ہالینڈ، روس اور یونان
یہ ڈبے نہ ہوں گے، یہ خانے نہ ہوں گے

یہ خوں ریزیوں کے بہانے نہ ہوں گے
تغلّب کے خونیں فسانے نہ ہوں گے
یہ منحوس جنگی ترانے نہ ہوں گے
یہ اہل سیاست کی گھاتیں نہ ہوں گی
یہ مکر و دنأت کی باتیں نہ ہوں گی
غلامی کے دن اور راتیں نہ ہوں گی
فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ، یہ رنگیں شرارہ
ہے فردا کی انسانیت کا سہارا
ہے آئندہ تہذیب کا گاہوارہ
یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارا

غزلیات

محبت ہے، اذیت ہے، ہجوم یاس و حسرت ہے
جوانی اور اتنی دکھ بھری! کیسی قیامت ہے
کہاں کی آرزوئیں، ولولے کیسے، اُمنگیں کیا
مری کل کائنات اب ایک افسردہ طبیعت ہے
وہ ماضی جو ہے اک مجموعہ اشکوں اور آہوں کا
نہ جانے مجھ کو اُس ماضی سے کیوں اتنی محبت ہے
ترا افسانہ اے افسانہ خواں! رنگیں سہی لیکن
مجھے روداد عشرت سن کے رو دینے کی عادت ہے
ستم دیکھو، ہمیں لطف نظارہ بھی نہیں حاصل
کہ جو آنکھوں کی راحت ہے وہی دل کی اذیت ہے

یادش بخیر عہد محبت کی شاعری
اک آہ تھی کہ گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

محبت کرنے والوں کے بہار افروز سینوں میں
رہا کرتی ہے شادابی خزاں کے بھی مہینوں میں
میں آن میں ہوں جو ہو کر آستان دوست سے محروم
لئے پھرتے ہیں سجدوں کی تڑپ اپنی جبینوں میں

زندگی بھر کی اذیت ہے یہ جینا یا رب!
ایک دو دن کی مصیبت ہو تو کوئی سہ لے
اتنے خاموش ہو کیوں اے شب غم کے تارو
کوئی قصہ ہی سناؤ کہ ذرا جی بہلے

مرے حواس پہ اک بیخودی سی طاری ہے
پیام لائے ہیں کس کا نسیم کے جھونکے ؟
حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو
مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

ابھی تو دل کی وحشت ہی جھلکتی ہے نگاہوں سے
کسی دن خون روئیں گی یہ دل کی رازداں آنکھیں

شباب نام ہے اُس جاں نواز لمحے کا جب آدمی کو یہ محسوس ہو، جواں ہوں میں

دل کو میں حسن سے تو بہلاؤں
اور اگر جان سے چلا جاؤں ؟
تو جہاں اے خیال رہتا ہے
کاش میں بھی وہاں پہنچ جاؤں !

خوار ہیں یوں مرے شباب کے دن
جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں
دل یہ کہتا ہے گنج راحت ہوں
دیکھنا غم نصیب کی باتیں !

شاعری ہو کہ شغل نغمہ و مے
مدعا خود کو بھول جانا ہے

رگوں میں دوڑتی ہیں بجلیاں لہو کے عوض
شباب کہتے ہیں جس چیز کو قیامت ہے

کبھی ہم بھی مسلماں تھے مگر نام خدا اب تو
کسی کے عشق میں بے دین و کافر بن کے بیٹھے ہیں

کیسے بدلوں میں اپنی فطرت کو — لاگ ہے مجھ سے خود محبت کو

اب کے فصل بہار کیسی رہی — پوچھئے پیرہن کے تاروں سے

غم کے صدمے اُٹھائے ہیں برسوں — جب مسرت کی قدر جانی ہے

کیوں نہ آنکھوں میں اشک بھر آئیں — دل کی چوٹ اور اس قدر بھر پور !

شب تار ! تیری خموشی کے قرباں ' بتا آمد آمد ہے کس رشک مہ کی
یہ بزم فلک کیوں سجائی گئی ہے' یہ تاروں کا چھڑکاؤ کیوں ہو رہا ہے ؟

آہ ! مطرب یہ ترا دھیمے سروں میں گانا — جیسے دریا شب مہتاب میں آہستہ بہے
''اختر'' اخفائے تمنا کی ہے کوشش بے سود — یہ محبت کبھی پردے میں رہی ہے نہ رہے

وہ حقائق میں کیا سکوں پائے — عمر بھر جس نے خواب دیکھے ہوں

دشمن زیست اک خدائی ہے — حیف ! اپنا کوئی خدا نہ ہوا

کامیابی کے دیکھتا ہوں خواب ! — میرے مالک ! مجھے ہوا کیا ہے ؟

یہ بھی ممکن نہیں کہ مر جائیں — زندگی آہ ! کتنی ظالم ہے

زندگی کی ہوس ہے پھر مجھ کو دل میں بھڑکی ہے انتقام کی آگ

مٹ گئے ایک غم عشق میں سارے جھگڑے
درد سمجھے تھے جسے ہم وہ مداوا نکلا

یہی ہے مصلحت اخفائے راز میں ''اختر'' جہاں میں رسم محبت نہ عام ہو جائے

محبت بھرا دل بھی کیا شے ہے یا رب !
کبھی سنگ خارا ، کبھی آبگینہ

میں بہت ہی برا ہوں اہل بزم ! تم کہو تو یہاں سے اٹھ جاؤں
جوش مستی اگر سہارا دے بزم بادہ کشاں سے اٹھ جاؤں

ہو کے محروم تمنا جو جئے گا یا رب ! اس کا جینا بھی کوئی جینے میں جینا ہوگا

اب یہ عالم ہے کہ اس دکھ بھری حالت پہ مری
کوئی روتا ہے تو ''اختر'' میں ہنسا کرتا ہوں

آلِ رضا رضاؔ

سید آل رضا نام رضا تخلص ۱۸۹۷ء میں قصبہ نیوتنی ضلع آناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے - آپ کے والد خان بہادر جسٹس سید محمد رضا صاحب ابتداً منصف تھے پھر اودھ کے اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر فائض رہے اور آخر میں لکھنؤ چیف کورٹ کے جج ہو گئے تھے -

رضا صاحب کا بچپن اپنے والد مرحوم کے ہمراہ مختلف اضلاع میں گزرا - لیکن گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک سیتا پور اسکول میں پڑھتے رہے - وہاں سے انٹرنس کر کے لکھنؤ چلے آئے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک چار سال کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی اور بی - اے کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد خانگی امور نیز دیگر مصروفیتوں کے سبب سے دو سال بیکار گزرے - ۱۹۱۸ء سے قانون پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں الہ آباد لا اسکول سے ایل - ایل - بی پاس کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی - لیکن ۱۹۲۱ء میں آپ پرتاب گڈھ چلے گئے جہاں ۱۹۲۷ء تک برابر پریکٹس کرتے رہے - ۱۹۲۷ء سے دوبارہ لکھنؤ میں اقامت اختیار کی اور یہاں بھی مشغلہ وکالت جاری رہا - تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے ہر دو برادران حقیقی جناب ہاشم رضا و جناب کاظم رضا صاحبان کے ایماء پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لے آئے اور اب وہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں -

جناب رضا کی شاعری کا آغاز پرتاب گڈھ کے دوران قیام میں ہوا - شروع میں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن ۱۹۲۲ء سے احباب کے اصرار پر باقاعدہ غزل کہنا شروع کی اور سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا - شاعرانہ حیثیت سے رضا صاحب پرتاب گڈھ ہی میں کافی شہرت کے مالک بن چکے تھے - اس کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس گرم تھی چنانچہ آپ نے ان محفلوں میں حصہ لینا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے ادبی رتبہ کو منوا لیا - اس کے اعتراف میں ''انجمن معین الادب'' نے ' جس کے ممبر جناب صفی اور حضرت ظریف بھی تھے ' رضا صاحب کو نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا اور بعد ازاں صدارت کے فرائض بھی تفویض کر دئے - کچھ عرصہ کے بعد یہ ادبی انجمن ''بہار ادب'' کے نام سے موسوم ہوئی تو اس میں بھی آپ نے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا -

جناب رضا بڑے وضع دار انسان ہیں چنانچہ ان کے کردار کی یہ خصوصیت ان کی

شاعری میں بھی نمایاں ہے ۔ وہ خالصتاً غزل گو شاعر ہیں ۔ آنکی شاعری کا آغاز اسی صنف لطیف سے ہوا اور آج بھی وہ غزل ہی کہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں آن کے اپنے خیالات پیش کرنا بے محل نہ ہوگا ۔ فرماتے ہیں ''میں زیادہ تر جذباتی شاعری کرتا ہوں جس میں روحانیت کا خاصا حصہ ہوتا ہے لیکن شاعر کی دنیا کو یہیں تک محدود نہیں سمجھتا........غزل کے اشعار کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ محبت کی کوئی کیفیت ایسے الفاظ میں بیان کی جائے جو آس کیفیت کے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ آپس میں بھی ہم آہنگ ہو ۔ کوئی کیفیت سے مطلب نا مناسب کیفیت نہیں ہے ۔ ہر بات کہنے والی نہیں ہوتی اور ہر کہنے والی بات ہر طریقہ سے نہیں کہی جاتی ۔ ایک مرتبہ کی کہی ہوئی بات کو پھر آسی طرح کہنا اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرنا ہے ۔ ہر شعر میں کوئی بات تو ہو ۔ موضوع میں تنوع نہ ہو تو آسلوب بیان ہی میں کوئی خاص رنگ ہو'' اور بلاشبہ آن کا یہ نظریۂ شاعری آن کے کلام پر پورا پورا صادق آتا ہے ۔ وہ غزل میں کسی خاص طرز کے موجد یا مبلغ تو نہیں ہیں لیکن اپنے مخصوص آسلوب بیان کی بدولت پہچانے ضرور جا سکتے ہیں ۔ وہ غزل کو غزل کے نہایت نازک و لطیف حدود میں رکھ کر دلی جذبات کی مصوری کرنے کے عادی ہیں اور اکثر و بیشتر محض تغزل کے شعر کہتے ہیں ۔ آن کا رنگ سخن خشک فلسفیانہ بلندی سے معرا اور سوقیانہ پستی سے بالکل پاک اور منزہ ہے ۔

رضا صاحب کو ایک تو خود اہل زبان ہونے کا شرف حاصل ہے اس پر جناب آرزو جیسے شیریں بیان آستاد کی صحیح رہنمائی نے آن کی زبان و بیان میں اور بھی دلکشی و گھلاوٹ پیدا کر دی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت رضا اپنی وکالت کی گوناگوں مصروفیات کے باعث شعر و سخن کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکے اور ان کا سرمایۂ شاعری ایسا کچھ زیادہ بھی نہیں ۔ بایں ہمہ آنہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی ہمواری روانی اور سلاست کے لحاظ سے خوب ہے ۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کا ایک مختصر سا مجموعہ کلام ''نوائے رضا'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے ۔ جس میں آپ کی غزلیں زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں اور ان کے مطالعہ سے آنکے کلام کی تدریجی ترقی صاف ظاہر ہوتی ہے ۔

جناب رضا لکھنؤ کے دور جدید کے آن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے جلال ' آرزو اور صفی جیسے اساتذۂ فن کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا اور جناب سراج لکھنوی اور حضرت قدیر لکھنوی کے ساتھ مل کر لکھنؤ کی بساط شاعری کو رونق بخشی ۔ یہاں جناب اثر لکھنوی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اپنے کلام کی پختگی اور آستادانہ شان کی بدولت آج بھی دلدادگان ادب و شعر سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں ۔ لیکن آپ میں اور رضا صاحب کے کلام میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ اثر صاحب کی شاعری صرف غزلگوئی تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ نظم و تراجم سے بھی آردو کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں ۔ برعکس اس کے جناب رضا کی شاعری کی ابتدا غزل

سے ہوئی اور آج تک وہ اسی صنف کے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔ عاشقانہ جذبات کو سادہ مگر نکھری ہوئی زبان میں بے تکلفی سے ادا کرنا اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔

انتخاب کلام

انتظار آپ کا پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
مہرباں! یاد یہ مٹّی ہوئی تصویر رہے

یہی اچھا ہے جو اس طرح مٹائے کوئی
آپ بھی پھر مجھے ڈھونڈھے تو نہ پائے کوئی
کوندتی برق نہ دیتی ہو جہاں فرصت دید
تاب کیا ہے؟ جو وہاں آنکھ اُٹھائے کوئی
بندشیں عشق میں دنیا سے نرالی دیکھیں
دل تڑپ جائے مگر لب نہ ہلائے کوئی

مرحبا! خوب کیا رنج سے آزاد مجھے
یوں مٹایا ہے کہ مٹنا بھی نہیں یاد مجھے
تم، وہ تم ہی نہ رہو، بھول سکوں گر تم کو
میں، وہ میں ہی نہ رہوں، تم جو کرو یاد مجھے

عشق کی شان، جنوں، حسن کی خو ناز و غرور
آپ مجبور ہیں، بندہ بھی خطا وار نہیں

وہ کرے کیا؟ کچھ نہ آئے جسکو منت کے سوا
پھر یونہی منت کرینگے ہم، خفا ہو جائیے
اپنی ہی آنکھوں میں جب کھٹکے رضا! اپنا وجود
آپ ہی، اپنی گناہوں کی سزا ہو جائیے

مایوس خود بخود دل اُمید وار ہے — اس گل میں بو خزاں کی ہے رنگ بہار ہے
طے ہو چکیں شکست تمنا کی منزلیں — اب اسکے بعد گریۂ بے اختیار ہے
اُس بے وفا سے کر کے وفا مر مٹا ''رضا'' — اک قصۂ طویل کا یہ اختصار ہے

نیرنگ بزم دھر، طلسم فریب ہے — لیکن میں کیا کروں نگہ اعتبار کو
وہ بھی کوئی سکوں ہے جو بیچارگی سے ہو — دیکھا کیا میں گردش لیل و نہار کو

چشم حسرت کو خدا رکھے، نہ پوچھے ساقی
ہم بھی دو جام بھرے بیٹھے ہیں میخانے میں
زندگی دیکھ کے ہر دور سے تھراتی ہے
اپنی تصویر جھلکتے ہوئے پیمانے میں

فریاد کر رہی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ — دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

حیرت آئینہ ہے پر تو نیرنگ جمال — ہر ادا اک نئی تصویر دکھا جاتی ہے

تھپیڑوں کا موجوں ہی کے آسرا ہے — چل اے میری کشتی! خدا، نا خدا ہے

کسی کو فارغ اندوہ پاؤں تو پوچھوں — کہ اور بھی کوئی صورت ہے زندگانی کی

اُن کے ستم بھی کہہ نہیں سکتے کسی سے ہم
گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں عجب بے بسی سے ہم
یادش بخیر، دل کا خیال آ کے رہ گیا
اس بے دلی میں جیتے ہیں کس بے حسی سے ہم
جو دل میں تھا وہ ملتا ہے ساتھ اپنے خاک میں
تم دور، اور کہہ نہ سکے کچھ کسی سے ہم

رت اور فضا بدلی، زنداں کی ہوا بدلی — بیڑی کی صدا بدلی، دیوانہ پریشاں ہے

آگاہئی رموز ہے خود پردہ دار حسن — میں کچھ سمجھ چلا تھا کہ دیوانہ ہو گیا
کیوں ہنسکے کہدیا "مرے در کا فقیر ہے" — میرا مزاج اور بھی شاہانہ ہو گیا

جو مجھ پہ ہنستے ہیں ہنس لیں جو روتے ہیں رو لیں
کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں

ہائے کیا وقت تھا، کیا کیف تھا، کیا عالم تھا
جب تیرے لب پہ میرا پہلے پہل نام آیا
ہم گئے جان سے اور ضد نہ جوانی کی گئی
کھا لیا تیر کلیجہ پہ، تو آرام آیا

قسمت میں خوشی جتنی تھی ہوئی اور غم بھی ہے جتنا، ہونا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب جنگل جنگل رونا ہے
ہستی کے بھیانک نظارے، ساتھ اپنے چلے ہیں دنیا سے
یہ خواب پریشاں اور ہم کو، تا صبح قیامت سونا ہے
دم ہے کہ ہے اُکھڑا اُکھڑا سا اور وہ بھی نہیں آ چکتے ہیں
قسمت میں ہو مرنا یا جینا، اب ہو بھی چکے جو ہونا ہے
دل ہی تو ہے آخر بھر آیا، تم چیں بہ جبیں کیوں ہوتے ہو
ہم تم کو بھلا کچھ کہتے ہیں، تقدیر کا اپنی رونا ہے
غم کاہے کا یارو ماتم کیا، بدلوگے نظام عالم کیا
مرنا تھا رضا کو مرتا ہے، یہ کاہے کا رونا دھونا ہے

زندگی ختم جہاں کی، وہ جگہ پھر نہ ملی
تیرے کوچے سے اُٹھائے لئے جاتے ہیں مجھے

نگاہ لطف کا تیری بہت ممنون ہوں لیکن
مروت کے علاوہ اور بھی اک شے محبت ہے

وہ زمانہ جب اسی دل پر تھی چشم التفات
خواب سا ہے ایک لیکن بارہا دیکھا ہوا

بہلا کے سویرا کرتے ھیں اس دلکو اُنہیں کی باتوں میں
دل جلتا ھے اپنا جنکی طرح برسات کی بھیگی راتوں میں

دم لے ، مرے ٹوٹے دل ، دم لے ، گھبرا کے بھلا کیا پائیگا ؟
خیر ! اُس کو بھلائیں گے دل سے ، جتنا که بھلایا جائیگا
در سے تو اُٹھا ھی تم نے دیا ، تڑپوں بھی نه میں یه ظلم ھے کیا ؟
ٹوٹا ھے سہارا مدت کا ، صبر آتے آتے آئے گا
کہتے تھے رضا ! کمبخت رضا !! نا اھل وفا سے دل نه لگا
اب کاھے کا رونا پچھتانا ؟ جو جیسا کرے گا پائے گا

نه تھا آسان کچھ دم توڑنا کانٹوں کی نوکوں پر
بڑی مشکل سے نکلے حوصلے حسرت بھرے دل کے
زباں صرف دعا ، سجدے میں سر ، اور خاک پر سجده
ھوئے ھونگے کم اتنے خیر مقدم تیغ قاتل کے

کرم نما ھے ستم اور ستم نما ھے کرم وفا کی داد ملی ھے کس اھتام کے ساتھ

پھر اُس کی یاد پیام اُمید لائی ھے سلام ھجر نصیباں بکوئے جانانه
سمجھنے دیتی نہیں ابتدا محبت کی زمانه ختم کرے گا کہاں یه افسانه

چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں یہاں جو آئے ، تو بے اختیار بیٹھ گئے

گئے تم ایک ، مگر یوں کہه کر گئے تنہا تمہارے ساتھ گئیں خوبیاں مقدّر کی

آئے دن کا رونا جائے ، اے دل اُن کو بھول ھی جا
زھر دوا ھے تیرے حق میں جینا جب مشکل ھو جائے
حسن کی گرمی ، نئی جوانی ، پہلی محبت ، نازک دل
جلتی تپتی ریت په گر کر ، جیسے تازه کلی کُمھلائے

ہاں ، اور جس طرح بھی ہو تڑپائیے مجھے کچھ ایسا کیجئے کہ نہ یاد آئیے مجھے

دفعۃً جا کے پھر نہ پلٹی نگاہ کشش حسن ! اے معاذ اللہ !
پہلا آنسو گرا جو الفت میں درد اٹھ کر پکارا ، "بسم اللہ"

مٹایا ہے ہمیں نے اسکو ورنہ کیا سے کیا ہوتی
ہماری داستاں جتنا گلہ ہم سے کرے کم ہے

داد وفا کا وقت بھی اک ہے ، اب نہ سہی کچھ بعد سہی
دل سے بھلانے والے تجھے ہم سب سے سوا یاد آئیں گے

اللہ نظر کوئی ٹھکانہ نہیں آتا آنے کو چلے آتے ہیں جانا نہیں آتا
کہدوں تو مزے پر یہ فسانہ نہیں آتا ٹھہروں تو پلٹ کر یہ زمانہ نہیں آتا
یوں روز ہوا کرتے تھے بے ساختہ چکر اب آج بلایا ہے تو جانا نہیں آتا
تدبیر سی تدبیر دعاؤں سی دعائیں سب آتا ہے تقدیر بنانا نہیں آتا

خیال حسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی
وقار عشق بس اب سر جھکادے قدموں پر
ادھر سے تیرے لئے سبقت سلام ہوئی
ہر ایک اپنی جگہ خوش ، ہر اک یہی سمجھا
نگاہ خاص بہ طرز نگاہ عام ہوئی

اپنا لیا اسے چمن روزگار نے میرے لئے جو پھول کھلایا بہار نے
ہر دم نئی ادا سے وہ آتے نظر پڑے آنکھوں سے کتنے کام لئے انتظار نے
رچ رچ کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روز پھول جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

واسطہ کوئی نہ رکھ کر بھی ستم ڈھاتے ہو تم
دل تڑپ اٹھتا ہے ، اب کاہے کو یاد آتے ہو تم

لاتے ہو کیف طرب ' دیتے ہو پیغام حیات
کیا بتاؤں ساتھ لیکر کیا چلے جاتے ہو تم
بھیج کر خوشبو ہواؤں میں بہ انداز پیام
کیا یہ سچ ہے آج یوں میری طرف آتے ہو تم
تم سے ہے آراستہ جذبات کا تازہ چمن
جیسی رت ہوتی ہے ویسا پھول بن جاتے ہو تم

دل کا ٹکڑا کوئی ہر لفظ میں شامل ہو جائے
ذکر جسکا ہے ذرا آسکے بھی قابل ہو جائے
انتظار اور جدائی کا مسلسل یہ پیام
جان بھی جاتی ہوئی رات میں شامل ہو جائے
آپکے ہار میں یہ پھول جو ہے دل کے قریب
اس سے کہئے کہ جب آترے تو مرا دل ہو جائے

حسن کی فطرت میں دل آزاریاں — آس پہ ظالم نت نئی تیاریاں
متصل طفلی سے آغاز شباب — خواب کے آغوش میں بیداریاں
سوچ کر آن کی گلی میں جائے کون — بے ارادہ ہوتی ہیں تیاریاں
درد دل اور جان لیوا پرسشیں — ایک بیماری کی سو بیماریاں
اور دیوانے کو دیوانہ بناؤ ! — الله الله اتنی خاطر داریاں
بندھ رہا ہے اے "رضا" رخت سفر
ہو رہی ہیں کوچ کی تیاریاں

الله رے آغاز محبت کی فضائیں
باتوں میں ' نگاہوں میں ' خیالوں میں ادائیں
کیا وعدۂ پیہم پہ رضا آس لگائیں
آج آئیں کہ کل آئیں ' وہ آئیں کہ نہ آئیں

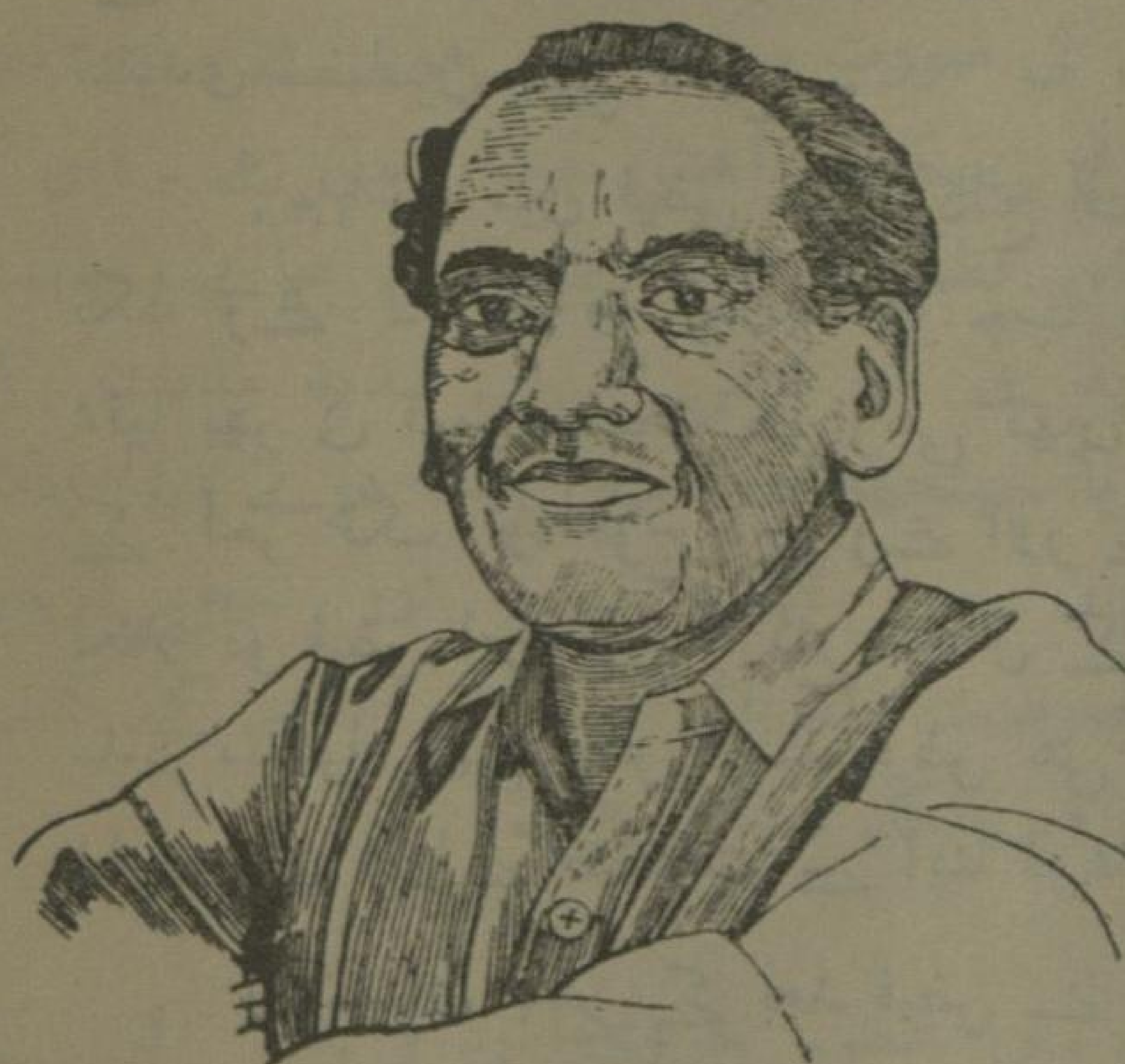
تمہارے ہی رحم و کرم کے سہارے — نہ معلوم مر مر کے کیوں کر جئے ہیں
کہاں پائے نازک کہاں راہ آلفت — مرے ساتھ دو اک قدم ہو لئے ہیں

ہنساتا ہے سب کو ہمارا فسانہ ہمیں کہتے کہتے کبھی رو لئے ہیں
بھلے ہیں برے ہیں کسی سے غرض کیا ''رضا'' وہ بہر حال میرے لئے ہیں

ہمیں نے اُن کی طرف سے منا لیا دل کو
وہ کرتے عذر، تو یہ اور بھی گراں ہوتا
سمجھ تو یہ کہ نہ سمجھے خود اپنا رنگ جنوں
مزاج یہ کہ زمانہ مزاج داں ہوتا
بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا
اُجڑ نہ جاتا، تو پھولوں میں آشیاں ہوتا
دماغ عرش پہ ہے تیرے در کی ٹھوکر سے
نصیب ہوتا جو سجدہ، تو میں کہاں ہوتا

جنون بن کے محبت کا اعتبار اُٹھا جو ہنس رہے تھے وہی لوگ معتبر ٹھہرے
بغیر اُن کے ادھر کیا ہے زندگی کیلئے زمانہ بھر کے سہارے تو سب اُدھر ٹھہرے
چراغ کتنے نڈر تھے شب جوانی کے ہوا کے رخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

فیض احمد فیض



فیض احمد نام فیض تخلص ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی اور عربی میں ایم۔ اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے دوران قیام میں ہی فیض کو ادبی ذوق پورا کرنے کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ”زندہ دلان لاہور“ کا حلقہ بقول شخصے زندہ تھا اور تمام ادب دوست حلقوں کی نگاہیں اسی ایک حلقے کی طرف اٹھتی تھیں۔ چونکہ اس حلقے کے اکثر اراکین کالجوں سے متعلق تھے اس لئے نئی پود ان سے اور بھی مانوس و متاثر تھی۔ چنانچہ فیض جب گورنمنٹ کالج میں آئے تو ان دنوں بخاری، تاثیر، مجید ملک، سالک وغیرہ لاہور کی ادبی محفلوں کو گرما رہے تھے۔ فیض تو ویسے بھی کالج میں پطرس کے شاگرد تھے۔ اس لئے جب زندہ دلان لاہور نے مشہور ادبی سالنامہ ”کارواں“ شائع کیا تو نوجوانوں میں فیض کی نگارشات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

۱۹۳۶ء میں فیض ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوگئے اس زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج میں اساتذہ کا ایسا گروہ جمع ہو گیا تھا جو نہ صرف ادب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا بلکہ سیاست میں بھی انقلابی رجحانات کے حامل تھا۔ کالج کے پرنسپل صاحب زادہ محمود الظفر انگلستان کے ان فارغ التحصیل نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے وہاں ”ترقی پسند مصنفین“ کی بنیاد رکھی۔ ان بنیاد رکھنے والوں میں سجاد ظہیر، ملک راج نند، محمود الظفر، ڈاکٹر اشرف، زیڈ۔ اے احمد اور تاثیر مرحوم تھے۔ چنانچہ محمود الظفر اور ان کی بیوی رشیدہ جہاں نے بھی فیض کو خاصا متاثر کیا۔ چنانچہ فیض کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات اور سماجی دکھوں کا بھرپور اظہار، بڑی حد تک انھیں لوگوں کی صحبت ہی کا نتیجہ ہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک نے ایک منظم صورت اختیار کی تو فیض اس میں پیش پیش تھے۔

۱۹۳۶ء کے بعد تو ہندوستان کے درمیانی طبقے میں انقلابی رجحانات اور ترقی پسند نظریات اس تیزی سے پھیلے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک زندہ حقیقت بن گئی چنانچہ فیض شاعری کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکا اور اس نے غم جاناں اور

غم دوراں کی آمیزش سے ایسی شاعری کی جس سے ساری نئی پود متاثر ہوئی - ۱۹۳۹ء کے شروع میں جب فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' شائع ہوا تو واقعی ہندوستان کی ادبی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا - اسی دوران میں فیض نے کچھ عرصہ کے لئے ''ادب لطیف'' کی ترتیب کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہیں دنوں اُنھوں نے بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے -

۱۹۴۰ء میں فیض ہیلی کالج آف کامرس لاہور میں لکچرر ہو گئے اور تقریباً دو سال تک رہے - یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی اور فاشزم کے خلاف دنیا بھر کی قومیں متحد ہو رہی تھیں چنانچہ فیض بھی فوج میں ملازم ہو گئے - ۱۹۴۶ء کے آخر تک وہ فوج میں رہے اور ۱۹۴۷ء کے شروع میں جب روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' نکلا تو فیض اس میں آ گئے - اس کے بعد جب ''امروز'' نکلنا شروع ہوا تو اس کے مدیر مسئول بھی فیض احمد فیض ہی مقرر ہوئے اور اس طرح ایک نامور شاعر نے چند ہی دنوں میں دنیائے صحافت سے اپنا لوہا منوا لیا -

پاکستان بننے کے بعد فیض نے مزدور تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا وہ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر مقرر ہوئے اور مزدوروں کے نمایندے کی حیثیت سے آئی - ایل - آو کے جنیوا اجلاس میں بھی شریک ہوئے - ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو آپ پاکستان سیفٹی آرڈنینس کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور آن پر راولپنڈی سازش کے سلسلے میں مقدمہ چلا جس میں انھیں سزا ہو گئی - آن کا دوسرا مجموعہ کلام ''دست صبا'' حیدرآباد جیل ھی میں مرتب ہوا - اور جیل میں ھی انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین مرتب کئے جو عنقریب ''میزان'' کے نام سے شائع ہونگے -

جہاں تک فیض کی شاعری کا تعلق ھے آن کا شعری سرمایہ بہت تھوڑا ھے لیکن ساتھ ھی ھمیں یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ یہ مختصر سا کلام آن کے بہت سے ھمعصروں کے ضخیم شعری سرمایہ کے مقابلے میں اپنی گراں مائگی کے اعتبار سے بہت وزنی ھے -

فیض نے اپنی ابتدا غزل گو کی حیثیت سے کی لیکن آھستہ آھستہ منظومات کی طرف بھی رجحان پیدا ھوا اور آج وہ ان دونوں اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ھیں- بحیثیت مجموعی آن کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ھے - پہلے دور کو ھم ''رومانی'' کہہ سکتے ھیں-اس دور کی غزلوں اور نظموں میں فیض نے ایک تخیلی دنیا بسائی ھے جس میں وہ غم دوراں کی تلخ کامیوں سے فرار حاصل کرکے پناہ لینا چاھتا ھے-اور ایک خیالی محبوبہ کا سہارا لیتا ھے - لیکن اس روایتی شاعری میں بھی فیض کی انفرادیت برقرار رھتی ھے - اُس کے یہاں ایک مخصوص تازگی و شگفتگی بھی ھے اور حسن کا صحیح و واضح احساس بھی - حسن کا یہ احساس فیض کے یہاں اس لئے پیدا ھوتا ھے کہ وہ کسی جنسی اُلجھن کا شکار نہیں - اُس کی اس دور کی نظموں و غزلوں میں فکر کی گہرائی یا شعور کی بیداری زیادہ نہیں لیکن حسن کے لطیف و نازک احساسات تک رسائی ضرور ھے -

فیض کی شاعری کا دوسرا دور وہ ھے جس میں وہ زندگی کا کافی مشاھدہ و تجربہ کئے ھوئے معلوم ھوتا ھے - اس دور میں ھم ''نقش فریادی'' کی آخری نظموں سے لے کر ''دست صبا'' تک کے کلام کو شامل کر سکتے ھیں اس دور کے کلام میں وہ پچھلی

فراریت ختم ہو جاتی ہے اور عشق کی ایک منزل کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے ۔ موضوعات میں اب بھی نمایاں وسعت و ہمہ گیری تو پیدا نہیں ہوتی لیکن احساس کی شدت ، جذبات کا خلوص اور سب سے زیادہ عمل کی شدید خواہش نے ان موضوعات میں جان ضرور ڈال دی ہے ۔ اب کلام میں وہ سادگی ہلکا پھلکا پن اور جذباتیت ، فکری گہرائی اور شعور کی پختگی میں تبدیل ہو کر ایک نئے عزم و جولانی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے ۔ اس میں ایک نئی زندگی کا احساس اور اُس نئی زندگی کو سنوارنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس دور کی غزلوں اور نظموں میں قنوطیت کے بجائے رجائیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ فیض انتہائی شدید جذبات کی ترجمانی میں بھی اپنے لہجے میں کوئی تیزی یا جھنجھلاہٹ نہیں پیدا ہونے دیتا بلکہ اپنے مخصوص معتدل اور متوازن انداز کی بدولت بیان میں ایک نرمی اور لہجے میں دباؤ پن پیدا کر دیتا ہے ۔ فیض کی یہ خصوصیت کم از کم عصر حاضر کے کسی نوجوان شاعر میں نہیں پائی جاتی اور اس معاملہ میں وہ بالکل منفرد ہے ۔

فیض نے مروجہ اصناف سخن اور اُسلوب بیان میں محض جزوی رد و بدل کر کے اُسے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور فیض کی اُفتاد طبع ہیئت کے میدان میں قافیئے اور بحر کی پابندی کے ساتھ ھی مکمل اظہار پر قادر ہے ۔ انتخاب الفاظ میں اُس نے مروجہ الفاظ و تراکیب کو نئی جھلک عطا کی ۔ چنانچہ قفس ، صیاد ، نور ، ساقی ، گلشن ، ناصح ، محاسب وغیرہ جیسے الفاظ میں ھی اُس نے سیاست و رومانیت اور عشق و انقلاب کا امتزاج پیش کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کا کلام اکثر جدید شعرا کے کلام کی طرح بعید از فہم و نا مانوس نہیں ہے بلکہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ فیض کے اس احترام روایت نے اُس کی شاعری میں اور چار چاند لگا دئے ہیں ۔

غرض صوری و معنوی دونوں لحاظ سے فیض کی شاعری اُن کی ابتدائی شاعری کے مقابلے میں زیادہ بہتر و اہم ہے ۔ اب اُن کی شاعری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک قوت عمل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ۔ جو زندگی سے قربت پر دال ہے ۔ فیض کے کلام کی یہی خصوصیات ہیں جن کی بدولت آج اُن کا شمار ہند و پاکستان کے معروف شعرا میں ہونے لگا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

راز اُلفت چھپا کے دیکھ لیا — دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے — آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے　　اُن کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
''فیض'' تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

تیری رنجش کی انتہا معلوم　　حسرتوں کا مری شمار نہیں

تیری چشم الم نواز کی خیر　　دل میں کوئی گلا نہیں باقی

ساری دنیا سے دور ہو جائے　　جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی　　ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

گراں ہے دل پہ غم روز گار کا موسم
ہے آزمائش حسن نگار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابرِ سرِ کوہسار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ھجران یار کا موسم

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے
ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو "فیض" دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جسکے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ہر رگ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے
حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے
صبح گل ہو کہ شام مے خانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے
ذکر دوزخ بیان حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

عجزِ اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
بزم اہل طرب کو شرماؤ
بزم اصحابِ غم کی بات کرو
بام ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمت چشم نم کی بات کرو
ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم یا کرم کی بات کرو
خیر ہیں اہل دہر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو
ہجر کی شب تو کٹ ہی جائیگی
روز وصل صنم کی بات کرو
جان جائینگے جاننے والے
فیض، فرہاد و جم کی بات کرو

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں، مائل بہ کرم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن دیں، راحت جاں ٹھہری ہے
ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سر کوئے بتاں ٹھہری ہے
ہے وہی عارض لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اک دفعہ بکھری تو ھاتھ آئی ہے کب موج شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دست صیاد بھی عاجز ، ہے کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یوں ھی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
''فیض'' گلشن میں وھی طرز بیاں ٹھہری ہے

منظومات

تنہائی

پھر کوئی یاد آیا دل زار ! نہیں کوئی نہیں
راھرو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئیگا !

''مجھ سے اگلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''

مجھ سے اگلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غم دھر کا جھگڑا کیا ہے ؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہیں ہر کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوّروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکس رخ یار سے مہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اُمید کا ہنگام

اُمید کہ لو جاگا غم دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اُس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حِنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھوٹے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکر دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اُس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق سے آسائش منزل
رخسار کے غم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کئے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا ، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں کوئی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں ، راحت تن ، صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سر گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوڑی نہیں اپنوں نے کوئی طرز ملامت
اس عشق ، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

موضوع سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلیگی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور — مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور — اُن ہاتھوں سے مس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہاتھ
اُن کا آنچل ہے ، کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں ؟

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

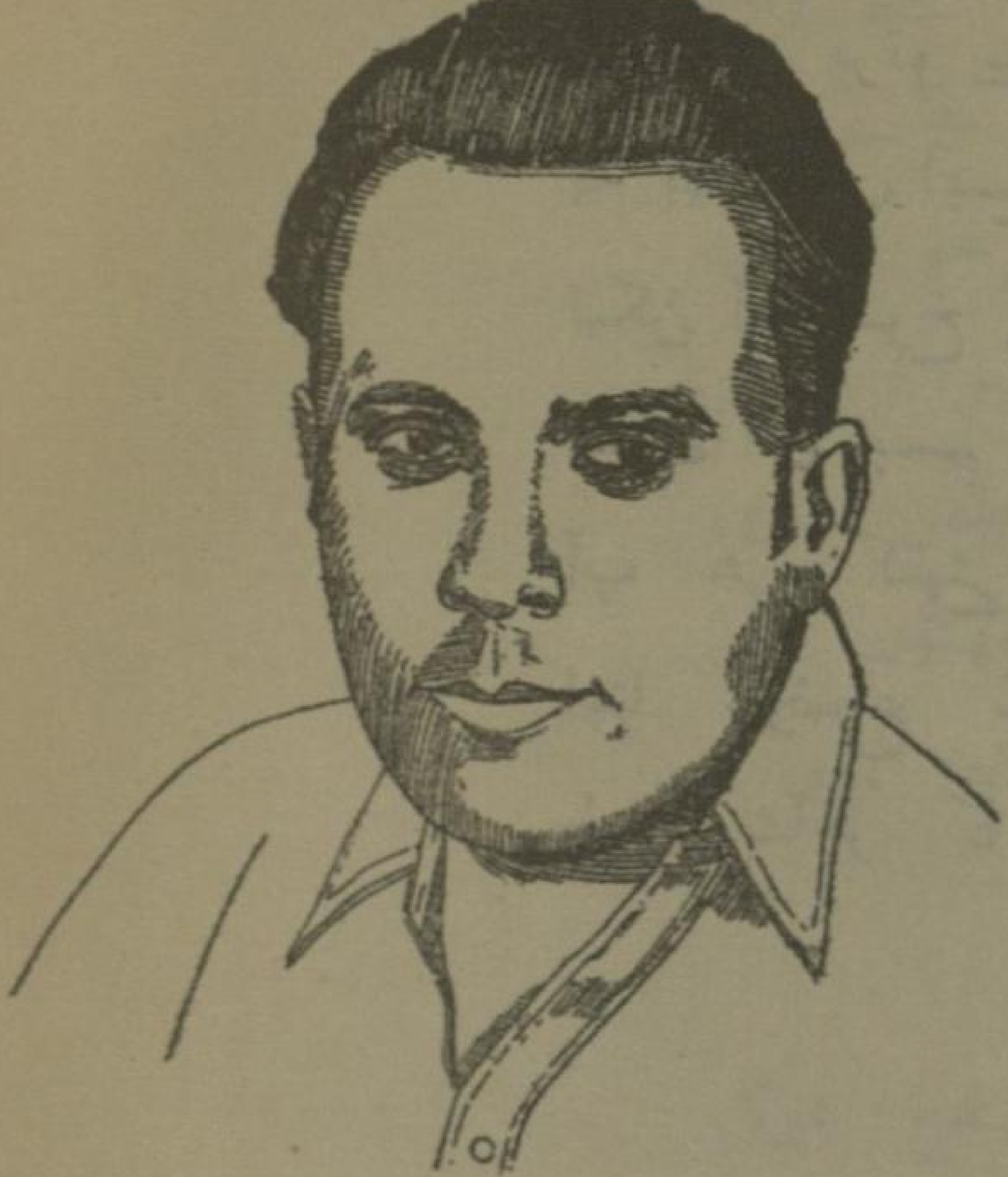
اپنے افکار کی ، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی ، شاہد معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے ؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی ، اجداد پہ کیا گزری ہے ؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے ؟
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے ؟

یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دلاویز خطوط !
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں !
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں !

عبدالحمید عدم



سید عبدالحمید نام عدم تخلص جون ۱۹۰۹ء میں قصبہ ''تلونڈی موسیٰ خاں'' ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے ۔ یہ قصبہ گجرانوالہ سے چار کوس کے فاصلہ پر آباد اور عدم صاحب کے آبا و اجداد کا وطن مالوف ہے ۔ عدم صاحب کے اکثر مورث اعلیٰ محکمۂ فوج سے منسلک رہے چنانچہ اُن کے دادا سید مہتاب شاہ بھی فوج میں صوبیدار تھے ۔ لیکن اُن کے والد نے فوج کی ملازمت نا پسند کرتے ہوئے لاہور آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ بنا بریں حضرت عدم کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی ۔ ۱۹۲۶ء میں اُن کے والد ماجد کا انتقال ہوا ۔ یہ زمانہ عدم کے لئے بڑی پریشانیوں کا تھا ایک طرف تو سولہ سترہ برس کے کم عمر طالب علم پر گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بار آ پڑا دوسری طرف اقتصادی مشکلات نے اُن گھیرا ۔ اس کشمکش کے عالم میں عدم نے اپنے گاؤں کی جائیداد کو فروخت کر کے تعلیمی نیز دیگر ضروری اخراجات کی کفالت کی ۔

شعر و شاعری سے دلچسپی اگرچہ زمانہ طالب علمی میں بھی تھی لیکن عدم کی شعر گوئی کی ابتدا انٹرنس پاس کرنے کے بعد یعنی ۱۹۲۷ء سے ہوتی ہے ۔ اور اس معاملے میں اُنہوں نے اپنے فطری وجدان و ذوق سلیم کی رہنمائی کو غنیمت جانا ہے ۔ اُستادی شاگردی کے جھگڑے میں وہ نہ پڑے ہیں اور نہ ہی اس کے قائل ۔ ۱۹۲۷ء میں ہی عدم کی شادی ہو گئی اور متاہل زندگی کی روز افزوں ضرورت و مصروفیات نے اُنھیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں آپ آڈیٹر کی حیثیت سے ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی ۔ آپ آج بھی اس شعبہ سے منسلک ہیں ۔

عدم پاکستان کے چند چوٹی کے غزل گو شعرا میں سے ہیں ۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو دن رات حسابات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے وہ تغزل کا ایسا ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق کیسے رکھتا ہے ۔ بات در اصل یہ ہے کہ عدم ایک فطری شاعر ہیں اور شعریت سچ مچ اُن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے ۔ اور اب تو جس منزل سے عدم گزر رہے ہیں اُس میں اُن کا احساس جمال اُنھیں حسن رہگزر سے بھی کیف اندوز ہونے میں مانع نہیں آتا ۔

آنکھوں میں اشارے ہیں
ہونٹوں میں شرارے ہیں
زلفوں میں ستارے ہیں
لاہور کی گلیوں میں

عدم نے یوں تو نظم، غزل، گیت و قطعہ وغیرہ بہت سی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے بالخصوص شروع میں اُنھوں نے نظمیں زیادہ کہیں اور اُن کی نظمیں بڑی جان دار ہیں۔ لیکن عدم کا خاص سرمایۂ کمال اُن کا تغزل ہے۔ اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ جہاں حسن کی بے پناہ پرستاری اور عشق کی شوریدہ سری جمع ہو جائیں وہاں تغزل کا جنم لینا لازمی ہے۔ عدم نے غنائیت و تغزل کی لے وہاں سے پکڑی ہے جہاں اقبال کے بعد چند جدت پسند شاعروں نے اُسے چھوڑا تھا۔ اور اُس میں کچھ نئی باتیں پیدا کی ہیں۔ عدم خود بھی ایک رند مشرب انسان ہیں چنانچہ اُن کی رندی و سر مستی نے اُن سے خمریات خوب خوب کہلوائی ہیں۔ اُن کے تغزل کے اس رنگ کو دیکھ کر یادش بخیر ریاض خیر آبادی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی رندی و سرمستی وہ خصوصیت ہے جو عدم کے جملہ کلام پر حاوی ہے۔ عدم نے اُردو شاعری کی روایت سے حاصل شدہ ماضی کے سرمایہ کو اور بھی جلا دے کر پیش کیا ہے اور اُس میں اپنے سوز و گداز، شعریت، شوخی، بذلہ سنجی، طنز اور کیف و سرور سے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

سر زمین پنجاب میں اختر شیرانی کے بعد صحیح معنوں میں اگر کسی کو رومانی شاعر کہا جا سکتا تو وہ عدم ہی ہیں۔ اُن کی طبیعت میں ایک صحت مند رومانیت کا احساس ملتا ہے۔ اسی لئے وہ حسن کی ہر ادا میں ایک عجیب رنگینی اور بانکپن تلاش کر لیتے ہیں۔ اور یہی صحت مند رومانیت عدم و اختر شیرانی میں مابہ‌الامتیاز چیز ہے۔ اختر مرحوم نے یاد سلمیٰ میں جوانی تو گنوائی تھی لیکن ساتھ ہی شاعری کو بھی اک روگ لگا لیا تھا اور اُن کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے برعکس عدم کے یہاں رومانیت و پناہ گزینی تو ہے مگر اُن کے رومان میں ایک بشاشت و شادابی ہے۔ جو اُنہیں ہر دم جواں و پیہم دواں رکھتی ہے۔ جو یقیناً ایک اچھی علامت ہے۔

عدم ایک ہشاش بشاش اور بڑے شگفتہ مزاج انسان ہیں۔ اور اُن کی زندگی یاران بذلہ سنج کی محفل میں لطیفوں، چٹکلوں اور قہقہوں کی زندگی ہے۔ بنا بریں اُن کی شاعری میں ہمیں کسی مرحلہ پر بھی کوئی گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کی تمام شاعری پر خوشی، نرمی اور شگفتگی کی ایک لہر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عدم کوئی اُونچے ٹھاٹھ کے شاعر نہیں اور نہ ہی اُن کے یہاں کوئی رومانی یا حکیمانہ گہرائی پائی جاتی ہے مگر یہ بھی تو کوئی ضروری نہیں کہ ان چیزوں کا مطالبہ بھی عدم سے ضرور کیا جائے۔ عدم کا اپنا ایک منفرد

رنگ ہے جس میں گداختگی و بے ساختگی دونوں کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اُردو شاعری میں سلیس، رواں اور بے تکلف انداز بیان کے علم بردار ہیں اور عدم کا فن زیادہ تر دل سے متعلق ہے کیونکہ اُن کے نزدیک دلوں پر حکم چلانا ہی شہر یاری ہے۔

عدم کو زبان و بیان دونوں پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ آنہیں ترنم ریز و خوبصورت بحروں کے انتخاب میں بھی بڑا ملکہ ہے۔ اُن کی تشبیہات، استعارات اور تراکیب میں حسن و دلکشی کے ساتھ اکثر ندرت اور ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ مختصراً اُن کے کلام کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے تخیل، داغ کی شوخی و سادگی اور ریاض کی رندی و سرمستی نے عدم کی شاعری کو جلا دی ہے اور موجودہ دور میں وہ بلا شبہ ایک نمائندہ غزل گو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عدم کا سب سے پہلا مجموعہ کلام ''نقش دوام'' تھا۔ اُس کے بعد سے اب تک اُن کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں

خرابات، شہر خوباں، پیچ و خم، قول و قرار اور گردش جام

انتخاب کلام

غزلیات

تسکین کی صورت کیا ہوگی، آرام کا امکاں کیا ہوگا
جو درد کہ جزو ہستی ہے، اُس درد کا درماں کیا ہوگا

کلیوں کی نگاہیں حیراں ہیں، غنچوں کے تصور ویراں ہیں
آغاز بہاراں کے صدقے انجام بہاراں کیا ہوگا

اک رات تیری شمع شبستاں رہا ہوں میں
احساس زندگی سے فروزاں رہا ہوں میں

اک عمر معصیت کو سمجھتا رہا ہوں عیب
اک عمر زندگی سے گریزاں رہا ہوں میں

غم جاناں بھی گو اک حادثہ ہے غم دوراں سے فرصت ہو گئی ہے

وقت جوں جوں رائیگاں ہوتا گیا زندگی کو کام یاد آنے لگے

کتنے حسین عزم تھے جو دل سے مٹ گئے کتنے صنم کدے تھے جو برباد ہو گئے
میری نظر سے بجھ گئے جلتے ہوئے چراغ تیری نظر سے میکدے آباد ہو گئے
دو مستقل ضدوں کی کشا کش تھی زندگی آباد ہو گئے کبھی برباد ہو گئے

میں اور تری نگاہ عنایت کی آرزو صدمہ نہ ہو مزاج غم روزگار کو
کس نے غرور صبح قیامت بنا دیا تھوڑا سا طول دے کے شب انتظار کو
دنیا ہے اعتماد پہ قائم تو اے ''عدم''
دینا پڑے گا کوئی فریب اعتبار کو

کیا کریں مہ وشوں سے پیار ''عدم'' بت پرستی ہے ' لوگ کہتے ہیں

چاندنی رات میں وہ اس طرح خوابیدہ ہے
جیسے ٹھہرا ہوا اک نغمۂ رقصیدہ ہے
دل ہو بیدار تو تجھ پر بھی یہ ظاہر ہو جائے
غم جسے کہتے ہیں اک عشرت بالیدہ ہے

کچھ اس ادا سے نسیم بہار گزری ہے
کہ جیسے رحمت پروردگار گزری ہے
وہاں وہاں ابھی رقصاں ہے بوئے عنبر و عود
جہاں جہاں سے چمن میں بہار گزری ہے
حیات نام ہے جس بیقرار بجلی کا
مرے غبار سے بھی شعلہ بار گزری ہے

ترا درد آرام جاں ہو رہا ہے نشاط غم جاوداں ہو رہا ہے
مری داستاں کچھ تو رنگین ہوگی کوئی شامل داستاں ہو رہا ہے

آن کے وعدے کی بات کیا کہئے ہاں بہت استوار ہوتا ہے

جو نفس تیری یاد میں گزرے بندگی میں شمار ہوتا ہے
اُن پہ گو ہم یقیں نہیں کرتے پھر بھی کچھ اعتبار ہوتا ہے
زندگی ہے ''عدم'' گناہ نہیں
کس لئے شرمسار ہوتا ہے

ساقی کے التفات سے کچھ بات بن گئی ورنہ حیات و موت میں کس کو تمیز تھی

منت چارہ ساز کیا کیجئے زخم خود بھی تو بھر ہی جائیں گے

صدمۂ بیدارئی احساس تھا یا موت تھی
باغ میں کلیاں چٹکتے ہی پریشاں ہو گئیں
ذہن فطرت میں تھیں جتنی ناکشودہ اُلجھنیں
ایک مرکز پر سمٹ آئیں تو انساں ہو گئیں

ٹھہر ٹھہر گردش زمانہ ، سنبھل سنبھل شورش حوادث
ذرا جوانی کی داد دے لوں ، ذرا حسینوں سے پیار کر لوں
کروں گا جی بھر کے تجربے زندگی کی ہر لذت نہاں کے
میں اپنے ذوق گناہ کو اے ''عدم'' ! ذرا اُستوار کر لوں

جنوں اب منزلیں طے کر رہا ہے خرد رستہ دکھا کر رہ گئی ہے

آ گیا تھا اُن کے ہونٹوں پر تبسم خواب میں
ورنہ اتنی دلکشی کب تھی شب مہتاب میں
اک طلسم شوق ٹوٹا ، اک مرتب ہو گیا
خواب سے چونکے تھے لیکن سو گئے پھر خواب میں
اُس حسیں کی نیند کا عالم کچھ ایسا ہے ''عدم''
بتکدے کی چاندنی جیسے لباس خواب میں

غم حیات کو کچھ خوشگوار کر لوں گا
تری جفاؤں سے تھوڑا سا پیار کر لوں گا
کبھی تو دیر و حرم سے تو آئیگا واپس
میں میکدے میں ترا انتظار کر لوں گا
تری نگاہ کی گردش نے دی اگر فرصت
علاج گردش لیل و نہار کر لوں گا
"عدم" بہت ہی اگر روٹھنے لگی آمید
کسی کے وعدے پہ پھر اعتبار کر لوں گا

تو لطف تماشا لیتا جا ، مت ڈھونڈ سراغ اصلیت
تخلیق کے صورت خانے میں ، کچھ وہم ہے کچھ سچائی ہے

کلی بہار کے انجام سے نہیں واقف
وگر نہ اتنی خوشی سے چٹک کے پھول نہ ہو

کچھ منفعل وفائیں ہیں کچھ مضطرب خیال
جن کی نوازشوں سے جئے جا رہا ہوں میں
جاتا ہوں بزم حشر میں اس بے دلی کے ساتھ
جیسے کسی رقیب کے گھر جا رہا ہوں میں
کہہ دو جہان غم سے توقف کرے "عدم"
دم لے کے میکدے میں ابھی آ رہا ہوں میں

امروز کی ظلمت میں ساقی فردا کے اشارے ڈوب گئے
یا چاند ستارے نکلے تھے ، یا چاند ستارے ڈوب گئے
کشتی کا پہنچنا ساحل تک ، دریا پہ وہ دلکش تہمت تھی
طوفاں نے کچھ ایسی کروٹ لی سب گھاٹ کنارے ڈوب گئے
کچھ لوگ خود اپنی کوشش سے طوفان کی زد سے بچ نکلے
کچھ لوگ مگر ملاحوں کی ہمت کے سہارے ڈوب گئے
احساس کا پہلا شعلہ ہی جاگا تھا ابھی سینے میں "عدم"
بے رحم صراحی ٹوٹ گئی ، بے فیض ستارے ٹوٹ گئے

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہ شوق میں
منزل تمام عمر ہمیں ڈھونڈتی رہی

ثابت رہے گا کس کا گریباں بہار میں
گلشن میں اڑ چلی ہے کسی گلبدن کی بات

سوال کر کے میں خود ہی بہت پشیماں ہوں
جواب دے کے مجھے اور شرمسار نہ کر
''عدم'' کی تشنہ لبی کو کچھ اور ہے مطلوب
شراب دے مگر اندازۂ خمار نہ کر

زمانے کو پرکھ کر بات کرنا ہر اک انسان دیوانہ نہیں ہے
''عدم'' آباد ہیں دل میں بیاباں خدا کا شکر ویرانہ نہیں ہے

ہمیں جب بھی اسیر بے دلی ہوتے ہوئے دیکھا
ترا وعدہ فریب جنت فردا اٹھا لایا
پریشاں رنگ، ویراں نکہتیں، ڈوبے ہوئے نغمے
گلستاں سے ہجوم بے خودی کیا کیا اٹھا لایا

بھٹک گئے کہ ہمیں راہ کا شعور نہ تھا حریم ناز ترا ورنہ اتنی دور نہ تھا
ازل کے دن بھی بصارت کی کیفیت تھی یہی شراب پینے سے پہلے نظر میں نور نہ تھا
''عدم'' یہ راز بڑی دیر سے کھلا ہم پر
وہ جام جام نہیں تھا جو چور چور نہ تھا

دل کے معاملات میں سود و زیاں کی بات
ایسی ہے جیسے موسم گل میں خزاں کی بات
نیرنگئی زمانہ کا چہرہ اتر گیا
چھیڑی تھی ہم نے شوخئی عمر رواں کی بات
اٹھ کر تری گلی سے کہاں جائیں اب فقیر!
تیری گلی کے ساتھ ہے اب جسم و جاں کی بات

اب شدت غم میں مصنوعی آرام سہارا دیتا ہے
یا دوست تسلی دیتے ہیں یا جام سہارا دیتا ہے
اے دوست محبت کے صدمے تنہا ہی اٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتا ہے
بیتابیٔ دل کی کیفیت اس حال تک اب آ پہنچی ہے
جس حال میں ہر مایوسی کو انجام سہارا دیتا ہے

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا
میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

ان مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں
ساقی ! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا رد عمل کہہ گیا ہوں میں
قسمت کی الجھنوں کو ''عدم'' کس گریز سے
اس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے
نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

حوادث روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے
ترا تبسم فروغ ہستی تری نظر اعتبار مستی
بہار اقرار کر رہی ہے ، شراب ایمان لا رہی ہے
خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے ''عدم'' کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روشن روش ہے آخر دلوں کو رستہ دکھا رہی ہے

جملہ اسباب جہاں پر ہے تغیّر حاوی
اک محبت ہے کہ ہر وقت جواں رہتی ہے

اے دل کبھی کبھی تو خود آتی ہے اُن کی یاد
کمبخت بار بار نہ آئے تو کیا کروں

یہاں کچھ راہرو ایسے بھی ہیں جو جادہ پیما ہیں
نہ رہبر کے اشارے پر، نہ منزل کے سہارے پر
محبت اک مقدس شکل ہے آتش پرستی کی
پتنگے جی رہے ہیں شمع محفل کے سہارے پر

تاروں میں روشنی ہے نہ پھولوں میں باس ہے
جو کچھ بھی ہے تکلف وہم و قیاس ہے
خوشبو اُڑی ہے رنگ کے پردے کو چیر کر
کہتے ہیں جس کو گل وہ جنوں کا لباس ہے

تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے
گلوں کو کِھل کے مرجھانا پڑا ہے

یہ ناز ہے کہ تری آرزو میں جیتے ہیں
یہ فخر ہے کہ ری ذات سے تعلق ہے
تعلقات کی غارت گری کا حال نہ پوچھ
کہ دن کے نور کا بھی رات سے تعلق ہے
''عدم'' خیال کی ہر قیمتی مسرت کا
خیال سے نہیں جذبات سے تعلق ہے

مرا جنوں تری آنکھوں سے کچھ ہوا رسوا
تری خبر مری مستی سے گاہ گاہ ملی

کہاں سے چل کے اے ساقی کہاں تک بات پہنچی ہے
تری آنکھوں سے عمر جاوداں تک بات پہونچی ہے
ابھی تو اُس کی آنکھوں نے لیا ہے جائزہ دل کا
ابھی تو ابتدائے داستاں تک بات پہنچی ہے

خرد فسانہ و تمثیل و خواب ہے ساقی — جنوں ہوائے شب ماہتاب ہے ساقی
ہے میکدہ وہ خلاصہ رموز دانش کا — جہاں حقیقت دریا حباب ہے ساقی
سمجھ گیا ہوں میں تیری نگاہ کا مطلب — نظر ہی رنگ ، نظر ہی شراب ہے ساقی

دونوں کو نگاہ جاناں نے تو قیر برابر کی بخشی
تا عمر خرد برباد رہی ، تا عمر جنوں معتوب رہا

ہم آشنا ہیں قیامت کی دلفریبی سے — ہزار بار تمہاری گلی سے گزری ہے
گذر تو خیر گئی ہے عدم حیات مگر
ستم ظریف بڑی بے رخی سے گزری ہے

غم جاں بخش کو آرام جاں کہنا ہی پڑتا ہے
کسی نا مہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے
بہار زندگی سے غم کا بھی گہرا تعلق ہے
کہ کانٹوں کو بھی جزو گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

ترے غم کا جو حاصل ہو گیا ہے — وہ دل جینے کے قابل ہو گیا ہے
بڑھا ہے درد جب اپنی حدوں سے — تو اکثر راحت دل ہو گیا ہے

میرا وعدہ تری نگاہ نہیں — اپنے وعدے پہ برقرار ہوں میں

طلوع حشر کا بھی کیا یقین ہے پیارے — دراز ہو تو شب انتظار ہے پیارے

دلچسپ ہو گئی ہے پریشانئی حیات — اے زلف عنبریں تری الجھن دراز ہو

قطعات

شام ہے اور پار ندی کے — ایک ننھا سا بے قرار دیا
یوں اندھیرے میں ٹمٹماتا ہے — جیسے کشتی کے ڈوبنے کی صدا

کتنی صدیوں سے عظمت آدم عجز فطرت پہ مسکراتی ہے
جب مشیّت کی کوئی پیش نہ جائے موت کا فیصلہ سناتی ہے

اک حرف اک طویل حکایت سے کم نہیں
اک بوند ایک بحر کی وسعت سے کم نہیں
نکلے خلوص دل سے اگر وقت نیم شب
اک آہ اک صدی کی عبادت سے کم نہیں

موت کا سرد ہاتھ بھی ساقی مجھ کو خاموش کر نہیں سکتا
ساز کا تار ٹوٹ سکتا ہے تار کا سوز مر نہیں سکتا

ایک ماں کے کشادہ سینے پر ایک ننھا سا ماہ پارہ ہے
زندگی کے ضعیف شانوں پر فرض کا بوجھ کتنا پیارا ہے

دفن ہیں ساغروں میں ہنگامے کتنی اجڑی ہوئی بہاروں کے
نام کندہ ہیں آبگینوں پر کتنے ڈوبے ہوئے ستاروں کے

بجھ گیا ہے بھڑک کے ایک چراغ گر گئی ہے چٹک کے ایک کلی
ایسی دلدوز مسکراہٹ سے موت کی پر سکون نیند بھلی !

منظومات

فطرت

کوہساروں کا یہ گاتا ہوا شاداب سکوت
یہ ہواؤں میں لرزتا ہوا رنگین خمار
یہ صنوبر کے درختوں کی بلندی کا وقار
بج رہا ہے مرے محبوب مرے دل کا ستار

تیری آنکھوں میں اُمنگوں کی شفق ہے لرزاں
جھانکتی ہے تری زلفوں کے دریچے سے بہار
جیسے مخمور گھٹاؤں سے ستاروں کی پھوار
تیرے ہونٹوں کی لکیریں ہیں کہ یا قوت کے تار
تیرے اعضا میں جوانی کے کنول ہیں روشن
میرے اعصاب میں سیماب کی لہریں ہیں رواں
دیوتاؤں کا تخیل ہے ترا جسم جواں
یا کسی شعر کے سانچے میں جوانی کی فغاں
دو اہم جزو ہیں فطرت کی ضرورت کے ہم
آ کہ فطرت کی مناجات سماعت کر لیں
مل کے لہروں کی طرح رقص محبت کر لیں
لب سے لب جوڑ کے تھوڑی سی عبادت کر لیں

گجر

اے ہمنشیں طلوع سحر کو سلام کر
لبریز مسکرا کے عقیدت کا جام کر
انساں ہے تیرا مسلک ہستی ہے ارتقا
یزداں و اہرمن کی قبا پر خرام کر
گوشہ اُٹھا ہر ایک صنم کے نقاب کا
دے روئے کائنات کو چھینٹا شراب کا
کہتے ہیں زندگی جسے سوز دوام ہے
آہنگ آفتاب کی لہروں کا نام ہے
رکتا نہیں کسی کے لئے کاروان وقت
منزل ہے جستجو کی نہ کوئی مقام ہے
اے مطرب شباب کہاں ترا ساز ہے
گیسو تری ضدوں کا ابد تک دراز ہے
محدود برگ گل کی مہک تک نہیں بہار
کانٹوں کی انکھڑیوں میں بھی ہے رنگ کا خمار
رکتا بھی ہے کبھی جسے کہتے ہیں حادثہ
تھمتی بھی ہے کہیں جسے کہتے ہیں جوئبار

ساحل بھی ایک نے ہے اگر کوئی سن سکے
اُمڈے ہوئے سکوت سے طوفان بن سکے
سہواً اگر حیات کی نبضوں کو کل پڑے
ہنس کر ضمیر سنگ سے چشمہ اُبل پڑے
نشتر اگر چبھے کسی رہرو کی سانس کا
صحرا کی چوب خشک مسرت سے جل پڑے

احساس درد خون رگ کائنات ہے
یہ مستقل شرار دلیل ثبات ہے
تاریخ کائنات کی نبضیں ٹٹول کر
خونیں تغیّرات کے اوراق کھول کر
سن تو سہی کہ غیب سے آتی ہے کیا صدا
الفاظ خود دکھائیں گے گرمی سے بول کر

کون و مکاں بھی وقت کے سیّال تیر ہیں
کولھو کے بیل کی طرح گردش پذیر ہیں
تعمیر و ریخت کام ہے اس کارگہ کا
منزل سے بے خبر ہے سفر مہر و ماہ کا
چکی کے دور میں ہے عناصر کا ہست و بود
انسان معرکہ ہے ثواب و گناہ کا

سورج کی موت زندگئی ماھتاب ہے
گرمی ڈھلے تو نکہت برگ گلاب ہے
ہے خبط انہدام میں تعمیر نو کا ھاتھ
تنظیم گامزن ہے تباھی کے ساتھ ساتھ
اک سمت خندہ زن ہے خدا وند آشتی
اک سمت غیض بار ہے بربادیوں کا ناتھ

اک دوش پر جنازہ ہے اک دوش پر سبو
طاؤس ناچتے ہیں مزاروں کے روبرو
شاھوں کی تمکنت بھی ہے اک جشن رھگزار
شہزادیوں کا بند قبا بھی ہے تار تار
سرمایہ حیات ہے اک حسن زھر خند
مرنے پہ اختیار نہ جینے پہ اختیار

ساقی اٹھا بھی جھوم کے ساغر شراب کا
بجتا رہے گا یوں ہی گجر انقلاب کا

دھواں

یہ با وقار مفکّر یہ فلسفی شاعر
بہت بلند فضاؤں میں پھڑپھڑاتے ہیں
میں ان کے حلقہ صحبت میں بیٹھتا ہوں جب
عجیب قسم کے مجھ کو خیال آتے ہیں
زمیں پہ جانے قدم ان کا کیوں نہیں لگتا
کہ عرش پار کے اکثر سراغ لاتے ہیں
سمجھ میں بات کوئی ان کی آ نہیں سکتی
ہر ایک بات میں ابہام تھر تھراتے ہیں
کبھی فرشتے ہیں ان کی تلاش میں بے حال
کبھی یہ اپنے تجسس میں آپ جاتے ہیں
چمن کے پھول ' ہوا کا خرام' گل کی چٹک
ہر ایک زندہ مسرت سے خوف کھاتے ہیں
کبھی خدا نہ کرے مسکرائیں بھی یہ بزرگ
تو کس قبیح متانت سے مسکراتے ہیں
رباب زیست کے آتش مزاج تاروں پر
غلاف برف زدہ فکر کے چڑھاتے ہیں
ہے مرگ فکر وہ مردہ بلند پروازی
کہ جس سے زیست کے اعصاب اینٹھ جاتے ہیں

یہ فلسفے کی تحیّر فروز تاویلیں
یہ نفع بخش ادب کی علیل قندیلیں
یہ زاویوں کے تلاطم یہ تجزیوں کے غبار
یہ مُردہ مُردہ کنائے یہ سرد تفصیلیں
ذرا سی دیر اگر ہمنشیں یہاں ٹھہریں
یہ اونگھتے ہوئے ماحول خون ہی پی لیں

غبار علم و تصوف کا ذہن میں لے کر
میں جب بھی محفل اہل خرد سے آتا ہوں
تو ایک آہ تسلی کی بھر کے ' ریحانہ !
ترے دریچۂ رحمت میں بیٹھ جاتا ہوں

کہ یہ مقام وہ زندہ مقام ہے جن میں
کوئی مری ہوئی تخئیل آ نہیں سکتی
ترے تبسم رنگیں کے حرف حکمت پر
کوئی بجھی ہوئی تاویل چھا نہیں سکتی
بغیر صحبت اہل جمال کچھ بھی نہیں
وجود مذہب و فکر و خیال کچھ بھی نہیں

گائے جا (ایک گیت)

اے حسین مطربہ !

سادگی سے گائے جا
زمزمے بہائے جا
بجلیاں گرائے جا

پھول کی مہک ہے تو
جام کی کھنک ہے تو

اے حسین مطربہ !

چاندنی ہے رنگ میں
موج ہے آمنگ میں
تیرے انگ انگ میں

گیت ہیں رچے ہوئے
شور ہیں مچے ہوئے

اے حسین مطربہ !

روپ ایک پیاس ہے
کانچ کا گلاس ہے
دو دلوں کی آس ہے

کھیتیاں ہری رہیں
جھولیاں بھری رہیں

ماہرالقادری



منظور حسین نام ماہر تخلص ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں قصبہ کسیر کلاں ضلع بلند شہر (یوپی) میں پیدا ہوئے - منظور حسین آپ کا تاریخی نام ہے اور سلسۂ قادری سے روحانی نسبت رکھتے ہیں - آپ کے والد محمد معشوق علی صاحب بھی شاعر تھے اور ظریف تخلص کرتے تھے مگر کلام ظریفانہ نہیں تھا بلکہ حمد و نعت لکھا کرتے تھے -

ماہر صاحب نسباً قریشی اور حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد سے ہیں - آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مرحوم کی زیر نگرانی ہوئی - اُس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے - ۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے مگر نا کامیاب ہونے پر ۱۹۲۶ء میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا - پھر تلاش معاش میں بظاہر تعلیم ترک کر دی لیکن معناً مطالعے کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور بقول خود ''مطالعہ میری زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ رہا ہے - سینکڑوں راتیں چراغ کے سہارے بسر کی ہیں اور جو کچھ میرے ذہن و فکر کی تربیت ہوئی ہے اُس کو کثرت مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے'' - ماہر صاحب کو علوم و آداب سے فطرت مناسبت ہے - بنا بریں اُنہوں نے مذہب و تاریخ کا خاصا مطالعہ کیا ہے -

ماہر صاحب ابتدا میں کچھ دن روز نامہ مدینہ (بجنور) کی ادارت میں شامل رہے اور ہفتہ وار ''غنچہ'' کی زمام ادارت بھی آپ سے متعلق رہی - ۱۹۳۳ء میں آپ نے عراق کا سفر کیا جہاں دوسرے عمائد کے علاوہ ہزمجسٹی شاہ عراق (غازی الاول) مرحوم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل کیا - وہاں سے واپسی پر کافی عرصہ تک آپ کا قیام ریاست حیدر آباد میں رہا - یمین السلطنت سر مہاراج کشن پرشاد صاحب صدر اعظم حیدر آباد آپ کے حال پر خاص عنایت کی نظر رکھتے تھے - اس کے بعد ضرورت و حالات سے مجبور ہو کر آپ نے چندے بمبئی میں قیام کر کے فلمی گانے وغیرہ لکھے - لیکن جب آپ کی غیور و خود دار طبیعت نے یہ مشغلہ زندگی پسند نہ کیا تو آپ اسے چھوڑ کر دہلی چلے گئے - تقسیم ہند کے وقت آپ اپنے وطن قصبہ کسیر کلاں میں تھے کہ قرب و جوار کے اضلاع میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا - بارے بہزار دقت و دشواری آپ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے - جب سے کراچی میں مقیم ہیں اور ماہنامہ ''فاران'' نکالتے ہیں -

جناب ماھر کو شاعری میں کسی سے تلمذ نہیں اور نہ ھی آپ اصلاح سخن کے قائل ھیں چنانچہ کثرت مطالعہ اور طبع رسا کی بدولت آپ نے اپنے کلام پر خود ھی اصلاح کی - آپ کے نزدیک شاعری کا وہ پہلو اہم ھے جس کے ذریعے قلب میں تسکین اور روح میں انقلاب پیدا ہو سکے - آپ اقتصادیات و معاشیات وغیرہ کی رھنمائی سے شاعری کو بالا تر سمجھتے ھیں - یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ ابھی حال ھی میں ''اسلامی ادب'' کی جو تحریک پاکستان کے مختلف جرائد میں شروع ھوئی تھی اس کے بانی مبانی ماھرالقادری صاحب ھی تھے -

حضرت ماھر بڑے ذھین و طباع انسان ھیں مذھب ' تاریخ ' سیاست ' ادب وغیرہ سے آپ کو خاصا لگاؤ ھے اور شاید یہی وجہ ھے کہ آپ کا کلام بہت ھی متنوع ھے - لیکن چونکہ روحانیت ورثہ میں پائی ھے اور بزرگوں سے عقیدتمندی اور مذھب کی پابندی آپ کے کردار کی خصوصیت رھی ھے اسلئے آپ کے کلام میں روحانی عنصر نسبتاً زیادہ ھے - اس کے ثبوت میں آپ کی ایک مستقل تصنیف ''ذکر جمیل'' پیش کی جا سکتی ھے جس میں آپ کا نعتیہ کلام شائع ھوا ھے -

ماھر صاحب یوں تو ھر صنف سخن پر عبور رکھتے ھیں مگر خصوصیت کے ساتھ نظم و غزل کہتے ھیں - آپ کے رنگ تغزل میں بے اعتدالی نام کو نہیں اور اکثر اشعار بڑے صاف ستھرے اور پاکیزہ ھیں لیکن وہ سرمستی و گداختگی جو غزل کی جان سمجھی جاتی ھے آپ کی غزلوں میں خال خال ھی ملے گی - البتہ نظم گوئی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ھے - آپ کی منظومات میں فکر و نظر ' علم و حکمت ' جذبات نگاری اور منظر نگاری وغیرہ کے بڑے اچھے نمونے ملتے ھیں اس پر روانی الفاظ ' ترکیب کی چستی اور زبان کی سلاست کلام کو اور بھی دلپذیر بنا دیتی ھے - آپ کے کلام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں معلوم ھوتی ھے وہ مضامین نو کی بہتات اور تنوع ھے لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر چیز یہ ھے کہ ماھر صاحب نے ھر موضوع پر بڑی چابکدستی کے ساتھ قلم اٹھایا ھے اور کہیں ثقالت یا گرانی پیدا نہیں ھونے پاتی بلکہ ھر جگہ کلام میں روانی و ھمواری پائی جاتی ھے -

آپ کی منظومات میں بعض بڑی اچھی رومانی نظمیں بھی ھیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا مذھب و تاریخ سے چونکہ ماھر صاحب کو خاص شغف ھے اسلئے آپ کی اکثر نظمیں مجاھدین اسلام کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق ھیں اور آپ کی ایسی نظموں میں صداقت و جوش کا پہلو ایک امتیازی شان رکھتا ھے - حضرت ماھر کو ' جیسا کہ ھونا بھی چاھئے تھا ' علامہ اقبال مرحوم سے بڑی عقیدت معلوم ھوتی ھے اور ان کا اثر بھی آپ نے بڑی حد تک قبول کیا ھے -

ماھر صاحب نے نظم و نثر کی کم و بیش بائیس کتابیں تصنیف کی ھیں - لیکن نثری کاوشوں کے علاوہ ''محسوسات ماھر'' ''جذبات ماھر'' ''نغمات ماھر'' اور ''ذکر جمیل'' آپ کے کلام کے وہ مجموعے ھیں جو ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور جن کی مقبولیت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ھے کہ ان میں سے ھر مجموعے کے کئی کئی ایڈیشن شائع ھو چکے ھیں -

انتخاب کلام

تغزل

لے لیا ہے فضائے محشر نے ایک ٹکرا مری کہانی سے
آرزو کو سمجھ رہا ہے رقیب تنگ ہوں دل کی بدگمانی سے

میں نے مانا کہ ہے جنت دلکش کوچۂ یار اگر یاد آیا
پھر شب ہجر نے کروٹ بدلی پھر ترا خواب سحر یاد آیا

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

میں قائل ہوں دیر و حرم کا بھی لیکن یرا آستاں پھر ترا آستاں ہے

آرزو اک فریب باطل ہے عشق خود عشق ہی کا حاصل ہے
مختلف ہیں حیات کے پہلو موت اک زندگی کی منزل ہے
نبض امید چھٹ گئی شاید آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے
درد بدنام، تمنا رسوا عشق، رسوائی ہی رسوائی ہے
اس نے پھر یاد کیا ہے شاید دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے
ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے چشم آئینہ تماشائی ہے

چمن میں سوگ ہے اس بد نصیب غنچے کا
جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

اے رہرو منزل محبت! ہر ذرہ نگاہ چاہتا ہے

نبض دل ڈوبتی جاتی ہے طبیعت ہے نڈھال
مجھ سے پھر درد محبت نے کوئی کام لیا

دل دیا، دل کو لذت غم دی ساری آفت مجھی پہ ڈال گئے
مجھ کو بیدل بنا کے وہ ''ماہر'' حسرت زندگی نکال گئے

تمنا پاک، دل معصوم، فطرت کس قدر سادہ
محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے

آن کے آنے کا ہے یقیں لیکن حسرت بام و در کو کیا کہئے
ہر طرف درد کی خدائی تھی شام غم کی سحر کو کیا کہئے
عشق کی موت کس کو ملتی ہے فطرت نوحہ گر کو کیا کہئے

آنکھیں اداس، روح پریشان، دل نڈھال
برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں

میرے حال دل کی کس صورت سے رسوائی ہوئی
روک لی ظالم نے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی

وہ بھی دل کے ذکر پر ہنسنے لگے دور جا پہنچیں مری رسوائیاں

ڈھونڈا تو وہ کچھ دور نہ تھے حد طلب سے
دیکھا تو سر رہگذر یار ہمیں تھے

چمن میں میرے ہی تنکوں پہ ہر بجلی کی نظریں ہیں
مری قسمت کہ پھر میں نے بنائے آشیاں رکھدی

شب وعدہ وہ اب تک آ رہے ہیں ستارے ہیں کہ ڈوبے جا رہے ہیں

تیرے ہوتے ہوئے غم جاناں اور کس چیز کی ضرورت ہے
اس نے غم دے کے مجھ سے فرمایا یہ مری آخری عنایت ہے
کاش! ناصح کو بھی خبر ہوتی عشق تو آدمی کی فطرت ہے

کتنا مصروف ضبط آہ میں ہے دل ابھی قید رسم و راہ میں ہے

زندگی جب عذاب ہوتی ہے عاشقی کامیاب ہوتی ہے

وہ عربدہ جُو معصوم ادا قاتل بھی ہے اور قاتل بھی نہیں
دل اس کی ادائے سادہ کا بسمل بھی ہے اور بسمل بھی نہیں
وعدے پہ نہیں آتا سچ ہے، پر یاد تو اس کی آتی ہے
اس جان محبت کا وعدہ باطل بھی ہے اور باطل بھی نہیں
ہر دل ہے نشیمن ' کاشانہ ' اس پر بھی تباہ و ویرانہ
اس جان جہاں کے جلوؤں کی منزل بھی ہے اور منزل بھی نہیں
جو ڈوب گیا وہ پار اترا ' جو سطح پہ تھا وہ تر نہ سکا
دریائے محبت کا "ماہر" ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

دیر و کعبہ پہ کیا نظر ڈالیں ہم ترے آستاں سے آئے ہیں
نو اسیروں پہ رحم کر صیّاد! یہ ابھی آشیاں سے آئے ہیں
کچھ زمیں پر بپا ہوئے فتنے اور کچھ آسماں سے آئے ہیں
چند جھونکے قفس کی جانب آج جانے کیوں گلستاں سے آئے ہیں

عشق کی زندگی کو کیا کہئے اپنی قسمت! کسی کو کیا کہئے
اک ذرا سی امید پر یہ حال آدمی کی خوشی کو کیا کہئے
حسن پر اعتماد چارہ گری عشق کی سادگی کو کیا کہئے

دیکھتا ہوں وہ مہرباں ہیں آج   خواب کہئے اسے کہ بیداری

جب کوئی پھول مسکراتا ہے   مجھ کو دل کا خیال آتا ہے
پھر تصور نے دے دیا دھوکا   پھر کوئی سامنے سے آتا ہے

وہ نظر اُٹھی ، جھجک کر رہ گئی   پھانس سی دل میں کھٹک کر رہ گئی
مسکرا کر اُس نے پوچھا حال دل   بوند آنسو کی ڈھلک کر رہ گئی
کون دیتا ساتھ غم کی رات کا   شمع بھی آخر بھڑک کر رہ گئی
کتنی کیف آور تھی ساغر کی کھنک   آنکھ ساقی کی جھپک کر رہ گئی
کیا کہوں ماہر فسانہ دید کا
ایک بجلی سی چمک کر رہ گئی

منظومات

حرّیت کاملہ کا مبلغ اعظم

ذلیل جذبات کی فضا میں ضمیر خوابیدہ ہو چکا تھا
دماغ انساں کا ہر تخیل ہوس کی ظلمت میں گِھر چکا تھا
بیاض اخلاق منتشر تھی ، نظام بزم حیات برہم
غریب تھے ذلّتِ سراپا ، امیر تھے نخوت مجسم
جفا کے بادل گھرے ہوئے تھے ، گھٹا غلامی کی چھا رہی تھی
ستم کی بجلی تڑپ تڑپ کر وفا کا خرمن جلا رہی تھی
تباہیوں کا تھا اک مرقع ، غلام قوموں کا حال بد تر
رگوں میں نشتر ، چھری گلے پر ، ضمیر بیتاب ، روح مضطر
غریب پامال ہو رہے تھے جفا کے ہاتھوں کچھ اس طرح سے
کہ جیسے چٹکی میں کوئی لے کر گلاب کے پھول کو مسل دے
یہ ہم نے مانا ستم رسیدوں کی تھیں بہت دردناک چیخیں
مگر غرض تھی کسے جو سنتا حریم عشرت کے قہقہوں میں

پلٹ چکا تھا نظام عالم ، بدل چکی تھی فضائے دنیا
جہان ہستی کا ذرہ ذرہ ، طلسم اک نسل و رنگ کا تھا
غلام و آقا کے درمیاں تھی خلیج عجز و غرور حائل
ادھر جبیں عاجزی سراپا ، ادھر نظر میں غرور باطل
یہ دیکھ کر گرمئی معاصی خدا کی غیرت کو جوش آیا
امنڈ اٹھے رحمتوں کے چشمے ، ابل پڑے حریت کے دریا
فضا غلامی کی کانپ اٹھی ، اک انقلاب آ گیا جہاں میں
امارتوں کی بلندیوں نے جھکا ھی دیں خاک پر جبینیں
جھکی اخوّت کے آستاں پر مداین و نینوا کی سطوت
اتر گیا چشم خود سری سے خمار صہبائے قیصریت
گزر گیا حریت کا طوفاں ، غرور و نخوت کی چوٹیوں سے
ابھر کے پہنچیں بلندیوں پر غلام اقوام پستیوں سے
حبیب حق کے نثار جاؤں بدل دیا یوں نظام دنیا
کھڑے کئے ایک صف میں لا کر امیر و مفلس غلام و آقا
ادھر علی کے قریں اسامہ رض ، ابو ھریرہ رض کے پاس عثمان رض
ادھر عمر رض اور بلال رض حبشی ، جناب بو بکر رض اور سلمان رض
طلسم جبر و ستم کے توڑے ، مٹا دئے نقش ذلتوں کے
بتا دیا راز زندگی کا ، سکھا دئے گُر ترقیوں کے
ھوئی مساوات کی وہ بارش کہ بھر دئے جس نے دشت و صحرا
پہاڑ کے ھو گیا مقابل جہاں کا اک اک حقیر تنکا
بدل گئی نغمۂ طرب سے ستم رسیدوں کی آہ و شیون
کئے گئے عرصۂ جہاں میں اصول جمہوریت مدوّن
سلام اے حرّیت کے داعی سلام اے رحمت مجسم
سلام اے مرکز اخوت ، سلام اے رحمت دو عالم

صبح بہاراں

کانٹوں کی نوکیں رشک گل تر
پھولوں کا جوبن اللہ اکبر

ہر برگ رنگیں ہر گل معطر
دلکش تماشا دلچسپ منظر

صبح بہاراں

کلیوں کی چاندی شبنم کے گوہر
کرنوں کا سونا پھولوں کے زیور
کونپل کے جگنو پتوں کے جھومر
ہر چیز روشن ہر شے منور

صبح بہاراں

غنچوں کے تکمے سبزے کی مخمل
پھولوں کی جھالر شاخوں کا آنچل
آب رواں کی باریک مخمل
چمپا کا لچکا بیلے کی جدول

صبح بہاراں

قمری بھی چنچل تتلی بھی چنچل
پرواز پیہم رقص مسلسل
مستانہ بلبل بد مست کویل
الفت مجسم نغمہ مکمل ،

صبح بہاراں

جنت کی نزہت خاشاک و خس میں
کوثر کی موجیں، پھولوں کے رس میں
کلیوں کی سیجیں کنج قفس میں
سارا زمانہ مستی کے بس میں

صبح بہاراں

ہر سمت شادی ہر سو مسرت
ہر قطرہ کوثر ، ہر ذرہ جنت
سامان فرحت ، اسباب عشرت
مستی ، ترنم ، خنکی ، طراوت

صبح بہاراں

ہر شے پہ طاری، اک کیف مستی
زاہد کا ایماں صہبا پرستی
ساری خدائی رندوں کی بستی
نغمہ بھی ارزاں، مستی بھی سستی

صبح بہاراں

باد سحر کیا اٹھلا رہی ہے
پھولوں کے تلوے سہلا رہی ہے
خنکی دلوں کو گرما رہی ہے
ایسے میں اُن کی یاد آ رہی ہے

صبح بہاراں

نیند کے مارے اک دو شیزہ!

چاند کی رنگت پھیکی سی ہے، رات بھی ڈھلتی جاتی ہے
شمع بھی سوز دل کے ہاتھوں رنگ بدلتی جاتی ہے
سانس کی تیزی کیا کہیئے تلوار سی چلتی جاتی ہے
باد صبا ٹھوکر کھا کر ہر بار سنبھلتی جاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

نظم بھی ہے غزلیں بھی ہیں اور گیت بھی ہے تقریر بھی ہے
پھول بھی ہیں انگارے بھی ہیں پارہ ہے اکسیر بھی ہے
موسیقی کے زیر و بم ہیں اور ان میں تاثیر بھی ہے
نغمے کے طوفانوں میں ہر سانس جھکولے کھاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ماتھے کی نمناک لکیریں نور کا مینہ برساتی ہیں
ہونٹ ہیں گویا کچی کلیاں آنکھیں کچھ کچھ گاتی ہیں
خود ہی خود غزلوں پر غزلیں موزوں ہوتی جاتی ہیں
زلف کی بے ترتیبی رخ پر اور قیامت ڈھاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ہونٹ کی لالی کو گر دیکھے پھول کی پتی شرما جائے
آنکھ کی مستی جب چاہے پیمانے دل کے چھلکا جائے

حسن سراپا مستی ہے اور مستی کو کیا سمجھا جائے
پریم کی دھن میں مست جوانی گیت خوشی کے گاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

پیام

وہ تیغ ہے دراصل مسلماں کی وراثت
جو تیغ کہ اقوام کی تقدیر بدل دے
تو رزم کا خوگر ہے تجھے بزم سے کیا کام
تہذیب کے ہر پھول کو چٹکی سے مسل دے
پھر نان جویں مائل خیبر شکنی ہو
اے کاش ! خدا پھر تجھے توفیق عمل دے
کب تک خس و خاشاک کی الجھن میں رہے گا
طوفاں ہے تو الوند کی چوٹی سے گذر جا
دنیا تجھے مرنے کی بھی مہلت نہیں دے گی
ناموسِ محمدؐ پہ جو مرنا ہے تو مر جا

روشؔ صدیقی



شاہد عزیز صدیقی نام روشؔ تخلص ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالا پور ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ یہ مقام بقول روش صاحب مناظر فطرت کے لحاظ سے عجیب جگہ ہے اور قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ، گروکل کالج بھی یہیں ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولوی خلیل احمد شاہد ہے۔ روش صاحب کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور آپ نے ابتداً اردو و فارسی کی تحصیل کی، پھر ہندی، سنسکرت اور انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت پیدا کی۔ شعر و سخن سے انہیں فطری مناسبت ہے چنانچہ خود ان کے بیان کے مطابق سات سال کی عمر میں آغاز شاعری ہوا اور زندگی کے سب سے پہلے دو شعر یہ ہیں۔

یہ میرے ضبط محبت نے کی عجب تاثیر ــــ کہ ان کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو ــــ بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

روش صاحب کو تلمذ اگر کسی سے ہے تو وہ اپنے والد ماجد حضرت شاہد صاحب سے، ابتدائی دور شاعری میں انھوں نے صرف غزلیں کہیں لیکن ۳۲ء کے بعد سے ان کی نظم نگاری کا آغاز ہوا اور اب تو دونوں اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے اور خوب کہتے ہیں۔

حضرت روش جدید شعریت کے پیرو ہیں اور عصر حاضر کے رومانی شعرا میں انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن ان کی غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صنف میں بھی اچھے شعر نکال لیتے ہیں۔ تاہم چونکہ پوری توجہ نظم نگاری کی طرف ہے اس لئے غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس میں وہ پورے طور پر اپنے آپ کو واضح کر سکے ہیں۔

روش صاحب کے کلام کو دیکھ کر ان کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ سر تا پا احساس ہیں۔ بعض اوقات یہ احساس الفاظ کی صورت میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مگر ان ٹکڑوں میں اصل کی کچھ جھلک اور ایک

حسن ضرور ملتا ھے - آن کی منظومات رعنائی خیال ، شیرینی اور ترنم کے لئے خاص طور پر معروف ھیں - شکل و ھئیت کے اعتبار سے روش صاحب کی نظمیں آن کی شاعرانہ ذھنیت کا نتیجہ معلوم ھوتی ھیں اور ان میں آن کے جذبات ، احساسات اور خیالات کے پیچ و خم کا اظہار بھی بخوبی ھو جاتا ھے - بالخصوص ترجیع بند کے انداز کی نظموں میں جہاں وہ ایک مصرعہ کو بار بار لاتے ھیں آن کے طرز بیان میں ایک خاص حسن و دلکشی پیدا ھو جاتی ھے -

جناب روش کی نظم نگاری کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب رقم طراز ھیں - ''روش اپنی رومانیت میں اتنے گم ھیں کہ آن کے اقلیم سخن سے منظر نگاری یا واقعہ نگاری عموماً دور رھتی ھے - روش کی شاعری بنیادی طریقہ سے دور جدید کی پیداوار ھے - اور طبقۂ متوسط کو اپنی رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑتی ھیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے روش کے یہاں بیان ھو جاتی ھیں'' - اس کے علاوہ آن کی نظموں میں سیاسی و سماجی جکڑ بندیوں پر بھی اظہار خیال ھوا ھے لیکن آن کے سیاسی تصورات میں وہ بیداری و زور اور ایسی گرج اور چمک نہیں پائی جاتی جو جوش ، مجاز یا فیض وغیرہ کے یہاں ھے - اس کی وجہ غالباً یہی معلوم ھوتی ھے کہ وہ ان مسائل کو رومانیت کے نظریہ کے ساتھ پیش کرتے ھیں اور رومانی عنصر کے غالب ھونے کے باعث سیاسی حقیقت ایک آواز باز گشت کی صورت اختیار کر لیتی ھے - تاھم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنھوں نے دور حاضر کے سیاسی و سماجی مسائل کو اپنی منظومات میں جگہ دی ھے -

حضرت روش کی نظموں کی نمایاں خصوصیت آن کا تغزل اور روانی ھے اور ان خصوصیات کے تحت آن کی اکثر نظمیں بہت ھی قابل قدر ھیں - اس سلسلے میں آن کی ایک رومانی نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے -

کس نے جھانکا ھے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ھو شاید

زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ھے
آ گہی حسرت دیدار ھوئی جاتی ھے
کیوں یہ پیشانئی احساس جھکی جاتی ھے
حیرت عالم امکاں کو خبر ھو شاید

اس ایک بند سے ھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ھے کہ آن کے رنگ سخن میں تغزل کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ھوا ھے - وہ محبت کی دنیا میں سرشار ھونے کی کیفیت کو اس خوبی سے بیان کرتے ھیں کہ آن کے مقابلہ میں کم لوگ پیش کئے جا سکتے ھیں - آن کے اسلوب میں بلا کی دل نشینی ھے اور اس دل نشینی میں نرم ، لطیف اور مترنم الفاظ و تشبیہات کی بہتات اور بھی اضافہ کر دیتی ھے - لیکن بڑی حیرت کی بات ھے - کہ ان گونا گوں اوصاف کا حامل ھونے کے باوجود حضرت روش نے اپنا مجموعہ کلام اب تک نہیں چھپوایا حالانکہ آن کا جتنا کلام مختلف رسائل میں منتشر پڑا ھے کم از کم وھی اتنا ھے کہ ایک سے زائد مجموعے ضرور چھپ سکتے ھیں -

انتخاب کلام

تغزل

ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم
ترا مذاق ہی اے کاش جاوداں ہوتا
جو میں کرم نہ سمجھتا، ترے تغافل کو
تو بار بار یہ دل مجھ سے بد گماں ہوتا
ہزار طُور نگاہوں نے کر لئے پیدا
حجاب اُن سے بالاخر کہاں کہاں ہوتا

عشق کو داغِ دلِ زیست سمجھنے والے
دونوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا
کس کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا ''روش''
کسی عنواں سے مگر اُن کو بھلایا نہ گیا

ذوق یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا در جاناں بنا دیا
کیا کیا خیال زینت آغوش شوق تھے
تم نے تو سب کو خواب پریشاں بنا دیا
یہ بھی سب اُن کا حسن نوازش ہے اے ''روش''
غم ہی کو چارۂ غم پنہاں بنا دیا

وسعتیں پاتا گیا ذوق لطافت جس قدر
میں بعید جلوہ ہائے رنگ و بو ہوتا رہا

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعت دامان نظر پیدا کر

بہت بلند ہے دل کا مقام خود داری — مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے — ہنوز حسرت طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت — شکست دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں

محبت ایک بڑا مدعا ہے فطرت کا — خبر بھی ہے کہ محبت کا مدعا ہے تو

شرف عطا جو کیا تو نے ہمکلامی کا — زمانہ منتظر داستاں ملا مجھ کو

غم وفا تو کہانی نہ تھا مگر اے دل — بنا دیا تری خاموشیوں نے افسانہ
وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم — وہ آنکھ اٹھے تو برس جائے کیف میخانہ
ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں — تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ

مسافرِ رہِ اُلفت یہ شرط منزل ہے
کہ ہر قدم ہو ترا اور جہاں بے خبری
اب اشک دیدۂ بیتاب میں نہیں رکتے
ادھر نگاہ نہ کر اے ستارۂ سحری

غم پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
آہ! رہنے دو یہ انداز پریشاں نظری
مجھ تک آتی تھی کہاں نکہت گیسوئے نگار
وحشتِ عشق مبارک غم شوریدہ سری

بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی
یہ کیوں اکثر بہت شاداں دل نا شاد ہوتا ہے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

وہ اک تسکیں جو اب تک چارہ ساز درد الفت تھی
وہ تسکیں بھی شریک درد الفت ہوتی جاتی ہے
خموشی سے بھی بار ترجمانی اٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک روداد محبت ہوتی جاتی ہے
"روش" اب ہم ہیں اور راز و نیاز سوز محرومی
بہت محبوب شمع شام فرقت ہوتی جاتی ہے

نگاہ ناز میں ہلکا سا رنگ ناتوانی ہے
محبت کی کہانی ہے محبت کی زبانی ہے
بسائی ہے وہ دنیا ایک ناکام محبت نے
جہاں ہر نامرادی میں جمال کامرانی ہے
کسی کا لطف پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے
مری ناشادمانی انتہائے شادمانی ہے

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
ہائے اس بے خودی کو کیا کہئیے
ہے وہی رنگ حسن بے پروا
عشق کی سادگی کو کیا کہئے
کھینچ لے جائے جو ترے در تک
ایسی دیوانگی کو کیا کہئے
آن پہ قربان ہستئ کونین
ایک مری نظر کو کیا کہئے

اب عالم تغافل پنہاں کچھ اور ہے
ہر لمحہ رنگ شوق فراواں کچھ اور ہے
الطاف بر ملا کی تو کیا بات ہے مگر
رعنائی نوازش پنہاں کچھ اور ہے

جیسے کلیوں کا عالم محجوب
ہے کچھ ایسا ہی دوستی کا خلوص
موج خوشبوئے التفات آمیز
اس تغافل کی سادگی کا خلوص
پھر غنیمت ہے میکدے میں روش
کم سے کم رند مشربی کا خلوص

لب مینا پہ تھی کس شوخ کی بات
بہک نکلے ہیں رندانِ خوش اوقات
وہاں ہیں اب اسیران خرابات
جہاں ہے ہر قدم کشف الحجابات

زمانہ تھا، نہ ارباب زمانہ
یہ کس عالم میں گزرے چند لمحات
زباں چپ ہے مگر خاموش آنکھیں
کہے دیتی ہیں صدیوں کی حکایات
مری پلکوں پہ اب آنسو کہاں ہیں
یہ کیوں افسردہ ہے تاروں بھری رات
''روش''جادو تو کیا ہوتا غزل میں
مگر خوباں سے تقریب ملاقات

توڑ کر آٹھے ہیں جام و شیشہ و پیمانہ ہم
کس سے کہدیں آج راز نرگس مستانہ ہم
بجلیاں روپوش، طوفاں دم بخود، صحرا خموش
جا رہے ہیں کس طرف اے لغزش مستانہ ہم
اور جو کچھ ہے وہ سب آرائش افسانہ ہے
تو ہے افسانہ ہمارا اور ترا افسانہ ہم
زندگی اک مستقل شرح تمنا تھی مگر
عمر بھر تیری تمنا سے رہے بیگانہ ہم
تجھ میں بھی کچھ ہوشمندانہ ادائیں آ گئیں
تجھ سے بھی اب بد گماں ہیں اے دل دیوانہ ہم
خشک آنکھیں، دل شکستہ، روح تنہا، لب خموش
بستیوں میں دیکھتے ہیں صورت ویرانہ ہم
ہم تک اب آئے نہ آئے دور پیمانہ ''روش''
مطمئن بیٹھے ہیں زیر سایۂ میخانہ ہم

کیوں تشنۂ شوق تک رہے ہیں
ساقی کے قدم بہک رہے ہیں
خوشبوئے حبیب ہے خراماں
سب ارض و سما مہک رہے ہیں
خوننابہ فشاں ہیں دیدہ و دل
کیا جام و سبو چھلک رہے ہیں
بس ایک ہی سمت ہیں نگاہیں
ہر چند قدم بھٹک رہے ہیں

ہجوم تمنا سے کیا ہو گیا
وہ کچھ اور نا آشنا ہو گیا
چلے تھے زمانے سے منہ پھیر کر
یکایک ترا سامنا ہو گیا
تغافل میں بھی اس قدر احتیاط
تری بے نیازی کو کیا ہو گیا

وھیں لٹ گیا کاروان حیات	جہاں سے ترا غم جدا ہو گیا
یہاں ایک سے ایک اجنبی ہے	الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا

منظومات

شاھد معصوم

بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

محفل آرائے وفا تو اور میں ننگ وفا
دل مرا تاریک ہے تو بحر انوار و ضیا
رھرو منزل ھوں میں اور تو ہے گردوں آشنا
نور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

میرے آنسو تیرے زریں ھار کے قابل نہیں
میرے داغ دل ترے گلزار کے قابل نہیں
تیری الفت آہ ! میرے پیار کے قابل نہیں
یعنی میں تیری محبت کے لئے ھوں ناسزا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

جلوہ گاہ زندگی تیرے لئے حیراں رہے
عظمت کونین تیرے نام پر قرباں رہے
اور تو اک بے نوا کی یاد میں نالاں رہے
کچھ نہیں کھلتا محبت نے تجھے کیا کر دیا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

تو نگار عفت و عصمت ہے آوارہ ھوں میں
تو مقیم جلوہ گاہ راز اور رسوا ھوں میں
آہ ! کب تیری محبت کے لئے زیبا ھوں میں
کچھ تو اپنے عشق کی معصومیوں پر رحم کھا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

ایک ساعت کے لئے حاصل مجھے راحت نہیں
میرے ساز زندگی میں نغمۂ عشرت نہیں
آہ ! میں نا شاد ہرگز قابلِ اُلفت نہیں

ایک ننگ زندگی کا غم کرے تیری بلا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

میری اُلفت میں نہ اپنی راحتیں نا شاد کر
میرے غم میں یوں نہ اپنی ہر خوشی برباد کر
میں تو اک خواب پریشاں ہوں نہ مجھ کو یاد کر

چھوڑ دے میرے لئے یہ رات بھر کا جاگنا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

فطرت رنگیں کو تو اے دلربا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا انداز حیا محبوب ہو
آہ ! ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو

اور تیرے دل کا ہو محبوب اک غم آشنا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

ڈر رہا ہوں تیرا راز عشق افشا ہو نہ جائے
محرم اسرار خاموشی یہ دنیا ہو نہ جائے
ضبط غم ہمرنگ محزونِ تمنا ہو نہ جائے

آہ ! کیا ہو گا اگر یہ راز پنہاں کھل گیا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

گر کسی سے تیرا ذکر عشق سن پاؤں گا میں
منہ چھپا کر بزم ہستی سے نکل جاؤں گا میں
آہ ! پھر تجھ کو نہ دنیا میں نظر آؤں گا میں

گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے مجھ کو بھلا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھو جا !

روشنی

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغ اُمید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا

جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ھے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ھے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ھے

ختم ھونے کو ھے افسانۂ محرومئی دید
اب یہ پردہ رخ امکاں سے سرک جائے گا

ھاں وھی دور وھی عہد مسرت بنیاد
جس کو روح غم پنہاں نے کیا ھے تعمیر

وھی عالم وھی مسجود جبینِ ایّام
وھی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وھی جنت وھی کیف ابدی کا پیغام

چشم آدم میں جو تھا صبح ازل سے آباد
مسکراتا ھے وھی خواب بہ شکل تعبیر

یہ سکوں اور یہ شب ھائے غلامی کا فسوں
زور طوفانِ تغیّر سے بکھر جائے گا

وقت توڑے گا روایات کے بت خانوں کو
غرق کر دے گا کمالات کے ایوانوں کو
پھونک دے گا در ظلمت کے نگہبانوں کو

ھے یہ مژدہ کہ پس معرکہ آتش و خوں
چہرۂ عالم ایجاد نکھر جائے گا

جس تصوّر پہ غلامان خرد تھے مغرور
وہ جہاں سوز تصور ھے چراغ سحری

اب گریبانِ تمرّد میں رفو ناممکن
تن بے روح میں تجدید نمو ناممکن
رنگ لائے نہ صداقت کا لہو ناممکن

جلوہ گر لوح تغیّر پہ ھے یہ آیت نور
کہ گرا چاھتا ھے خیمۂ بیداد گری

خوش ھو اے دوست کہ وہ دور بہار آتا ھے
جس کو نزدیک خزاں کر نہ سکے گا انسان

شکل نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موج بیگانہ وشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیرت آ آ کے ہمیں منہ نہ دکھائے گی کبھی

اب زمیں پر در یزداں سے وہ پیار آتا ہے
کہ جسے نذر زیاں کر نہ سکے گا انسان

ساقی

دیکھ وہ عرش سے نازل ہوئی شام اے ساقی
ہے اب اک لمحہ بھی تا خیر حرام اے ساقی
زندگی ہے شب تاریک نہ ہو جائے کہیں
لا ! مہ و مہر سے ترشا ہوا جام اے ساقی
تیری صہبا خم و مینا و سبو توڑ گئی
کہ یہ شمشیر تھی بیزارِ نیام اے ساقی
اب تری نرگسِ مخمور کا ایما کیا ہے
آج تو بزم میں ہے لغزش عام اے ساقی

اب وہ مے دے کہ جو ہو تمکنت افروز خودی
سخت برہم ہے زمانے کا نظام اے ساقی
میں نے صدیوں سے نہ دیکھا تھا کبھی روز غریب
اب وہ خورشید خرد ہے لب بام اے ساقی
علم موجود کے ایوان کا اب حال یہ ہے
جیسے طوفاں میں کوئی کشتئی خام اے ساقی
ٹھوکروں میں سرِ پندارِ خرد ہے پامال
رخش تخریب ہے آزادِ زمام اے ساقی

جس نے کاشانۂ انساں کو کیا تھا ویراں
اب وہ تہذیب ہے ویرانِ دوام اے ساقی
جس نے صہبائے محبت کو کیا زہر آلود
آج اُس زہر سے ہے مرگ بجام اے ساقی

جو غم عشق کی عظمت کو سمجھتا تھا حرام
اُس پہ ہر لمحۂ راحت ہے حرام اے ساقی
ماجرا ذلّت تزویرِ تمدن کا نہ پوچھ
جیسے رسوا کوئی ناظورۂ بام اے ساقی

آگ اور خون کے طوفاں ہیں بر افگندہ نقاب
آج بے پردہ ہے دوزخ کا مقام اے ساقی
خود کھیے دیتی ہے خاکستر تہذیب فرنگ
کون تھا سوختۂ آتشِ خام اے ساقی
گر یہ ہے ہوش پرستی کی سزا کا آغاز
کیا ہو اب دیکھئے پاداش تمام اے ساقی
علم کہتا ہے جسے قاصد اقلیم فنا
زلف بردوش ہے وہ ظلمت عام اے ساقی

اب ترے در پہ زمانہ ہے طلبگار سکوں
کہ یہی در تو ہے محبوب انام اے ساقی
یہیں ملتی ہے محبت کی ہواؤں کو حیات
لمحہ لمحہ ہے یہاں خلد مشام اے ساقی
داغ غم تیرے سوا کون مٹا سکتا ہے
مہر تاباں نہ کوئی ماہ تمام اے ساقی
تیرے میخانے سے اُٹھتی ہوئی ایک ایک کرن
ہے سکونِ دلِ انساں کا پیام اے ساقی

عام ہے اسود و احمر پہ ترا جُود و کرم
سب کی دولت ہے تری رحمت عام اے ساقی

کچھ یہاں مشرق و مغرب کی نہیں ہے تخصیص
سب کو ملتا ہے ترے ھاتھ سے جام اے ساقی

تو نے علم و عمل و عشق کو بخشا وہ سرور
کہ جو ہے عرش پہ مصروف خرام اے ساقی

جس سے ھستی بھی ہے سرشار ، فنا بھی مدھوش
تیری صہبا میں ہے وہ کیفِ تمام اے ساقی

ن۔ م۔ راشد



نذر محمد نام راشد تخلص یکم اگست ۱۹۱۰ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم۔ اے پاس کیا۔ تقسیم ہند سے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم رہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ریڈیو پاکستان پشاور میں تھے۔ اواخر ۱۹۵۳ء میں ریڈیو امریکہ نے اردو پروگراموں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں انکی خدمات حاصل کر لی ہیں چنانچہ آج کل راشد صاحب نیویارک میں قیام پذیر ہیں۔

راشد عصر حاضر کے اُن نوجوان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی روایات سے بغاوت کر کے مادہ و ہیئت ہر دو اعتبار سے ایک نئے تجربے کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں اُنکی شاعری میں اپنی مروجہ شاعری کے مقابلہ میں داخلی و خارجی اور فنی و فکری ہر لحاظ سے ایک مکمل انحراف ملتا ہے۔ یوں تو بے قافیہ نظمیں عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی نے بھی کہی ہیں مگر راشد کی ''نظم آزاد'' اپنے اسلوب فکر و بیان اور اپنے مخصوص آھنگ و تاثیر کے لحاظ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اُنکی نظم میں ردیف و قافیہ کا التزام نہیں ہوتا اور اگر کہیں کہیں ہوتا بھی ہے تو کسی مسلمہ قاعدے کے ماتحت نہیں۔ ساتھ ہی اُن میں کوئی مسلمہ وزن بھی نہیں پایا جاتا۔ علاوہ ازیں وہ زبان میں بھی جدت سے کام لیتے ہیں اُنھوں نے نئے الفاظ، تراکیب، تشبیہات و استعارات استعمال کئے ہیں اور پرانے الفاظ کو نئے معنی بھی پہنانے کی کوشش کی ہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُنکی نظمیں اکثر پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اُنکی تصنیف ''ماورا'' میں کرشن چندر نے راشد اور اُنکی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''فنی نقطۂ نگاہ سے راشد ایک صحیح باغی شاعر ہے۔ اُس کا تخیل ہمیشہ ہماری موروثی زبان کے الفاظ اُنکے معانی، اسالیب بیان، بندشوں اور تراکیب کو توڑتا، پگھلاتا، اُنھیں نئے سانچوں میں ڈھالتا، نئی صورتیں دیتا اور اُن میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اُسکی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ''آزاد تسلسل راشد کا خاص انداز ہے۔ اسکی مثالیں اُنکی اکثر نظموں میں ملتی ہیں۔ اس سے اُنکی نظموں میں ایک خاص ایجاز و جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو عہد حاضر کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔ اکثر اوقات اُسکے ذہن لاشعور کی

کھینچی ہوئی تصویریں صرف عامیون ہی کی نہیں بلکہ عہد حاضر کے اکثر شعرا کی ذہنی تصویروں سے مختلف ہوتی ہیں اور اس لئے وہ آن کے سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں - یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچتی چلی آتی ہیں کہ ان میں فوری طور پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہو سکتا - اس لئے راشد کی اکثر نظمیں مبہم سمجھی جاتی ہیں،، اور اس ابہام کا سبب آنہوں نے ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی ماحول کو بتایا ہے - لیکن دیانتداری کی بات یہ ہے کہ کرشن چندر صاحب کی یہ توجیہہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ اسی بے حد تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے تہذیبی و معاشرتی ماحول سے اقبال کو چھوڑ کر خود موجودہ شعرا میں جوش ' فیض ' قاسمی اور نہ جانے کتنے معروف و مقبول شعرا موجود ہیں اور آنہوں نے روایت سے بغاوت کا بھی ثبوت دیا ہے - آنکے آسلوب بیان میں ایسا شدید ابہام نہیں پایا جاتا جتنا راشد کی نظموں میں ہے - بہرنوع اس بحث کا یہاں موقع نہیں - حاصل کلام یہ ہے کہ آنکی بیشتر نظموں میں پڑھنے والا بڑی آلجھن محسوس کرتا ہے اور شاعر کا مافی الضمیر آسکی سلمجھ میں نہیں آتا -

راشد کی ''ماورا'' اور اسکے بعد کی نظموں میں تین طرح کی نظمیں ہیں - (۱) نیم آزاد (۲) آزاد (۳) سائنٹ

آخرالذکر اس انگریزی صنف نظم کا نام ہے جس میں قوافی کا ایک خاص التزام ہوتا ہے اور مصرعوں کی تعداد ہمیشہ چودہ ہوتی ہے - اس سلسلے میں یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ راشد صاحب نے آردو فارسی قوافی کے التزام سے تو گریز کیا ہے لیکن انگریزی التزام کا جوأ اپنے کاندھوں پر لاد کر کسی مستحسن اجتہاد کا ثبوت نہیں دیا -

جہاں تک آن کے کلام کے مجموعی تاثر کا تعلق ہے آنکی اکثر نظمیں قاری کے ذہن پر کوئی صحت مند اثر مترتب نہیں کرتیں چونکہ آنکے یہاں موت ' خود کشی ' افسردگی اور فرار کی خاص تکرار پائی جاتی ہے - زندگی آن کے لئے زہر بھرا جام ہے اور ارض مشرق کی روح بالکل مردہ و بے جان ' جسے شاعر کے نزدیک قطعی طور پر مر جانا چاہئے - ان تصورات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آنکے یہاں ایک اعصابی تکان ' ذہنی جمود شکستہ ایمانی اور حد سے زیادہ احساس کمتری نے غلبہ پا لیا ہے - ظاہر ہے ایسی ذہنی پراگندگی اور شدید انتشار کی صورت میں آن سے کسی منظم مربوط اور توانا و صالح تصور کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی - یہ الگ بات ہے کہ راشد صاحب بڑے ذہین و ذکی الحس انسان واقع ہوئے ہیں اور آنہیں شاعری میں خیال کے ساتھ ساتھ مروجہ اسالیب بیان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ایک طرف تو سارے جہان کا درد آنکے جگر میں ہے دوسری طرف وہ مروجہ اسالیب کے برتنے میں قطعی طور پر ناکام رہے ہیں (آنکی غزلیں اس کی شاہد ہیں) - بہر حال قطع نظر ان تمام باتوں کے وہ اس دور کے سب سے زیادہ منفرد شاعر ہیں آنکے انداز میں ایک اعتماد ' لہجے میں تیقن ' اظہار میں زور اور پھیلاؤ پایا جاتا ہے - آنکی ہر نظم کے موضوع ' آسکے اجزائے ترکیبی ' اظہار خیال اور ایک ایک لفظ کی نشست سے انفرادیت ٹپکتی ہے - ''ماورا'' کے بعد کی نظموں میں شدت جذبات میں بہت ہی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے - آنکی یہ نظمیں موضوع کے لحاظ سے

بھی بڑی متنوع ہیں - ان میں مختلف ملکوں خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے سیاسی و سماجی مسائل کا ذکر ہے - اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راشد نے ان میں اپنے تمام تجربات ' سیر و سیاحت ' میل ملاقاتیں ' عشق اور محبت ' اُمیدیں و خدشات پورے خلوص کے ساتھ منعکس کرنے کی کوشش کی ہے -

راشد نے ''ماورا'' کے بعد چند غزلیں اور بیشتر نظمیں کہی ہیں - اُن کی جو نظمیں وقتاً فوقتاً رسائل میں چھپتی رہی ہیں حسب ذیل ہیں -

زنجیر — پہلی کرن — خرابے — داشتہ — سرگوشیاں

(یہ نظمیں ماورا کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لی گئی ہیں)

اسکے علاوہ سومنات — ایران میں اجنبی (طویل نظم) — رقص کی رات - طلسم ازل — ظلم رنگ — کشاکش — ویران کشید گاہیں — ایک شہر — سوغات — سبا — ویراں وغیرہ ہیں -

انتخاب کلام

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے !

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں '
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے !

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری آن آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک !
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہد پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہش بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے !

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگ خارا ہی سہی ، سنگ مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں ، دشمن جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں ، دیبا نہیں ، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں ، نئی امید پیدا ہو چلی

حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور اُفتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تارہائے سیم و زر
اُس کے پردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوھساروں ریگ زاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو ! بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ دو
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ھنگام بار آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزم آخری ——
شام سے پہلے ھی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ھو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے ، رھگذاروں سے لپٹتے ، سوگوار !
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ھے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج !
آج میں نے پالیا ھے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار[1] محبوبہ کے پاس
اُس کے تخت خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ ، درخشاں لہو ،
بُوئے سے میں بُوئے خوں اُلجھی ہوئی !
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں آج اپنا عزم آخری !
جی میں آئے ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی -

ظلم رنگ

''یہ میں ہوں''
''اور یہ میں ہوں !''
یہ دو میں ایک سیم نیلگوں کے ساتھ آویزاں
ہیں شرق و غرب کے مانند
لیکن مل نہیں سکتے !
صدائیں رنگ سے نا آشنا
اک تار ان کے درمیاں حائل !

مگر وہ ہاتھ جن کا بخت
مشرق کے جواں سورج کی تابانی
کبھی ان نرم و نازک ، برف پروردہ حسیں باہوں
کو چھو جائیں ،

[1] مراد زندگی

محبت کی کمیں گاھوں کو چھو جائیں
یہ نا ممکن ! یہ نا ممکن !
کہ ''ظلم رنگ'' کی دیوار ان کے درمیاں حائل !

''یہ میں ہوں''
''اور یہ میں ہوں''
انا کے زخم آلودہ ، ہر پردے میں ،
ہر پوشاک میں عریاں
یہ زخم ایسے ھیں جو اشک ریا سے سل نہیں سکتے
کسی سوچے ہوئے حرف وفا سے سل نہیں سکتے !

(نیویارک)

پہلی کرن

کوئی مجھ کو دور زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو !
کوئی یہ سجھا دو کہ حاصل ھے کیا ھستئی رائیگاں سے ؟
کہ غیروں کی تہذیب کی اُستواری کی خاطر
عبث بن رھا ھے ھمارا لہو مومیائی !
میں اُس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ھی محنت ھے
نان شبینہ نہیں ھے

اور اس پر بھی یہ قوم دل شاد ھے شوکت پاستاں سے
اور اب بھی ھے اُمید فردا کسی ساحر بے نشاں سے
مری جاں ، شب و روز کی اس مشقت سے تنگ آ گیا ھوں
میں اس خشت کوبی سے اکتا گیا ھوں
کہاں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنہوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا
تری چھاتیوں کا جوئے شیر کیوں زھر کا اک سمندر نہ بن جائے
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جاں
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ھے ترے سینۂ مہرباں سے
جو واقف نہیں تیرے درد نہاں سے
اسے بھی تو ذلت کی پائندگی کے لئے آلۂ کار بننا پڑے گا

بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج
بے دست و پا ہیں
اس آئندہ نسلوں کی زنجیر پا کو تو ہم توڑ ڈالیں !
مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی !
یہ شہنائیاں سن رہی ہو ؟
نہیں اس دریچہ کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے !
یہ انسان کی برتری کے لئے اک نئے دور کے شادیانے ہیں سن تو
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانہ کی ولادت کے اس جشن میں مل کے
دھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں !

مجاز

اسرار الحق نام مجاز تخلص ۱۹۱۱ء میں اپنے وطن قصبہ رُدولی ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ سراج الحق صاحب کا شمار قصبہ کے سر بر آوردہ اور معزز لوگوں میں ہوتا ہے اور چونکہ آپ ججی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے اس لئے آپ کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا۔ یہیں مجاز کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی پھر ۱۹۳۶ء میں علیگڈھ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دھلی میں اور کچھ دنوں حکومت بمبئی کے محکمہ اطلاعات میں ملازم رہے۔ اس کے بعد ''حلقہ ادب'' لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور ''نیا ادب'' کے ادارہ میں رہ کر ھارڈنگ لائبریری دھلی میں ملازم ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے بھی نکل کھڑے ہوئے اور جب سے اب تک سوائے شعر و شاعری کے کوئی دوسرا مشغلہ نہیں ھے۔

مجاز کی شاعری بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد کی پیداوار ھے۔ اور اس میں اپنے ماحول کے بڑے گہرے اثرات پائے جاتے ھیں۔ یوں فطرتاً مجاز ایک رومانی شاعر ھیں لیکن ایک حساس شاعر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملکی حالات کا جو اثر قبول کیا اس کی بدولت ان کی شاعری میں ایک انقلابی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مجاز کے ھاں ساز و جام زیادہ اور شمشیر کم ھے لیکن آھستہ آھستہ یہ تناسب بدل رھا ھے اور بہت ممکن ھے کہ اگر مجاز نے تھوڑے ریاض اور ذھنی و جذباتی یکسوئی سے کام لیا تو کچھ عرصہ کے بعد ان کی شاعری نہ صرف اچھی انقلابی شاعری کا عمدہ نمونہ بن جائے گی بلکہ اس میں وہ عظمت و رفعت بھی پیدا ہو جائے گی جو اعلیٰ شاعری کی ضمانت سمجھی جاتی ھے۔

مجاز کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اس کی حد درجہ غنائیت ھے۔ جو اس دور کے عام غنائی شعرا کے محض جوانی کے دو چار ذاتی تجربات کی ترجمانی تک محدود نہیں بلکہ اس میں زیادہ وسعت، زیادہ گہرائی اور زیادہ مستقل مسائل سے اتصال پایا جاتا ھے یہی وجہ ھے کہ مجاز کے رنگ میں ترقی کے امکانات ھیں اور اس میں تھکن کے بجائے مستی اور اداسی کے بجائے سرخوشی قائم اور برقرار ھے۔ اس کے علاوہ ان کی رومانی شاعری میں جہاں جہاں رمزیت، اشاریت، داخلیت اور وجدانی عمق پوری تابناکی سے سمویا ھوا ھے وھاں ان کے ھر شعر میں جذبات کی گہرائی اور لہجہ میں بڑا ضبط و توازن ملتا ھے اور یہی وہ شاعری ھے جس کے سہارے مجاز آج تک زندہ ھیں اور عرصہ تک زندہ رھیں گے۔

مجاز کی انقلابی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف انقلاب کا ڈھنڈورہ نہیں اور نہ ہی اُس میں انقلاب کا محض ہولناک نقشہ ہی کھینچا گیا ہے بلکہ وہ انقلاب کا ایک ایسا نغمہ ہے جس میں رنگینئی بہار کی عبارت آرائی اور تاثر آفرینی بھی موجود ہے۔ بالفاظ دیگر مجاز انقلاب کا مطرب ہے اور اُس نے حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھ کر جو راگ الاپا ہے اُس میں نئی اُردو شاعری کی وہی جاذب توجہ لے پائی جاتی ہے جسے ہم فیض و جذبی کے یہاں پاتے ہیں۔ البتہ اس راہ سے ہٹ کر جہاں مجاز نے خطابت سے کام لیا ہے یا عدل و حق کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کا دعویٰ کیا ہے وہاں و انقلاب کے سطحی تصور میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور اُس کے اشعار میں وہی روائتی مار دھاڑ، توپوں کی گرج، گولیوں کی سنسناہٹ، بگل کی آواز وغیرہ جیسی چیزوں کا تذکرہ ہونے لگتا ہے۔ جسے سوائے سستی جذبات پرستی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

البتہ مجاز کی شاعری میں جہاں کشمکش اور ذاتی و خارجی تقاضوں میں تصادم پیدا ہوا ہے وہاں اُس کی شاعری میں کافی نکھار پیدا ہوگیا ہے۔ ''آوارہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ ایک بڑی نفسیاتی نظم ہے جس میں ایک طرف حسن کی پکار، دوسری طرف غلامی کی زنجیریں، ایک طرف ماحول ناسازگار دوسری طرف انسانیت پر ظلم و تعدی کی ناقابل برداشت بارش دکھائی دیتی ہے مگر انقلاب لانے کی نہ تو قوت ہے اور نہ اسباب اس لئے ''کیا کروں'' کا فطری سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور پوری نظم ایک کشمکش، اضطرار اور اُلجھن کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح گویا اس نظم میں آج کے انسان کی ذہنی کشمکش کی بڑی اچھی ترجمانی پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک عام اپیل بھی ہے۔

مجاز کی شاعری کے سلسلے میں سچ مچ اگر جوش جو اُن کے معنوی اُستاد ہیں، کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاز کا فن جوش کا فن ہے جس میں موزوں ترین سلیقہ سے ڈھلے ہوئے الفاظ، شعری تصاویر، مناسب ترین تشبیہات و استعارات اور جھنکار موجود ہے۔ ظاہر ہے یہ خوبیاں بڑی حد تک جوش ہی کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہیں اور انہیں خصوصیات کے بل بوتے پر خود جوش کا فن برقرار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجاز کے شاعرانہ اسلوب میں وہ پختگی پیدا نہیں ہوئی جو جوش کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے اور آئندہ اس کے بڑھنے کے امکانات ہیں۔

مجاز کے کلام میں حد درجہ روانی، گھلاوٹ اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں جوانی کی اُمنگ اور سرمستی نے اُن کی شاعری کو ایک خاص دلکشی بخشی ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''آہنگ'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے مجاز نے ۱۹۴۵ء ''شب تاب'' کے نام سے اور پھر مزید اضافے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ''ساز نو'' کے نام سے طبع کروایا ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا ' اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوق نظارہ کیا کہئے ' نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجیے ' ہم صورت جاناں بھول گئے
اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں ' اب دل کی کلی کِھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ' ہم لطف بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے ' اپنا ہی گریباں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے ' اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعئی کرم فرما بھی گئے
اس سعئی کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے
ہم عرض وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے
رُوداد غم اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے
ارباب جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گزری
آئے تھے سواد اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

اُن انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو صہبا ہی صہبا ' مستی ہی مستی
وہ آ بھی جاتے وہ ہو بھی جاتے چشم تمنا پھر بھی ترستی

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

سارا عالم گوش بر آواز ہے آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذب دل حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے
ہنس دئے وہ میرے رونے پر مگر اُن کے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے
چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر اب تو بس آواز ہی آواز ہے
ساری محفل جس پہ جھوم اُٹھی "مجاز"
وہ تو آواز شکست ساز ہے

محبت کے سو رنگ سو سو اثر کوئی نغمہ پیرا ' کوئی نوحہ گر
جہاں ٹھوکریں ہوں ہر اک گام پر وہاں لغزش پا بنے راہبر
یہ سب ہاتھ ہیں خون سے جن کے تر یہی تھے مسیحا یہی چارہ گر
جگر کی خبر ہے نہ دل کی خبر مگر لڑ رہی ہے نظر سے نظر

بے سبب التفات کیا معنی کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ
ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی دل سے دل ہمکلام ہوتا ہے

جھوم جھوم اُٹھے شجر ' کلیوں نے آنکھیں کھولدیں
جانب گلشن کوئی مست خرام آ ہی گیا
پھر کسی کے سامنے چشم تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگ احترام آ ہی گیا
بار ہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب تک اُس کا نام آ ہی گیا
کُھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے "مجاز"
خیریت گزری کہ شاہیں زیر دام آ ہی گیا

…ں نظروں میں حشر بھی کیا ہے میں نے اُس کا جلال دیکھا ہے
…ئے انجام اُس سفینے کا .... نا خدا نے جسے ڈبویا ہے
…ر مری آنکھ ہو گئی نمناک پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

شوق کے ہاتھوں اے دل مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا
حسن کی بزم خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدا ہوگا
چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا عشق شادماں اپنا شوق کامراں اپنا
آہ بے اثر کس کی نالہ نارسا کس کا کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا
اُلجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے کس قدر تن آساں ہے ذوق رائیگاں اپنا

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانے پہ کیا کہیں
وہ راز دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
بے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جانا تھا
عشق کو منزل پستی سے گزر جانا تھا
حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد "مجاز"
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

جنون شوق اب بھی کم نہیں ہے مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

نہیں یہ فکر کوئی رہبر کامل نہیں ملتا
کوئی دنیا میں مانوس مزاج دل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا
کبھی ساحل پہ رہ کر شوق طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں گِھر کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا
یہ قتل عام اور بے اذن قتل عام کیا معنی
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنھیں قاتل نہیں ملتا

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا آفتاب
جیسے مُلاّ کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چُھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر لگی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

تے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
ٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
ر کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے

سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

آہنگِ نو

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوف بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاس ناموس نگاران جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

ایک اک سمت سے شبخون کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشق جفا کاری ہے
محفل زیست پہ فرمان قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بم باری ہے
یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیارے ہیں
برسرِ دوشِ ہوا موت کے ہرکارے ہیں

اس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہیں تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی !
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی !

ں سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
علہ افشان و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خوں جو بہہ نکلا ہے اُس خوں میں بہا دو ان کو
اُن کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو ان کو

رنگ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورش نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے
عفّتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے

تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں ، احساس تمہیں ہے کہ نہیں

یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حامل آداب و روایات کہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برق خرمن

خطّۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں !
آہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں !

مرد و زن پیر و جواں اُن کے مظالم کا شکار
خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اُن کی تلوار
یہ قیامت کے ہوسناک ، غضب کے خونخوار
اُن کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
ان کی توپوں کے دھن کر دو انھیں کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیداد دبا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو

پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو
یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں
روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنّت کر دو

اعتراف

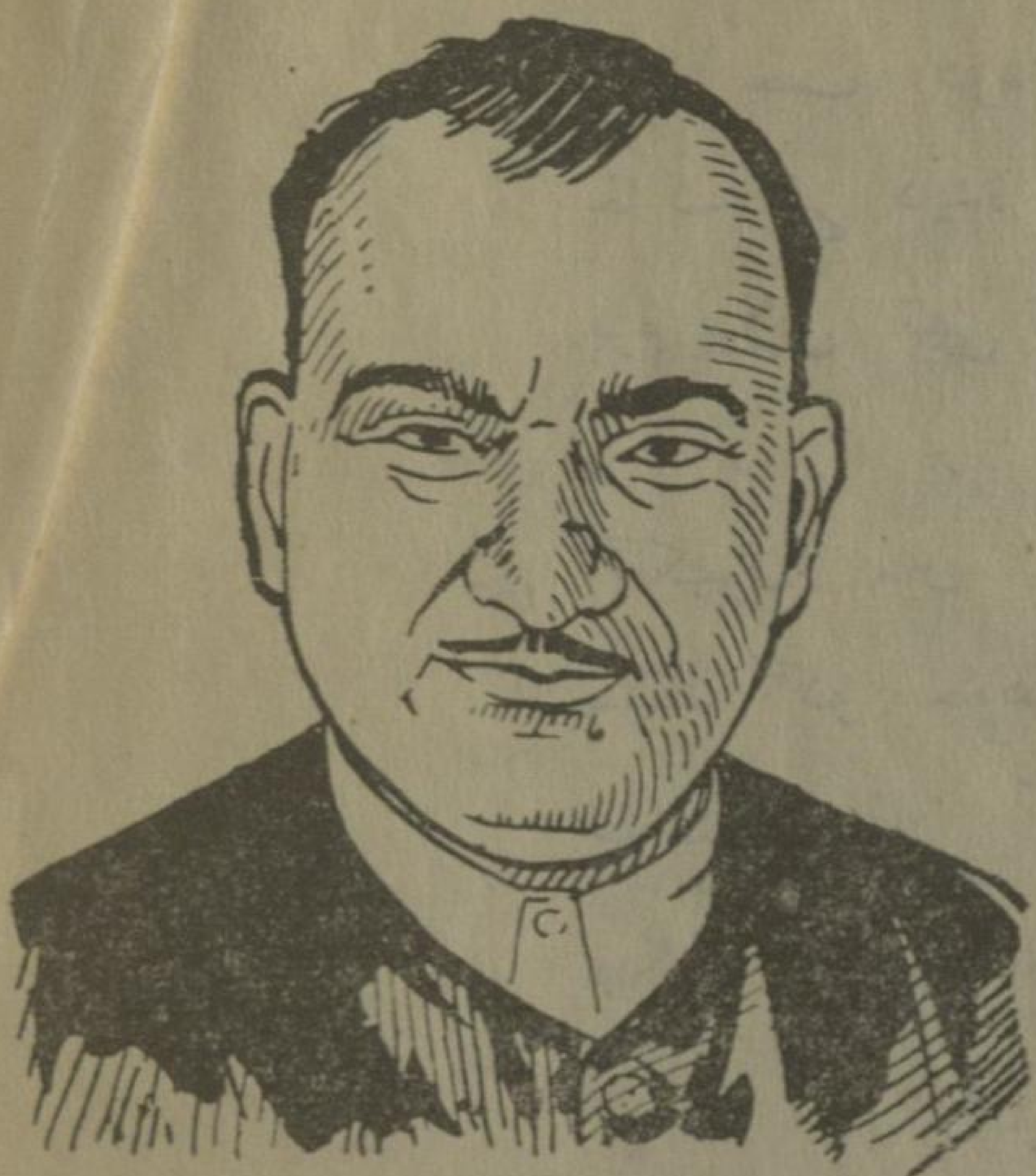
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!
میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دھر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے آتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہر خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاھوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمان محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاری و عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بستر مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری
جنت شوق تھی بیگانۂ آفات سموم
درد جب درد نہ ہو کاوش درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ھجوم
لیلئ ناز بر افگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوت خواب آتی تھی
سنگ کو جوھر نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پرخار کو فردوس جواں جانا تھا
ریگ کر سلسلۂ آب رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں
کیا سنوگی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار
وہ گداز دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرائت کی قسم تم مری قربت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزا وار نہیں
میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

عرش ملسیانی



بالمکند نام، عرش تخلص، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی وطن قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناب جوش ملسیانی ایک فاضل اُستاد اور اُردو کے معروف متغزلین میں سے ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ بامذاق اور مہذب باپ ہی کی تربیت کا فیضان ہے کہ عرش صاحب ایک شستہ ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ عرش صاحب نے ابتدائی تعلیم والد کے زیرنگرانی حاصل کر کے انٹرنس پاس کیا۔ پھر انجینئرنگ کالج رسول سے اوورسیری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں محکمہ نہر میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن چونکہ شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی اس لئے یہ ملازمت ترک کر کے ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول لدھیانہ میں بہ حیثیت معلم ملازم ہوئے اور تقریباً چودہ پندرہ برس اس ادارے میں کام کرتے رہے۔ اس دوران میں آپ کا مطالعہ بھی برابر جاری رہا چنانچہ یہیں سے آپ نے پرائیویٹ طور پر ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ یہاں سے نکل کر آپ گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت کے سلسلے میں دہلی پہونچے اور تقسیم ہند تک وہاں کام کیا پھر غالباً ۱۹۴۷ء سے آپ کا تقرر ماہنامہ ''آجکل'' کے عملۂ ادارت میں ہو گیا۔ جب سے عرش صاحب نائب مدیر کی حیثیت سے اسی ادارے میں کام کر رہے ہیں۔

عرش صاحب کو بچپن سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی تھی اس پر حضرت جوش ملسیانی جیسا دقت نظر رکھنے والا اُستاد اور شعر کی قدر کو پرکھنے والا سخن سنج باپ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُنہیں نہ صرف شعر کہنے پر قدرت حاصل ہو گئی بلکہ اُردو شاعری کی روایات میں وہ پوری طرح منجھ بھی گئے۔ عرش صاحب نے جس فضا میں آنکھ کھولی اُسے صحیح معنوں میں شعر و شاعری کے چرچوں سے سیر حاصل کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اقبال کے ترانے فضا میں گونج رہے تھے تو دوسری طرف جوش ملسیانی، حفیظ جالندھری اور حضرت محروم نئی غنائیت اور نئی شعری اقدار کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ قدرتی طور پر اس فضا سے عرش متاثر ہوئے اور اس تاثر کے بعد خود اُنہوں نے جو نغمہ چھیڑا وہ تغزل سے بھرپور تھا۔

عرش صاحب کو صنف غزل پر عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے ماحول کی تحریکات کے اظہار کے لئے اسی صنف سخن کو منتخب کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ

نظمیں کہتے ہیں اور اُس میں بھی غزل کی طرح عصری جذبات و رجحانات کو پوری طرح سمونے پر قادر ہیں۔ اس طرح عرش صاحب کی شاعری کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک وقت مسائل کی شاعری بھی ہے اور غنائی و فکری شاعری بھی۔ غزل کو وہ اسلافِ سلف کے معیار پر پرکھنے کے عادی ہیں مگر روایت کے اُس احترام کے باوصف اُنکی نظمیں نئے سماجی رجحانات اور جدید شعری تصورات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ اُن کے دو مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں پہلا ''ہفت رنگ'' اور دوسرا ''چنگ و آہنگ'' ۱۹۵ء میں شایع ہوا ہے۔ ان دونوں مجموعوں، بالخصوص ''چنگ و آہنگ'' جس میں کلام کی زمانی ترتیب اختیار کی گئی ہے، کے مطالعے سے شاعر کے ذہنی ارتقاء کا خاکہ زیادہ مکمل طور پر سامنے آ جاتا ہے اور بلاشبہ اب وہ اُن بلندیوں تک پہنچنے لگے ہیں جہاں فطری شاعری کا علم لہراتا اور حقیقی شعریت کی بجلیاں چمکتی رہتی ہیں۔

اُن کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ''چنگ و آہنگ'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں ''ابتدائی دور میں عرش اگر پابند روایت شاعر تھے اور عمومی تجربات کو عمومی اصطلاحوں اور اسالیب میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے تھے، تو بعد کے ادوار میں جب اُن کی خود اعتمادی اپنے آپ کو محسوس کرانے کی صلاحیت کو نشو و نما دینے لگتی ہے تو وہ ''سر دلبراں'' کے ذاتی تجربوں کو بھی، کبھی تو ''حدیث دیگراں'' کے پردے میں پیش کرتے ہیں اور کبھی اس مہین پردے کو چاک کر کے اپنے ذاتی تجربوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں اس مرحلے پر پہنچ کر، عرش کی فکر کے ڈانڈے ہمارے عصر کی اُن شعری تحریکوں سے مل جاتے ہیں جنہیں پرانی تحریکوں سے ممیز کرنے کے لئے کبھی ترقی پسند شاعری اور کبھی نئی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے''۔ اور اس میں شک نہیں کہ جناب عرش ان معنوں میں ضرور ترقی پسند ہیں کہ وہ اپنے کلام میں بالعموم اپنے ماحول کی ترجمانی اور زندگی کے موجودہ مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

عرش صاحب نے موضوعاتی نظمیں بھی کافی کہی ہیں۔ ان میں کچھ تو غنائی و تخیلی ہیں اور بیشتر ایسی ہیں جن میں یا تو زندگی کے موجودہ مسائل کا خاکہ پیش کیا گیا ہے یا حالات حاضرہ پر کڑی مگر سچی تنقید کی گئی ہے۔ اول الذکر خصوصیات کی ترجمان اُن کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں ''ہولی'' ''دیہاتی دوشیزہ'' ''بسنت'' ''ریڈیو پر گانے والی'' ''وادئ کشمیر'' ''ساز خاموشی'' بڑی دلکش اور قابل مطالعہ نظمیں ہیں جہاں تک دوسری خصوصیت کا تعلق ہے اُن کی وہ نظمیں جو فرقہ دارانہ فسادات پر کہی گئی ہیں درحقیقت ایک خاص دور کی سیاسی تاریخ ہیں۔ لیکن اس سے بڑھکر اُن کی چند وہ نظمیں ہیں جن میں اُنہوں نے بعض اہم عالمی مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی ''۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک'' ''ایشیا کو چھوڑ دو'' اور ''جنگ کوریا'' نہایت پر درد اور جوشیلی منظومات ہیں۔

کلام عرش کی زبان اور اسالیب بیان پر کچھ کہنا اس لحاظ سے تحصیل حاصل ہے کہ یہ چیزیں تو اُنہیں قطعی طور پر اپنے والد جناب جوش سے ورثے میں ملی ہیں۔ اور جوش صاحب زبان و بیان کے معاملے میں فصیح الملک داغ کے شاگرد رشید ہونے

کی حیثیت سے مستند مانے جاتے ہیں۔ غرض عرشؔ کی شاعری اپنے عصر کی محتاط ار[illegible]قیس فکر کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ [illegible] وہ علامات ہیں جو اسکے دیرپا ہونے کی ضامن ہیں۔

انتخاب کلام

تغزل

یہ دنیا ہے اسے دارلفتن کہنا ہی پڑتا ہے
یہاں ہر راہبر کو راہزن کہنا ہی پڑتا ہے
وفور عقل انساں سے بڑھی انساں کشی اتنی
وفور عشق کو دیوانہ پن کہنا ہی پڑتا ہے
وہ صحرا جس میں کٹ جاتے ہیں دن یاد بہاراں سے
بالفاظ دگر اُس کو چمن کہنا ہی پڑتا ہے
بتان سنگدل میں ہے نزاکت کا بھی اک پہلو
انہیں سیمیں بدن گل پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے
اسی صورت سے کم ہوتا ہے کچھ آزار غربت کا
دیار غیر کو اپنا وطن کہنا ہی پڑتا ہے
اگر انجام کو پیش نظر رکھیں تو مجبوراً
جہان عیش کو دارالمحن کہنا ہی پڑتا ہے
زباں سمجھے نہ سمجھے کوئی اپنی "عرش" اس پر بھی
وطن اپنا ہے یہ اسکو وطن کہنا ہی پڑتا ہے

اے اسیری سے چھوٹنے والے — اب تو دام و قفس کی بات نہ کر
قصۂ شیخ شہر رہنے دے — مجھ سے اُس بوالہوس کی بات نہ کر
وہ رہائی نہیں سکوں جس میں — اک قفس ہے قفس کی بات نہ کر
یہ بتا "عرش" سوز ہے کتنا
ساز پر دسترس کی بات نہ کر

کس طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی
عجب نہ تھا کہ غم دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی

خواہش معدوم اچھی خواہش ناکام سے
حیف اُس پر پھول بنکر جو کلی مرجھا گئی
کون ہو گا اب ہدف ناکامئی تدبیر کا
زندگی کی راہ میں تقدیر تو کام آ گئی

دوستی کا نشاں نہیں ملتا
کوئی اپنا یہاں نہیں ملتا
درد معراج کو پہنچتا ہے
جب کوئی ترجماں نہیں ملتا
رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی
رہرووں کا نشاں نہیں ملتا

ہم اس چمن کا پھول ہوئے بھی تو فائدہ
شبنم کا آفتاب جہاں پاسباں رہے
اُن رہبروں کے رحم پہ منزل رسی ہے عرش
جو محو نالۂ جرس کارواں رہے

آہ ! ان طائروں کی خوش فہمی
ہو کے آزاد جو اسیر ہوئے
چھیڑ بھی اُن سے بے مثال ہوئی
اُن سے شکوے بھی بے نظیر ہوئے

اک فقط مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں
اے خدا دنیا میں تیری ورنہ کیا ہوتا نہیں
ہم کو راہ زندگی میں اس قدر رہزن ملے
رہنما پر بھی گماں رہنما ہوتا نہیں
سجدے کرتے بھی ہیں انساں خود در انساں پہ روز
اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں
"عرش" پہلے یہ شکایت تھی خفا ہوتا ہے وہ
اب یہ شکوہ ہے کہ وہ ظالم خفا ہوتا نہیں

دل ہی بے نور ہو تو ہو شاید
عشق کی راہ تو نہیں تاریک

چوٹ جب تک کوئی نہیں لگتی دل میں ہوتی نہیں کوئی تحریک
عشق کا ہر بیان بیانِ غلط حسن جو بھی کہے سراسر ٹھیک

طوفان بلا کا خوف نہیں یہ شان تغافل کیا کہنا
اے اہل وطن تم ہنستے ہو اور ایک زمانہ روتا ہے
انجام عمل کی فکر نہ کر، ہے ذکر بھی اسکا ننگ عمل
جو کرنا ہے تجھ کو کرے وہ ہونے دے جو ہوتا ہے
طوفان مصیبت تیز سہی، لیکن یہ پریشانی کیسی
کشتی کو بیچ سمندر میں کیوں اپنے آپ ڈبوتا ہے
اے "عرش" تلاش منزل میں انجام دل کی فکر نہ کر
گم ہونا شان دل ٹھہری ہونے دے اگر گم ہوتا ہے

طوفان سے اُلجھ گئے لے کر خدا کا نام
آخر نجات پا ہی گئے ناخدا سے ہم
پہلا سا وہ جنون محبت نہیں رہا
کچھ کچھ سنبھل گئے ہیں تمہاری دعا سے ہم
آنے دو التفات میں کچھ اور بھی کمی
مانوس ہو رہے ہیں تمہاری جفا سے ہم

شاعری اس کے لئے ہے گھر کی بات عرش فرزند جناب جوش ہے

جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے دل کی باتوں میں آکے دیکھ لیا
زندگی ہر طرح وبال رہی صبر بھی آزما کے دیکھ لیا
کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرش سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

میں تو ناکام انتظار نہیں دل کو ہی تجھ پہ اعتبار نہیں
وہ تسلی بھی دے گئے اے عرش اب بھی دل کو مرے قرار نہیں

ناز اگر ہے تو تیری رحمت پر اپنے عصیاں پہ مجھکو ناز نہیں

یاد جس وقت مجھے وہ ستم ایجاد آیا
لب پہ رہ رہ کے مرے شکوۂ بیداد آیا
حضرت شیخ کے لب پر ہے وہی حور کی بات
یاد اس کو نہ کبھی کوئی پریزاد آیا

کوئی دیکھے قفس والوں کی حالت
اٹھا گلشن کی جانب سے دھواں ہے
ذرا ہمت سے آؤ گم کردہ منزل
ابھی کچھ دور گرد کارواں ہے

اے جوش طلب تو ہو، تو پروا نہیں مجھ کو
صحرا مرے آگے ہو کہ دریا مرے آگے
مر کر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے
خود حسن کا خاکہ ہے یہ خود عشق کا نقشہ
ہے خواب بھی تعبیر بھی دنیا مرے آگے۔

دل کو سوجھی بھی تو کب چاک جنوں سینے کی
دامن ہوش میں جس وقت کوئی تار نہ تھا

امیدوں پر پھرا جاتا ہے پانی
ٹھہر اے دیدۂ تر کی روانی
دیا کیوں اس کو عشق جاودانی
جسے بخشی ہے تو نے عمر فانی

تمہارے تیر کو جو دل میں رکھ لیتے ہیں خوش ہو کر
جفائے آسماں کو وہ بلاکش کیا سمجھتے ہیں

جنہیں گم گشتگی کے فیض سے ہے ہر قدم منزل
جنون شوق میں رہبر کی وہ پرواہ نہیں کرتے

موت نے آسرا دیا بھی تو کب
جب مصیبت کے دن گزار آئے
یاس کہتی ہے کچھ، تمنا کچھ
کس کی باتوں پہ اعتبار آئے
عرش وہ بے قراریاں نہ رہیں
دل کو اب کس طرح قرار آئے

کچھ قصورساقی کا ، کچھ ہے ابرو باراں کا قابل سزا ناحق جرم مے پرستی ہے

نقاب رخ اُلٹنے کو تو اُس نے بارہا اُلٹی
برا ہو اپنی حیرت کا کہ ہم خود کم نظر نکلے

دل ہے لیکن دل میں کوئی غم نہیں یہ مصیبت بھی تو آخر کم نہیں
کس کو دنیا میں ہوئی راحت نصیب کون دنیا میں اسیر غم نہیں

کسکا قرب کہاں کی دوری اپنے آپ سے غافل ہو
راز اگر پانے کا پوچھے ، کھو جانا ہی پانا ہے

ہاں دیدۂ تحقیق سے اے ذوق سفر دیکھ رہبر جسے سمجھا ہے وہ رہزن تو نہیں ہے
بے سعئی عمل خاک ہے انسان کا جینا یہ رزم گہہ زیست ہے مدفن تو نہیں ہے
تکلیف اسیری کی شکایت نہ کر اے دل یہ کنج قفس کنج نشیمن تو نہیں ہے

اجارہ دارانِ عیش و مستی زمانہ اب رخ بدل رہا ہے
کبھی تو مجھ بد نصیب کو بھی فراغت زندگی ملے گی
خرد کو بے مایہ کر نہ اتنا ، یہ زھد کیسا یہ بندگی کیا
خرد کا افلاس دور ہوگا تو دولت زندگی ملے گی

بارگاہ خزاں میں ایک ہیں سب کوئی کانٹا ہوا کہ پھول ہوا

زندگی کش مکش عشق کے آغاز کا نام موت انجام اسی درد کے افسانے کا

فریب آرزو پر لطف ہے ترک تمنا سے سکوں افزائے دل ہے عشق کی ھنگامہ آرائی

ہم صفیرو یہ مسرت کا ترانہ کیسا ہو تو لینے دو ابھی قید سے آزاد مجھے
نہ نشیمن ہے ، نہ ہے شاخ نشیمن باقی لطف جب ہے کہ کرے اب کوئی برباد مجھے

ہے دیکھنے والوں کو سنبھلنے کا اشارہ — تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں

جھک گئی نقش قدم پر جوش اُلفت سے جبیں
بے خودی میں اب تلاش جادہ و منزل کہاں

کہہ رہی تھی صُبح دم یہ شمع کی افسردگی
سوز پروانہ نہ ہو تو گرمئی محفل کہاں

سنا ہے تیری رحمت جرم عصیاں سے فزوں تر ہے
اسی اُمید پر یا رب گنہگاروں میں شامل ہوں

تاثیر آہ کی یہ کرامت تو دیکھنا — رحمت کے باب مجھ پہ فرشتوں نے وا کئے

اب تو یہ درد عشق مری زندگی ہے ''عرش'' — اب اُس نے درد عشق کا چارہ کیا تو کیا

منظومات

جنگ کوریا

بجھ گیا امن و آشتی کا دیا
جنگ کی کوریا سے آئی صدا
صلح کے راستے ہوئے مسدود
پھر چلے ٹینک پھر اُڑی بارود
شہر کے شہر کر دئے برباد
بڑھ گیا اہر من سے آدم زاد
پھر اُڑے آسماں پہ انگارے
چھا گئے پھر فضا پہ طیارے
خلق توپوں سے پائمال ہوئی
خون سے پھر زمین لال ہوئی
چہرۂ زندگی اُتر سا گیا
موت کا روپ کچھ نکھر سا گیا
سیل بن کر تباہیاں آئیں
زندگی کو جمائیاں آئیں
الاماں الاماں کا شور ہوا
ہر طرف وحشتوں کا زور ہوا
چہرۂ زیست ہو گیا ہے فق
چاک ہر سینہ ہر کلیجہ شق
بُرد باری سے دل ہوئے خالی
بج گئی دونوں ہاتھ سے تالی
صلح کے نام پر لڑائی ہے
امن عالم تیری دہائی ہے

صلح جوئی سے بڑھ گئی پیکار
آدمی آدمی سے ہے بیزار

آدمیت کا سینہ چاک ہوا
قصہ انسانیت کا پاک ہوا

آدمی زاد سے خدا کی پناہ
اسکے ہاتھوں ہے اسکی نسل تباہ

مہ جبیں دربدر پریشاں ہیں
نیک بندے نزار و نالاں ہیں

کون پرساں ہے غم کے ماروں کا
کم سنوں اور بے سہاروں کا

نوجواں ہی بچے نہ پیر بچے
مرد میداں نہ گوشہ گیر بچے

آندھیاں ظلم کی چلیں ہرسو
دور حاضر پہ صد ہزار تفو

ہاں یہی دور عقل و علم کا دور
''آشتی'' ''صلح'' اور''حلم'' کادور

یہ تعدّی یہ جور کیا کہنا
وحشتوں کا یہ دور کیا کہنا

کوئی وعدہ بھی پائیدار نہیں
ایک کو اک پہ اعتبار نہیں

جو ہے کمزور وہ غلام انکا
یہ ہے دستورِ انتقام انکا

اپنے گھر میں بجائیں عود و چنگ
غیر کے گھر میں شور فتنہ و جنگ

شعبدے ہیں یہ ملک گیروں کے
ہوس و حرص کے اسیروں کے

ساقیا یہ ہے وقت رستا خیز
آج تو لا شراب تند و تیز

تیرا بادہ ہے بادۂ صافی
ہر مرض کے لئے ہوالشّافی

ذہن انساں ہے آجکل بیمار
اب تو اسکا علاج ہے دشوار

دے اسے ایک جام ایک ہی جام
اے کہ تو ہے امین خیر انام

کھول دے میکدہ محبت کا
نام اونچا ہو آدمیت کا

ایک فرمان پر چلے عالم
ہو بنائے نظام نو محکم

تخت باقی رہے نہ کوئی تاج
سارے عالم پہ ہو عوامی راج

ہو اخوت کی اسطرح تخلیق
کالے گورے کی دور ہو تقریق

آدمی آدمی سے مل کے رہے
غنچۂ صلح عام کھل کے رہے

شرق پر جور غرب مٹ جائے
دل آدم کا کرب مٹ جائے

ہو تہ آب بحر کاہل غرق
ایشیا اور یورپ کا فرق

میکدہ

دکھا وہ میکدہ مجھ کو بھی آج پیر مغاں
ہزار صومعے جس میکدے پہ ہیں قرباں

وہ میکدہ وہ شعور و خرد کی مے کا امیں
کہ دھوئی جاتی ہے جس میں حماقت انساں

بجائے شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں　　بجائے عود مہکتا ہے جس میں سوز نہاں
وہ میکدہ کہ جہاں روح آدمیت ہے　　وہ میکدہ کہ جہاں تازہ ہوتے ہیں ایماں
وہ میکدہ کہ ہے ظلمات جہل سے محفوظ　　وہ میکدہ کہ جہاں مہر عقل ہے تاباں
جہاں بگوشۂ یک جام وسعت عالم
جہاں بگوشۂ یک دل فضائے کون و مکاں

ہولی

سحر موسیقیٔ ہُوا پھر گونج اٹھے گوکل کے بن
رقص فرمانے لگی پھر وادیٔ گنگ و جمن
پھر شباب مست نکلا مل کے چہرے پر گلال
پھر نکھر آیا بہار لالہ سے حسن چمن
پھر ہوائے تند لے کر آئی ہولی کی بہار
ہاتھ میں پچکاریاں لے کر چلے پھر مرد و زن
پھر جنون زندگی کو مل گیا نام سرور
پھر نظر آنے لگا ہر سادگی میں بانکپن
ڈھولکیں باجے مجیرے اور گھڑتالیں بجیں
پھر فضائیں ہو گئیں بنسی کی لے سے نغمہ زن
رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں گوپیاں سرتا قدم
اودے اودے ، پیلے ، پیلے ، نیلے نیلے پیرہن

جذبی

معین احسن نام جذبی تخلص، ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم جھانسی میں ہوئی - اس کے بعد ایک عرصے تک تعلیم کے سلسلے میں آگرہ، لکھنؤ اور دھلی میں قیام رہا - ۱۹۳۶ء میں عربک کالج دھلی سے بی - اے پاس کیا - پھر تلاش معاش میں بمبئی چلے گئے اور تقریباً ایک سال وھاں رہ کر لکھنؤ آ گئے - اس طرح چار سال تک مختلف شعبوں میں ملازمت کرنے کے بعد علیگڑھ جا کر ۱۹۴۰ء میں دوبارہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا اور ۱۹۴۲ء میں ایم - اے (اردو) کی ڈگری حاصل کر کے پہلے کچھ عرصہ رسالہ ''آجکل'' کے ادارتی فرائض انجام دیتے رہے پھر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہو گئے - اور آج تک اسی ادارے سے وابستہ ھیں -

جذبی صاحب نے باقاعدہ شاعری ۱۹۲۹ء سے شروع کی - ابتدائی زمانہ میں انھوں نے حامد شاھجہان‌پوری اور صادق جھانسوی سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی ھے - لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اساتذہ کی رھنمائی میں وہ صرف فن کی ابتدائی منزلیں آسانی سے طے کر گئے اور بس - جہاں تک جذبات و تاثرات کا تعلق ھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جذبی صاحب فانی سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ھوئے - یہی وجہ ھے کہ اُن کی بعض غزلیات اپنے مجموعی تاثر اور لب و لہجہ کے اعتبار سے فانی کی تو نہیں فانی کی سی معلوم ھوتی ھیں -

جذبی صاحب نظم و غزل دونوں کہتے ھیں اور دونوں میں اپنے لطیف اور نازک احساسات، اپنے شاعرانہ خلوص، اپنے شیریں تغزل، اپنے ھلکے ترنم اور اپنی مدھم مگر دلنشیں آواز کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ھیں - اُن کے کلام میں ابتدا ھی سے سنجیدہ تفکر جھلکتا ھے - اس کے ساتھ ساتھ گیتوں کا سا لوچ اور رس، اُس میں ایک ایسا نکھار پیدا کر دیتا ھے جس سے آھیں نغموں میں ڈھلتی ھوئی معلوم ھوتی ھیں - غم عشق اور غم روزگار کا ایسا لطیف امتزاج اس دور کے جن معدودے چند شعرا کے یہاں ملتا ھے اُن میں جذبی بھی ھیں - اُن کے یہاں یاس کے باوجود موت کی سردی کے بجائے زندگی کی گرمی اور تڑپ ملتی ھے جس کی وجہ سے زندگی کے قنوطی ماحول میں بھی ایک رجائی پہلو اُجاگر ھو جاتا ھے - مزید برآں انفرادیت و اجتماعیت کے صحیح توازن، سیاسی اور سماجی شعور اور موجودہ کشمکش اور پیچیدگیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں ھمیں آنے والی دنیا کی ایک جھلک نظر آتی ھے -

حضرت جذبی کا کل سرمایۂ شاعری چند غزلیں اور نظمیں ھیں - بالخصوص اپنے مختصر مجموعہ کلام ''فروزاں'' کی اشاعت کے بعد تو انھوں نے بہت ھی کم کہا ھے مگر جتنا

بھی کہا ہے اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ بچار کے بعد کہتے ہیں ۔ اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت وہ آتشیں احساس ہے جو الفاظ کو پگھلا ہوا لاوا بنا دیتا ہے ۔ ساتھ ہی اُنھیں اُس پر سحر انداز بیان پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہے جس میں کبھی محاورے سے ، کبھی چند الفاظ کی تکرار سے ، مگر زیادہ تر جذبات کی صداقت اور اصلیت سے روح کو تڑپا دینے والی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔

جذبی صاحب ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے مگر اُن کی ترقی پسندی قاضی نذر الاسلام یا جوش کی باغیانہ شاعری سے مختلف ہے بلکہ اُن کے غم میں ایک وسعت اور اُن کے ماتم میں سینکڑوں دکھے ہوئے دلوں کی فریاد ہوتی ہے ۔ اس کی سب سے اچھی مثال اُن کی نظم ''فطرت ایک مفلس کی نظر میں'' ہے ۔ اس کے علاوہ اُن کی دوسری نظمیں مثلاً ''موت'' ''تو ہم'' ''طوائف'' وغیرہ بھی قابل مطالعہ ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں ہمیں شاعری کا کوئی نہ کوئی انوکھا تجربہ ضرور مل جاتا ہے ۔ خاص طور پر ''موت'' تو اُن کی سب سے اچھی نظم ہے جس میں سوئی ہوئی دنیا کو جگانے کا جو ولولہ ہے ، آنکھیں ملنے اور ہوش میں آنے کا جو عزم ہے ، کچھ رنگین اور پر اسرار محل بنانے کا جو حوصلہ ہے ، محبت اور شرافت کے وهموں سے نکل آنے کا جو ارادہ ہے ، وہ اُن کی ترقی پسندی اور شعریت دونوں کے اعتبار سے لائق ستائش ہے ۔ اسی طرح اُن کی غزلیں بھی اچھے اسلوب اور سچے خیال کی آئینہ دار ہیں ۔ اور اُن میں سے بعض میں تو زندگی اپنی پوری پہنائیوں اور عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے ۔

غرض جذبی صاحب جدید شعراء میں صف اول کے شاعر ہیں ۔ اور اُن کا کلام زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ فنی و جمالیاتی اقدار کا بھی حامل ہے ۔ آپ کا مجموعہ کلام ''فروزاں'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

مشعل تھے جو بحر ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو ! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم اُن اُمیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک اُن تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے
یہ عرش محبت ہے میرا ، اے طائر سدرہ ہوش میں آ
اس لاحاصل سی کوشش میں تخئیل کے شہپر ٹوٹ گئے
تو اور غم الفت ''جذبی'' مجھ کو تو یقیں آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں ، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

ہم دھر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں ، آہوں میں اشارا کرتے ہیں
کیا تجھ کو پتہ ، کیا تجھ کو خبر ، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھکو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں
کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے ، کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لئے ہم اے ''جذبی'' کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

ملے غم سے مجھ کو فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرت شبانہ
یہی زندگی مصیبت ، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت ، یہی زندگی فسانہ
کبھی درد کی تمنا ، کبھی کوشش مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش کبھی فکر آشیانہ

دل میں کچھ سوز تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں آجالے کے سماں ملتے ہیں

وہی ویرانگئی شوق، وہی تیشۂ غم
راہ چلئے تو وہی کوہ گراں ملتے ہیں

آج بھی کلیوں کے رخسار سے اڑ جاتا ہے رنگ
آج بھی پھول ملول و نگراں ملتے ہیں

آج بھی ریگ بیاباں کے تپش زاروں میں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں

آج بھی جسم اسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں

آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا دھوکا جن پر
آج بھی لب ہیں کہ سر گرم فغاں ملتے ہیں

آج بھی سر سے گزر جاتی ہیں امواج بلا
آج بھی اپنے ابھرنے کے نشاں ملتے ہیں

ہاں اسی منزل صد کیف و طرب کی جانب
قافلے آج بھی اشکوں کے رواں ملتے ہیں

اے مرے ہم سفرو اس کو تو منزل نہ کہو
آندھیاں اٹھتی ہیں طوفان یہاں ملتے ہیں

ان کے ہر وعدۂ الطاف کی رنگینی میں
کتنے نادیدہ ستم ہائے گراں ملتے ہیں

یوں گوارا ہے یہ خونبار افق کا منظر
اس کے پر تو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

جاگ اے نسیم! خندۂ گلشن قریب ہے
اٹھ اے شکستہ بال! نشیمن قریب ہے

تاریک رات اور بھی تاریک ہو گئی
اب آمد آمدِ مہ روشن قریب ہے

لو دے اٹھا ہے ساز جفا کا ہر ایک تار
ہنگام رقص آتش و آہن قریب ہے

ایوان و پاسباں کے حجابات بے محل
اس دست شوق سے ترا دامن قریب ہے

آن بجلیوں کی چشمک باهم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب هے

کیا یہی انقلاب هے، قلب ادھر جگر آدھر
نالۂ بیقرار ادھر، شورش چشم تر آدھر
آف ری سیاست چمن، رنگ کو بو سے سوء ظن
کور هے نرگس وطن نور ادھر نظر آدھر
ایک تبسم فرنگ، هر دو آفق لہو ترنگ
نعش بدوش و نالہ رنگ، شام ادھر سحر آدھر
اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو
آج اسی عقاب کے بال ادھر ھیں پر آدھر
کام و دھن کی تلخیاں، کوئی مٹا دے اب کہاں
وائے بہ حال تشنگاں، شِیر ادھر شکر آدھر
قلت صلح کل یہاں، قلت صلح کل وھاں
کثرت فتنہ گر ادھر، کثرت فتنہ گر آدھر
اھل ھنر کے واسطے خاک بسر کے واسطے
جور و جفا کا گھر ادھر، قہرو بلا کا گھر آدھر
برگ سے بر سے پوچھئے، نخل و شجر سے پوچھئے
کون هے بارور ادھر، کون هے باثمر آدھر
ایک مریض نیم جاں، ایک مریض خستہ جاں
کون هے چارہ جُو ادھر، کون هے چارہ گر آدھر
اھل فراق کچھ بتاؤ، اھل مذاق کچھ بتاؤ
کون سی شے هے خوب ادھر، کونسی خوب‌تر آدھر
هجر کی رات هے طویل، وصل کی صبح دور هے
جذب ابھی هے ناتمام، خام ابھی شعور هے

تمہارے جلووں کی رنگینیوں کا کیا کہنا
ہمارے آجڑے ھوئے دل میں اک بہار تو هے

سوال شوق پہ کچھ اُن کو اجتناب سا ہے
جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب سا ہے

جہاں تک آخری نظریں تری مشکل سے پہنچی ہیں
وہی منزل کی حد ہے خواب منزل دیکھنے والے

اس طرف اک آشیانے کی حقیقت کُھل گئی
اُس طرف اک شوخ کو بجلی گرانا آ گیا

گلشن میں گیا میں اور واں سے غنچوں کی خموشی لے آیا
اور تو جو وہاں جا نکلا تو پھولوں کو ہنسی تک دے آیا

ہزار بار کیا عزم ترک نظارہ　　ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو

اک ایسا راز دیا ہے مجھے چھپانے کو
جسے وہ چاہیں تو خود بھی چھپا نہیں سکتے

جب محبت کا نام سنتا ہوں　　ہائے کتنا ملال ہوتا ہے

آہ بھی اک کوشش ناکام ہے میرے لئے
ایسی صہبائے کہن اور خام ہے میرے لئے
میری عرض شوق بے معنی ہے اُن کے واسطے
اُن کی خاموشی بھی اک پیغام ہے میرے لئے

اس حرص و ہوا کی دنیا میں ہم کیا چاہیں ہم کیا مانگیں
جو چاہا ہم کو مل نہ سکا ، جو مانگا وہ بھی پا نہ سکے

منظومات

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہان بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ مرا سِحر، وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین، پر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن !!
آنسوؤ ! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وھموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگئی غم کو تو دیکھا ہوتا

کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلوّن سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس، پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرض وفا سے بیزار

فطرت ایک مفلس کی نظر میں

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا کیا حسن ہے ان گلزاروں میں
ہے کون سی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں

وہ خواہ سلگتے ہوں شب بھر، وہ خواہ چمکتے ہوں شب بھر
میں نے بھی تو دیکھا ہے اکثر کیا بات نئی ہے تاروں میں

اس چاند کی ٹھٹھری کرنوں سے مجھ کو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
مجھ کو تو جنوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں

یہ چپ چپ نرگس کی کلیاں، کیا جانے کیسی کلیاں ہیں
جو کھیلتی ہیں، جو ہنستی ہیں اور پھر بھی ہیں بیماروں میں

یہ لال شفق، یہ لالہ و گل، اک چنگاری بھی جن میں نہیں
شعلے بھی نہیں، گرمی بھی نہیں، ہیں تیرے آتش زاروں میں

کیا تجھ کو نظر آتی ہی نہیں، یہ لرزش سی، یہ سوزش سی
یہ موت کی ہلکی زردی سی، ان صبح کے مدھم تاروں میں

اُس وقت کہاں تو ہوتا ہے ، جب موسم گرما کا سورج
دوزخ کی تپش بھر دیتا ہے دریاؤں میں ، کہساروں میں
جاڑے کی بھیانک راتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی
ہاں وہ تیزی ، وہ بے مہری جو ہوتی ہے تلواروں میں
دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجھ کو مبارک ہو لیکن
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی چکراتی ہے منجدھاروں میں
کوئل کے رسیلے گیت سنے لیکن یہ کبھی سوچا تو نے
ہیں اُلجھے ہوئے نغمے کتنے اک ساز کے ٹوٹے تاروں میں
بادل کی گرج ، بجلی کی چمک ، بارش میں وہ تیزی تیروں کی
میں ٹھٹھرا سمٹا سڑکوں پر ، تو جام بلب میخواروں میں
سب ہوش و خرد کے دشمن ہیں ، سب قلب و جگر کے رہزن ہیں
رکھا ہے بھلا کیا اس کے سوا ان راحت جاں مہ پاروں میں
وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں ، کیسی زہرہ ، کیسی پرویں
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں
جب جیب میں پیسے بجتے ہیں ، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے ، اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

سردار جعفری

علی سردار نام - جعفری نسبت خاندانی سے مشہور ہیں آپ کی پیدائش ریاست بلرام پور (اودھ) میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی - والدین کا ارادہ مولوی بنانے کا تھا چنانچہ لکھنؤ کے ایک دینی دارالعلوم ''سلطان المدارس'' میں داخل کر دئے گئے لیکن ۱۹۲۵ء میں مدرسہ چھوڑ کر آپ بلرام پور ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے - ۱۹۳۰ء میں جہازرانی (بمبئی) میں ے لئے گئے مگر والدین نے واپس بلا لیا - ۱۹۳۲ء میں جب آپ بی - اے کے طالب علم تھے اسٹرائک میں حصہ لینے کے جرم میں وہاں سے نکال دئے گئے - ۱۹۳۸ء میں عربک کالج دہلی سے بی - اے کیا - علی گڑھ تک گاندھی جی کی آپ بیتی کا اثر دماغ پر بہت تھا لیکن مارکس اور اینگلز کی تعلیمات نے یہ اثر زائل کر دیا - ۱۹۳۵ء میں جب لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی تو اُس کا ایک جلسہ علی گڑھ میں ہوا - اس جلسہ میں علی سردار صاحب نے ایک مقالہ ''جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' کے عنوان سے پڑھا جو انجمن کے اعلان نامے سے متاثر تھا - اسی وقت سے اُن کی جدید ادبی کاوشوں کی ابتدا ہوتی ہے -

۱۹۳۶ء میں ''آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کی بنیاد پڑی جعفری صاحب ابتدا ہی سے اس میں شریک ہوگئے - ۱۹۳۹ء میں سبط حسن صاحب اور مجاز صاحب کی معیت میں لکھنؤ سے رسالہ ''نیا ادب'' نکالنا شروع کیا - اسی سال لکھنؤ یونیوسٹی میں ایم - اے میں داخلہ لیا لیکن ایک ہی سال گزرنے پایا تھا کہ دسبر ۱۹۴۰ء میں سیاست میں حصہ لینے کے باعث گرفتار کر لئے گئے اور لکھنؤ اور بنارس جیل میں رہے - رہا ہونے کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے پھر بمبئی چلے گئے چنانچہ تا حال وہیں مقیم ہیں اور پارٹی کے کاموں میں شب و روز مصروف و منہمک رہتے ہیں -

علی سردار جعفری دور حاضر کے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے حیات انسان کی تاریخی رفتار' بالخصوص حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ کر کے جدید رجحانات کو بڑی فکر و بصیرت سے اپنے کلام میں سمویا ہے - اس میں شک نہیں کہ اُن کی شاعری کا معتدبہ حصہ جماعی ہے چونکہ وہ اپنی پارٹی کے مخلص کارکن ہیں اور اُنہوں نے اپنی ساری ہستی اور سارے فن کو صدق دل سے اپنی جماعت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کی شاعری ایسی وقیع و متین اور شائستہ و پختہ ہے کہ اُسے کسی حالت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا -

علی سردار صاحب کے کلام کی سب بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گو بقول خود ع ''چھیڑتا ہوں بربط دل کو نئے انداز سے'' اُنہوں نے اپنے نغمے ایک نئے رنگ و آہنگ

کے ساتھ پیش کئے ہیں مگر اُن کا یہ نیا انداز بہت رچا ہوا اور اُس میں ہماری موروثی روایات شاعری کی تمام شائستگی و تہذیب بڑی لطافت و خوبی کے ساتھ سموئی ہوئی ہے - یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام عام ترقی پسند شعرا کی طرح ہیجانی نہیں بلکہ اُس میں ایک عمق پایا جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں ماضی ، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا بلیغ و واضح تصور موجود ہے - چنانچہ وہ جو بات بھی کہتا ہے اُس میں سنجیدگی و اعتماد کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے -

جہاں تک اُن کی نظموں کے موضوعات کا تعلق ہے وہ اکثر و بیشتر ہماری موجودہ زندگی کے مسائل پر لکھی گئی ہیں - چنانچہ ''تاریخ'' ''آثار سحر'' ''ارتقاء و انقلاب'' ''خواب و خیال'' وغیرہ اور آزاد نظموں میں ''آنسوؤں کے چراغ'' ''خواب'' ''رومان سے انقلاب تک'' جیسی منظومات سب اسی عنوان کی چیزیں ہیں - ان کے علاوہ اُنھوں نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں - لیکن اُن کی رومانی نظموں میں مظلومیت کی بجائے ایک حوصلہ انگیز انبساط ہوتا ہے اور ساتھ ہی سعی و عمل اور انقلاب و ترقی کی طرف ذوق انگیز اشارے بھی ملتے ہیں - اس سلسلے میں اُن کی ''لکھنؤ کی ایک شام'' ''انتظار نہ کر'' ''حسن نا تمام'' ''فراموش کردند عشق'' ''حسن سوگوار'' وغیرہ نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں - چونکہ ان میں ایک طرف تو وہ تمام اسلوبی لطافتیں اور لب و لہجہ کی وہ ساری نرمیاں موجود ہیں جن کو ہم رومانیت اور تغزل سے منسوب کرتے ہیں دوسری طرف ان میں بدلتی ہوئی زندگی کی اُن نئی توانائیوں کا بھر پور احساس ملتا ہے جو دور جدید کی لازمی علامتیں ہیں -

علی سردار صاحب کے اسلوب بیان کے بارے میں حضرت مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں '' اُن کا سارا فن غیر شخصی ہے اور اس فن کو اُنھوں نے فن لطیف بنانے میں حیرت ناک حد تک کامیابی حاصل کی ہے - یعنی اُن کے اسلوب میں بھرپور جمالیاتی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں اور یہ نمایاں طور پر اقبال کے مطالعے کا اثر معلوم ہوتا ہے - علی سردار اپنے اسلوب میں کس حد تک صرف جوش سے متاثر ہیں - ورنہ ان کی ننانوے فیصدی شاعری اقبال کے اثر کی علامتیں لئے ہوئے ہے - اُن کے مصرعوں اور مصرعوں کے ٹکڑوں میں جو مدھم ، ہموار اور پرسکون ترنم ہوتا ہے وہ بے اختیار اقبال کی یاد دلاتا ہے - بے شک اُن کے یہاں اکثر الفاظ نئے ملتے ہیں اور ایسے کہ اس سے پہلے شاعری میں استعمال نہیں کئے گئے لیکن مجموعی طور پر اُن کے اسلوب اور انداز بیان میں وہی رچی ہوئی پختگی ہوتی ہے جو اقبال کے سوا کسی دوسرے نظم نگار کو میسر نہیں ہوئی -'' اس میں شک نہیں کہ حضرت مجنوں کی یہ رائے نہایت صحیح و متوازن ہے لیکن چونکہ اُن کی یہ رائے ''پرواز'' کی منظومات کے بارے میں تھی جس مجموعے میں کوئی آزاد نظم شامل نہیں ہے اس لئے جعفری صاحب کی چند بعد میں کہی ہوئی منظومات (جن میں اُن کی آزاد نظمیں بھی شامل سمجھنا چاہئے) کے انداز بیان کو دیکھ کر یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات اُن کے لب و لہجہ میں زیادہ تندی و تیزی بلکہ تلخی بھی پیدا ہو گئی ہے - جس کو اُن کے جماعتی مسلک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے تاہم شاعرانہ نقطۂ نظر سے اگر وہ اسلوب میں نرمی و گداختگی ہی سے کام لیں تو زیادہ مناسب ہوگا -

غرض علی سردار صاحب اپنی شاعری کی گونا گوں خصوصیات کی بدولت نوجوان شعرا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور وہ چونکہ مستقبل کا صحیح اور قطعی درک رکھتے ہیں اس لئے اُن کا کلام مستقبل کی بشارت لئے ہوئے ہے - آپ کے کئی مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں - جیسے ''پرواز'' ''خون کی لکیر'' ''کشمیر جاگ اٹھا''

انتخاب کلام

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
خراج اپنی جوانی سے دے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں
بس اب نوازش پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عذار نرم پہ رنگ بہار رہنے دے
نگاہ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے
متاع حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
شکست ساز کی، ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی، ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم
اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

حسن سوگوار

کیا کہوں کیا ہے وہ حسن سوگوار
جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار

خال و خط میں آن نگاہوں میں شراب
ہلکی ہلکی سانس میں روح شباب

انکھڑیوں میں خواب و بیداری لئے
زلف کے ہر خم میں دنداری لئے

بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول

ہو کے چپ جب بیٹھ جاتی ہے کبھی
خامشی سے پھوٹتی ہے راگنی

آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی ہے اگر
جم کے رہ جاتی ہے سورج کی نظر

پھر بھی رخ پر ہے اداسی کا غبار
جس طرح پھولوں پہ شبنم کی پھوار

آسماں پر شام کی پرچھائیاں
آئینے پر ہلکی ہلکی جھائیاں

صبح کے منظر پہ کہرے کا اثر
ابر کی چادر عروس ماہ پر

ادھ کھلے، مخمور آنکھوں کے کنول
ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل

قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش
انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش

شوق کی برنائیوں سے بے قرار
عشق کی ناکامیوں سے سوگوار

رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی
حلقۂ تدبیر میں جکڑی ہوئی

لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں
دل میں کڑھتی ہے مگر کہتی نہیں

ہنستے ہنستے جیسے کھو جاتی ہے وہ
بات کرتے کرتے سو جاتی ہے وہ

سوچ کر کچھ ڈبڈبا آتی ہے آنکھ
چپکے چپکے اشک برساتی ہے آنکھ

روتے روتے مسکرا دیتی ہے وہ
دل میں شمعیں سی جلا دیتی ہے وہ

اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں
اس کے غم اتنے ہی دل آویز ہیں

تاریخ

تری نگاہ نے دیکھا ہے ملتوں کا عروج
تری نظر میں فسوں کار امتوں کا زوال

ترا شباب ترے بچپنے سے ہم آہنگ
تمام عمر تری داستان جنگ و جدال

خزینہ دار ہے تو ارتقائے عالم کی
ترے غلام ہیں ماضی و حال و استقبال

تجھے قسم ہے انھی تجربات پیہم کی
ادھر بھی دیکھ یہ نکلا ہے کون لیکے کدال
زمیں سے خون کا چشمہ ابلنے والا ہے
زمانہ سوز تحمل سے جلنے والا ہے

ارتقاء و انقلاب

ایک ہی قوت عطا کرتی ہے تاروں کو چمک
چاند کو تنویر سورج کو نگاہ شوخ و شنگ
کشت زاروں کو تبسم کوہساروں کو سکوت
پھول کو بو، تاک کی نبضوں کو خون لالہ رنگ
سرکشی طوفان کو ملاّح کے بازو کو زور
کشتئی امید کے پتوار کو کھینے کے ڈھنگ
وقت کے شہپر کو سرعت وہم کے پرواز کی
عہد پارینہ کی فطرت کو جمود خشت و سنگ
زندگی کے نظم افسردہ کو خوئے انقلاب
مفلسی کو منعمی کی ساحری سے شوق جنگ
رقص نشتر ہو چکا اب ضربت کاری بھی دیکھ
ارتقائے زندگی کی تیز رفتاری بھی دیکھ

ٹوٹا ہوا ستارہ

(انفرادیت کی شاندار ناکامی)

آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلہ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامان ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئین فطرت کو نثار

کس قدر بے باک کتنا تیز ، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا ہے کرۂ گیتی کا شوق انتظار
لیکن ایسے انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتے ہیں اپنی تابناکی کا شکار

اُردو

ہماری پیاری زبان آردو
ہمارے نغموں کی جان آردو
حسین و دلکش جوان اردو

زبان وہ دُھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زبان سے ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
جوان ہو کر اسی زبان میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
اسی زبان کے چمکتے ہیروں سے جھولیاں علم کی بھری ہیں
اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب[1] پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خود سری کا جواب پایا
اسی سے میری جواں تمنا نے شاعری کا رباب پایا
یہ اپنے نغمات پر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
ستمگروں کی ستمگری پر ہزار ہا وار کر چکی ہے
کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے جہاں ہم جھجک گئے ہوں
وہ کون سی رزمگاہ ہے جس میں اہل آردو دبک گئے ہوں
وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میداں میں آئے ہوں اور ٹھٹک گئے ہوں

[1] ''انقلاب زندہ باد'' تحریک آزادی کا سب سے مشہور نعرہ آردو زبان ہی کی دین ہے ۔

یہ وہ زبان ہے کہ جس نے زنداں[1] کی تیرگی میں دئے جلائے
یہ وہ زبان ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فراز دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی[2] کے گیت گائے
کہا ہے کس نے ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھن جائے گی ہماری دھن سے، ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے
یہ کیسی باد بہار ہے جس میں شاخ اُردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہئے جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی
ہمیں یہ حق ہے، ہم اپنی خاک وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخ گل تو پھر کیوں نہ اس پہ ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں
کہاں ہو متوالو! آؤ، بزم وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زباں کی ہے زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا
ہماری اُردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستاں ہمارا
چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم تو باد بہار بن کر
ہمالیہ سے اُتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر

متفرقات

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

گزشتہ دور خواب آلودہ پیری کا سہارا ہے
شکست عصر حاضر میں ہیں مستقبل کی تعمیریں

---

[1] اُردو کے در جنوں ادیب اور شاعر قید فرنگ میں رہ چکے ہیں۔
[2] سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تڑپ قطروں کی جب بڑھتی ہے موجوں میں نہاں ہو کر
پہاڑوں سے گزر جاتی ہے جوئے نغمہ خواں ہو کر

ڈر نہ حیات و موت کے سیل سبک خرام سے
غلطاں ہر ایک موج میں تابش صد گہر بھی ہے

کش مکش، عظمت کردار عطا کرتی ہے
زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن نا تمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آداب محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

وقار انبالوی

ناظم علی متخلص به وقار قصبه ملانه ضلع انباله کے رہنے والے ہیں جہاں ۲۲ فروری ۱۹۰۴ء کو آپ کی پیدائش ہوئی - موصوف کے آباؤ اجداد نصیر الدین ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے - آپ کا شجرۂ نسب حضرت عیص بن اسحاق علیہ السلام سے ملتا ہے - ملانہ کو ان کے مورث اعلیٰ ملا محمد طاہر نے مغل بادشاہوں سے جاگیر میں پایا اور اس کا نام عہد شاہجہان میں چنار تھل سے بدل کر مغلانہ رکھا گیا جو بعد میں ملانہ رہ گیا - وقار صاحب کے بیشتر اعزہ و رفقاء کا پیشہ زراعت رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دیہات اور وہاں کی سادہ زندگی سے نہ صرف حضرت وقار کو عشق ہے بلکہ اس کی جھلک اُن کے کلام میں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے -

وقار صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال پشاور میں گزارے ہیں جہاں آپ کے دادا قدرت علی صاحب جیلر کے عہدہ پر فائز تھے - قدرت علی صاحب کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا چنانچہ پشاور کے دوران قیام میں وقار صاحب کے کان شعر وشاعری سے آشنا ہوئے پھر اتفاق سے دادا کے انتقال کے بعد جب وہ ملانہ گئے تو وہاں وقار صاحب کے والد صفدر علی صاحب نے نواب احمد مرزا دھلوی کی ایک عزیزہ سے عقد ثانی کر کے اپنے ارد گرد ایک شیعی ماحول پیدا کر لیا تھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب وقار میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام سے بخوبی روشناس ہوئے - ساتھ ہی چونکہ اُن کی نئی والدہ اہل زبان ہونے کے علاوہ اچھی شاعرہ بھی تھیں اس لئے اُن کی صحبت میں اُنہوں نے زبان میں بھی خاصی دستگاہ حاصل کی اور شعر و شاعری کا جو ذوق اُن کے وجدان میں پہلے سے جگہ بنا چکا تھا وہ بھی نکھرنا شروع ہوا غرض زبان دانی اور فن شعر سے آگاہی کے معاملے میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ اپنی والدہ کے رہین منت ہیں - اور غالباً یہ اُنہیں محترمہ کا فیضان صحبت ہے کہ موصوف کو پھر کسی سے مشورۂ سخن لینے کی ضرورت نہیں پڑی -

وقار صاحب پاکستان کے قیام سے پہلے غیر منقسم ہند کے ممتاز صحیفہ نگاروں اور شاعروں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد جہاں وہ پاکستان کے ایک قابل احترام صحافی اور شاعر ہیں وہیں اُن کی افکار سے بر عظیم ہند و پاکستان کے وہ تمام حلقے جنھیں صحافت و سیاست سے کچھ بھی دلچسپی ہے مستفید اور لطف اندوز ہو رہے ہیں - موصوف کی صحافت کی ابتدا پرتاپ ، ملاپ اور ویر بھارت وغیرہ کانگریسی اخبارات کے فکاہی کالم لکھنے سے ہوئی - اس کے بعد آپ بعض نظریاتی اختلافات کی بنا پر ان اخبارات سے علیحدہ ہو کر ۱۹۳۹ء میں روز نامہ احسان میں آئے اور اُس وقت سے لے کر تقسیم ہند تک اُس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے - اس دوران میں آپ نے

۱۹۴۰ء میں مشرق وسطیٰ اور ۱۹۴۱ء میں ملایا وغیرہ کا سفر بھی کیا - تقسیم کے بعد آپ نے اپنا اخبار ''سفینہ'' نکالا- لیکن ۱۹۵۱ء میں جب وہ بند ہو گیا تو آپ دوبارہ ''احسان'' کے مدیر ہوگئے - یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رہا پھر آپ روزنامہ ''آفاق'' کے عملۂ ادارت میں شامل ہوئے اس کے بند ہو جانے کے بعد پھر احسان میں چلے گئے اور تا حال اسی سے متعلق ہیں -

وقار صاحب جیسا کہ اُن کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے' روایتی شاعری کے قائل نہیں ہیں- یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے شروع سے غزل کی بجائے نظم کو اپنے جذبات و احساسات کا ذریعہ اظہار بنایا ہے اور اب تک جو کچھ کہا ہے اُس میں غزل سرے سے ناپید ہے - یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی طرح چونکہ وقار صاحب کا تعلق بھی بیشتر صحافت سے رہا ہے اس لئے اُن کے یہاں بھی ہنگامی شاعری کے نمونے بڑی کثرت سے ملتے ہیں- بالخصوص اُن کے دو آخری مجموعے ''بیان حال'' اور ''زبان حال'' ایسی منظومات پر مشتمل ہیں جن میں موصوف کی طنز نگاری' ہنگامی سیاست و صحافت پر اُن کی گہری نگاہ' اور فکر و نظر کے انمٹ نقوش نظر آئیں گے - یہ مجموعے در اصل قیام پاکستان کے بعد ملک کی سیاسی زندگی اور سیاست پنجاب کی افسوسناک تصویر کے ایسے نقوش ہیں جن کے مطالعہ سے بیک نظر ہم اس کے اسباب و علل کو لطیف طنز کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں - ان مجموعوں کی بعض نظمیں ایسی ہمہ گیر قدروں کی حامل ہیں جو کسی وقت' کسی زمانے اور کسی ملک کے ایسے جمہوری نظام کی ترجمان بن سکتی ہیں جہاں جمہوریت اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہو پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام سیاسی نظمیں ایسے دلچسپ اُسلوب بے ساختہ انداز اور روز مرہ کی زبان میں لکھی گئی ہیں کہ پڑھنے والا ان سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - البتہ ان مجموعوں میں غلطی سے بعض ایسی نظمیں بھی منتخب کر لی گئی ہیں جو طنز و ظرافت کے درجہ سے گر کر ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے - مثال کے طور پر ''کاٹھ کے اُلو'' ہی ایک ایسی نظم ہے جسکی تفصیلات میں گئے بغیر قاری محض عنوان سے اس کی ثقاہت کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے -

ان منظومات سے قطع نظر وقار صاحب نے کچھ رزمیہ اور کچھ دیہات سے متعلق نظمیں بھی کہی ہیں - اُن کی رزمیہ نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص ہندوستانی ہیں یعنی اُردو مراثی کے برعکس اُن کے کردار' واقعات طرز تخیئل اور انداز بیان سب میں ہندوستانی فضا اور ماحول کا پر تو صاف نظر آتا ہے - پھر اُن کی تخیئل کے تواتر اور التزام سے افراد متعلقہ کی ذہنیت متاثر ہوتی ہے جو آگے چل کر سماج میں جرأت و جوانمردی کا جذبہ پیدا کرتی اور فطرت انسانی کو ایک نیا جامہ بھی عطا کرتی ہے - جہاں تک اُن کی دیہاتی نظموں کا تعلق ہے - بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وقار صاحب بذات خود دیہات' وہاں کی دلکشی و پر سکون فضا اور دیہاتیوں کی سادہ و معصوم زندگی کے شیدائی ہیں اس لئے اُن کی اس طرح کی نظموں

میں دیہات کی ان خصوصیات کا تذکرہ انتہائی چابکدستی ' بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ ہوتا ہے ۔

مختصر یہ کہ گو وقار صاحب ایک پر گو شاعر ہیں لیکن اُن کی پر گوئی میں بھی ایک بے تکلفی اور شگفتہ پن ضرور پایا جاتا ہے ۔ ساتھ ہی ہنگامی واقعات کے نظم کرنے میں تو اُنھیں ایسی مہارت حاصل ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہوگی ۔ موصوف کی نثری کاوشوں سے قطع نظر منظومات کے تین مجموعے ''آھنگ رزم'' ''بیان حال'' اور ''زبان حال'' منظر عام پر آ کر خاصے مقبول ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

سپاہی کا معبد

یہ سرحد جس پہ ملتے ہیں حیات و موت کے ڈانڈے
یہ معبد جس کی زینت ہیں کمانیں ' برچھیاں ' کھانڈے
یہ مندر ' سنکھ اور گھنٹے بجاتا ہے زحل جس میں
یہ مسجد ۔ دعوت تسبیح دیتی ہے اجل جس میں
وضو خوں سے نہ ہو جب تک نہیں اس میں روا سجدہ
یہاں سر کٹ کے گرتا ہے تو ہوتا ہے ادا سجدہ
یہاں تسبیح کے دانے ہیں دل طاعت گزاروں کے
عوض پھولوں کے چڑھتے ہیں یہاں سر جاں سپاروں کے
یہاں ماتھے پہ ٹیکا خون سے چنڈی لگاتی ہے
یہاں غیرت سروں کی بھینٹ ہر لحظہ چڑھاتی ہے
عقیدت اس کے دیوانوں کے دل میں ''ھُو'' کی ہے
یہاں زمزم لہو کا ہے تو گنگا بھی لہو کی ہے
کلس پر اس کے ہمت اپنا پرچم لہلہاتی ہے
صدا ''ھل من مبارز'' کی ہر اک پہلو سے آتی ہے
یہاں دیتی ہے غیرت موت کی دیوار کو بوسہ
عقیدت کے لئے لازم یہاں تلوار کو بوسہ

یہاں مقبول ہوتی ہے عبادت نوجوانی کی
یہیں سے راہ ملتی ہے حیات جاودانی کی
یہاں احساس اور ادراک رہ رہ کر اُلجھتے ہیں
یہاں زنار اور تسبیح کے عقدے سلجھتے ہیں
خلاصہ رونق کونین کا ہے کشمکش اس کی
بقا اک خادمہ اس کی ، فنا جاروب کش اس کی
کفن بندی ہے اس کے باغ نصرت کی چمن بندی
یہاں کی بندگی ہے درحقیقت اک خداوندی
وظیفہ ہے یہاں ہر دم وطن کی خیر خواہی کا
ادب اے شوق نظارہ ! یہ معبد ہے سپاہی کا

گاؤں

گاؤں ! اے تہذیب انسانی کے نقش اولیں !
زندگی کے دور عمرانی کے نقش اولیں !
منزل صحرائیت کی آخری حد کے نشاں
تیرے ٹوٹے پھوٹے بیڈھنگے سے گارے کے مکاں
کہنہ دیواریں تری تاریخ ماضی کے ورق
تیرے مکتب سے ملا پہلا حضارت کو سبق
آدمی جنت سے نکلا تیرے دامن میں بسا
اس مسرت اور آزادی کے مامن میں بسا
بحر وحشت کا شناور تیرے ساحل پر رکا
دشت و صحرا کا مسافر تیری منزل پر رکا
رہروان زندگی کی منزل اول ہے تو
بار تہذیب بشر کا حامل اول ہے تو
رہنمایان بشر تیری ہی بستی سے اُٹھے
مہر و ماہ ونجم کیا کیا تیری پستی سے اُٹھے
یہ ترے کچے گھروندے مسکن اشراف ہیں
تیری چوپالیں ستونِ کعبۂ انصاف ہیں

بے ریا بھولے ترے معصوم اور سادہ مکیں
محنت و اخلاص و دلداری کے دلدادہ مکیں
روح کا سامان عشرت تیرے دلکش گیت ہیں
اور تری بستی کے باسی ہر کسی کے میت ہیں
نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتیں تری
'پی کہاں' کے نور سے پر نور برساتیں تری
دھوپ سے آباد تیری سردیوں کی ہر سحر
چھاؤں سے دلشاد تیری گرمیوں کی دو پہر
تیری صبح و شام کا سادہ مگر دلچسپ رنگ
آدمی کے دل میں بس رہ رہ کے اٹھتی ہے اُمنگ
ڈھاک کے پھول، آم کے پھل، چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
رشک کھائے بادشاہت اُس پہ ہفت اقلیم کی
لیکے چوپایوں کے گلے خانۂ دھقان سے
پھرتے ہیں چرواہے اک پیغمبرانہ شان سے
کھیت میں خود دار مزدور اور جفاکش محنتی
جن کا مسلک ہے عمل اور جن کا مشرب سادگی
تیرے میدانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار
تیرے ویرانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار
حسن سادہ کی فسوں خیزی! الٰہی الاماں!
عشق صادق کی جنوں خیزی! الٰہی الاماں
پاسدار عصمت مریم، کنواری لڑکیاں
ناشناس فکر بیش و کم، کنواری لڑکیاں
ناچتے ہیں گیت اُن کی محنتوں کے ساز پر
چکیوں کی منضبط اور دل ربا آواز پر
اک طرف ساون کی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار
اک طرف ان کے سریلے مست گیتوں کی بہار
سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں
گرمیوں کی دوپہر میں باھمی دلجوئیاں
شہر کے پر شور ہنگاموں سے گھبراتا ہوں جب
رات دن کی کاھش پیہم سے اُکتاتا ہوں جب

تیری جانب دوڑ کے بے ساختہ آتا ہوں میں
دل کا اطمینان اس ماحول میں پاتا ہوں میں
تجھ سے وابستہ مرا سرمایۂ تاب و قرار
کچھ عزیزوں کے مکاں ہیں کچھ بزرگوں کے مزار
وقت کی رفتار مجھ کو یاں نظر آتی ہے سست
جسم کی بگڑی کلیں ہوتی ہیں یاں آ کر درست
زندگی کی حرکتوں میں اک سکون دل نواز
شادمانی خرمی کا اک فسون دل نواز
تیرے میدانوں کی وسعت میں مرا پیک خیال
چار جانب دوڑتا ہے بے کے ادراک جہاں
لطف اٹھاتا ہوں تری روشن فضا میں بیٹھ کر
گیت گاتا ہوں تری تازہ ہوا میں بیٹھ کر
میری خواہش، میری آسائش مری مرضی ہے تو
گاؤں کیا؟ میری نظر میں جنتِ ارضی ہے تو

ایک لیگی رہنما سے

خدا نے تجھ کو دیا ہے دل حمیت کوش
سریر و تاج پہ ہنستے ہیں تیرے خرقہ پوش
پہنچ سکے نہ ترے شہپر عزیمت کو
اگرچہ پھرتے رہے صید مند دام بدوش
تری نگاہ سے ٹوٹا فرنگیوں کا طلسم
ترے کلام نے غیروں کو کر دیا خاموش
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربت کاری
بتان عصر ترے خوف سے رہیں روپوش
قوی پہ طنز رہے ترا جسم زار و نحیف
ترے عتاب سے عاجز ہو صاحب تن و توش
تری زباں پہ رہے لا الہ الا اللہ
ترے لہو میں رہے زندگی کا جوش و خروش
سمجھ یہ نکتہ کہ تقدیر روبہ فردا ہے
لپٹ چکا تہ ماضی میں کارنامۂ دوش

کٹھن ہے راہ تمنا قدم بڑھائے جا
قضا و قدر کے رہگیر ہیں ترے ہم دوش
ترے عمل پہ تقاضا ہے سخت کوشی کا
امیر قافلۂ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری زکرّاری ست

ممبری

جب اہل زر کے سر میں سماتی ہے ممبری
گل باغ آرزو میں کھلاتی ہے ممبری
ممبر کی آرزو پہ زمانے کو رشک ہے
ممبر کے خلق و خو پہ زمانے کو رشک ہے
شہرت پہ ہاؤ ہو پہ زمانے کو رشک ہے
جو کچھ بھی چاہے کر کے دکھاتی ہے ممبری
سو سو طرح کے ناچ نچاتی ہے ممبری
سر بے شمار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
اور بار بار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
اغیار و یار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
دشمن سے بھی خراج دلاتی ہے ممبری
جب جلوۂ جلال دکھاتی ہے ممبری
کرسی بلند، اس کے لئے ہال بھی بڑا
باتوں میں زور، ہاتھ میں زر، مال بھی بڑا
اس کے شکار بھی ہیں بڑے جال بھی بڑا
چاہو جسے اسی کو پھنساتی ہے ممبری
لاسہ بری طرح سے لگاتی ہے ممبری
حاکم پہ اس کا رعب ہے محکوم اس کے ساتھ
چھوٹی بڑی ہزار سفارش ہے اس کے ہاتھ
منہ زور ہو جو کوئی تو رشوت سے دے یہ ناتھ
خورد و کلاں پہ رعب جماتی ہے ممبری
اچھے برے پہ دھونس جماتی ہے ممبری

یہ ممبری ہے ایک الہ دین کا چراغ
دل کو ہے اس سے چین طبیعت کو ہے فراغ
رہتا ہے ممبروں کا سدا عرش پر دماغ

چرخ بریں کی سیر کراتی ہے ممبری
ممبر کو اس طرح سے اٹھاتی ہے ممبری

منتر ہے اک یہ مال جہاں کے حصول کا
وا اس کی ہر دعا کے لئے در قبول کا
کھٹکا رسوم کا ہے نہ جھگڑا اصول کا

پابندیوں پہ چوٹ لگاتی ہے ممبری
بنک اور مِل الاٹ کراتی ہے ممبری

منزل یہ عیش کی ہے، مگر راستہ کٹھن
لاکھوں ہی کرنے پڑتے ہیں اس کے لئے جتن
ہے دور انتخاب کا اک دور پر فتن

جب ووٹروں کے ناز اٹھاتی ہے ممبری
نیچا بڑے بڑوں کو دکھاتی ہے ممبری

شورؔ علیگ



منظور حسین نام شور تخلص ، جولائی ۱۹۱۰ء میں امراؤتی (سی - پی) میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم اپنے وطن امراؤتی میں حاصل کرنے کے بعد آپ علی گڑھ چلے گئے جہاں میٹرک سے لیکر ایم - اے اور ایل - ایل - بی تک کے امتحانات پاس کئے - اس لحاظ سے گویا علی گڑھ کو آپ کے ادبی وطن کی حیثیت حاصل ہے - ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے قانون کا آخری امتحان پاس کر کے آپ وطن واپس گئے اور ۱۹۳۸ء میں ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات فارسی اور اردو میں بطور ریڈر و صدر شعبہ آپ کا تقرر ہو گیا - انقلاب ۱۹۴۷ء تک ناگپور ہی میں قیام رہا - تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے یہاں ابتدا میں کچھ عرصہ تلاش معاش میں پریشان رہے بارے کامیابی ہوئی اور درس و تدریس کا محبوب مشغلہ دوبارہ جاری ہوا - اس سلسلے میں اب تک آپ کئی اداروں سے منسلک رہ چکے ہیں - شروع میں ''زمیندار کالج'' گجرات میں اُستاد رہے - اُس کے بعد ''اسلامیہ کالج'' لائلپور چلے گئے اور آجکل گورنمنٹ کالج لائل پور میں ہیں -

شور صاحب کی شاعری کا آغاز علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی سے ہوا - ابتدائی کلام ''علی گڑھ میگزین'' میں چھپا - پھر کچھ عرصہ تک ''نگار'' میں آپ کی نظمیں شائع ہوتی رہیں اور اب پاکستان کے مؤقر جرائد میں بالالتزام آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے - شور صاحب کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے ہیں لیکن بیشتر نظمیں کہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے اپنی نظموں میں مشاہدہ ، احساس تفکر اور ہمہ گیر خصوصیات نہایت کامیابی کے ساتھ سموئی ہیں اور انہیں خصوصیات کی بدولت وہ دور جدید کے خوش فکر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں -

حضرت شور کی منظومات کے مطالعہ کے بعد جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ احساس کی شدت ہے - اُن کی بیشتر منظومات میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈتا ہوا نظر آتا ہے اور چونکہ شاعر کے ان جذبات و احساسات کو صدق و خلوص کی پشت پناہی حاصل ہے اس لئے اُس کا ہر شعر ایک زندہ حقیقت اور درد و اثر کا خزانہ بن گیا ہے - شور صاحب پر انقلابات زمانہ اور ماحول کا بھی نمایاں اثر ہوا ہے چنانچہ

آنکے کلام میں غم جاناں پر سماج اور انسانیت کا غم رفتہ رفتہ حاوی ہوتا چلا گیا ہے۔ لیکن اس اہم تغیر کی تہ میں جو چیز کام کر رہی ہے وہ شور صاحب کا گہرا و عمیق مشاہدہ ہے۔ اسی مشاہدہ نے آہستہ آہستہ انہیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا ہے جہاں ہر ہر قدم پر افسردہ لڑکپن، پژمردہ شباب، بے سر و سامان بڑھاپے، بھوک، افلاس، درد و کرب اور چیخ پکار سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور چونکہ یہ اپنی دیکھی بھالی اور ذاتی مشاہدے کی دنیا ہے اس لئے اس کی ترجمانی میں ابہام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موضوع سے قطع نظر جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے شور صاحب نے کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ اُن کی تقریباً تمام نظمیں پابند ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ردیف و قافیہ کے حسن و ترنم کے قائل ہیں۔ اُن کے اسلوب میں بڑی پختگی و دلنشینی ہے اور وہ الفاظ کے موزوں و بر محل استعمال پر بھی قادر ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اکثر الفاظ کے مناسب استعمال سے لفظ و خیال میں ایک صوتی ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں، اسکے علاوہ عمدہ و لطیف تشبیہات، تمثیلات اور استعارات اور بعض جگہ معنی خیز اشاریت اُن کے اسلوب بیان کو اور بھی جاذب و دلکش بنا دیتی ہے۔ عام طور پر بڑی سادہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں لیکن اس سادگی و روانی میں ایک صفائی، ایک علمیت اور ایک پرکاری ضرور جھلکتی ہے۔

بحیثیت مجموعی پروفیسر شور پاکستان کے اُن چند شعرا میں سے ہیں جو اپنے مشاہدے اور حقائق سے کام لے کر اردو شاعری میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا شعری سرمایہ مختصر ہے تاہم اُن کی شاعری ابھی ارتقائی منزل میں ہے اور وہ اپنے زرسخن کو جس کاوش و احتیاط کے ساتھ فکر و فن کی بھٹی میں پگھلا رہے ہیں اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تھوڑے ہی ریاض کے بعد اسے زرِ خالص بنانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

انتخاب کلام

دولت کی خدائی

انکھڑیوں کی مستیاں دوشیزہ رخساروں کی آگ
میری مٹھی میں ہے حسن مصر و روما کا سہاگ
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں
رقص فرما ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں
عصمتیں اکثر پگھل جاتی ہیں میری آگ میں
ایسی زنجیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں
میرو سلطان و وزیر و کجکلاہ و تاجدار
میرے فتراکوں کے آہو، میرے تیروں کے شکار

فرِّ جاگیر و وراثت ، قصر و ایواں کا وقار
میری ٹھوکر کے خزف ، میری شرابوں کا خمار
چترِ جم ، اورنگِ پرویزی ، قبائے بختِ یار
میری صبحوں کے دھندلکے ، میرے رستوں کے غبار
نخوتیں میری وراثت ، عشرتیں میری برات
ساغر و مینا کی صبحیں ، عارض و گیسو کی رات
زمزمے میرے اُجالے ، قہقہے میرے چراغ
خونِ آدم زاد سے دھکے ہوئے میرے ایاغ
سیم و زر میرے نبی ، لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجازِ خلافت کھیتیوں کا عرض و طول
مرہمِ حج و زیارت ، زخمِ دینار و درم
میرے ناسوروں سے چھلنی سینۂ مصر و عجم
میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر خراش
معبد و ہیکل کی نورانی جبینوں پر خراش
راہب و صوفی میرے گم کردہ منزل راہ گیر
میری محرابوں میں دل ، میرے ہی طاقوں میں ضمیر!
جبہ و دستار کو میری خلافت کا شرف
سبحہ و زنار میرے ہی خدنگوں کے ہدف
ہر عزا خانے میں بے گور و کفن میرے شہید
ہر حسین آباد میں میرے تراشیدہ یزید
میرے بوجہلوں کی زد پر ہر پیمبر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار
جرم و جہل و کذب و عصیاں میرے ہی نشے میں چور
میرے کس بل پر رذالت کو شرافت کا غرور
مجھ سے نسلیں سرگراں ، مجھ سے نجابت کا حشم
مجھ سے چہرے معتبر ، مجھ سے ضمیروں کے بھرم
مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ
زہر میرا ہر تبسم ، طنز میری ہر نگاہ!
خود فروشی میری فطرت ، پردہ پوشی میرا کام
مجھ سے چھپ جاتا ہے نسل و آدمیت کا جذام

میری راتیں میرے دن میرے شبستاں میرے خواب
چھین لوں میں جس سے چاہوں ماھتاب و آفتاب
طاعت و تقدیس و عرفاں آؤ میری سمت آؤ !
اپنے سر ، اپنی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ !
کون سی دوکاں پر دیر و حرم بکتے نہیں
یا خدا بکتا نہیں ھے یا صنم بکتے نہیں
اطلس و دیبا میں بھی عریاں رھیں جن کے بدن
اُن غلاموں کے بھی ماتھوں پر ھے سونے کی شکن

اندیشے

نور و نکہت میں وہ بہتی ھی رہی ھے اکثر
ھمکنار گل و لالہ ھے ابھی اُس کی نظر
وہ سمجھتی ھے کہاں برق و شرر کے تیور
دُور ھر موج سے سوئی ھے وہ اک ساحل پر

دور طوفاں سے بہت دور وہ سوئی ھے ابھی
سوچتا ھوں اُسے بیدار کروں یا نہ کروں

وہ اگر جاگ گئی، جاگ کے پچھتائے گی
چونک اُٹھی تو اسے نیند نہ پھر آئے گی
اپنے خوابوں کے تصور سے بھی گھبرائے گی
اپنے احساس کے شعلوں ھی میں جل جائے گی

اُس نے دیکھی نہیں موجوں کی تباھی اب تک
اُس کو طوفاں سے خبردار کروں یا نہ کروں

اُسکی خلوت میں شفق ، اُسکے شبستاں میں سحر !
اُسکے رستوں کے تو ذرے بھی ھیں الماس و گہر
اُسکے تیور میں نہاں سطوت زار و سنجر
اُسکے نغموں کی غلامی میں ھیں ناھید و قمر

وادیاں اُسکی ، فضا اُسکی ، ھوائیں اُسکی
ایسے آھو کو گرفتار کروں یا نہ کروں !

گر یہ ساماں تو نہیں ھنس کے ھنسانا اُس کا
زھر آلودہ کہاں جام شبانہ اُس کا
وہ سمجھتی ھے زمانہ ھے زمانہ اُس کا
حاصل بزم دو عالم ھے فسانہ اُس کا

جس کو دنیا کی تباھی کا تصور بھی نہیں
ایسی غمخوار کو غمخوار کروں یا نہ کروں

روح عفت گنہ جنگ سمجھتی ھی نہیں
فتنۂ افسر و اورنگ سمجھتی ھی نہیں
زندگی موت کا آھنگ سمجھتی ھی نہیں
طاعت عشق کو وہ ننگ سمجھتی ھی نہیں

ایسی معصوم ھے ھنستی ھی چلی جاتی ھے
اُس کی آنکھوں کو گہر بار کروں یا نہ کروں

اُسکی نظروں میں دھکتے ھوئے آلام کہاں
اُسکی نظروں میں سلگتے سحر و شام کہاں
اُسکی نظروں میں خراش دل ایام کہاں
اُسکی نظروں میں بھلا زھر بھرے جام کہاں

وہ مرے دلکی دھڑک سے بھی نہ برھم ھو جائے
ایسے طوفاں میں اُسے پیار کروں یا نہ کروں

چشمک تیغ و سناں اُسکے تصور میں کہاں
خون کی جوئے رواں اُسکے تصور میں کہاں
زلزلے شعلہ فشاں اُسکے تصور میں کہاں
جلتی لاشوں کا دھواں اُسکے تصور میں کہاں

نیت فطرت خونخوار سمجھتی ھی نہیں
ایسی مدھوش کو ھشیار کروں یا نہ کروں

نور و نغمہ کی پیمبر، وہ محبت کی رسول
جسکی نظروں میں نہیں جبر مشیّت کا شمول
آہ! جو یاسمن و گل سے بھی نازک ھو وہ پھول
کر سکی جسکو نہ میلا کبھی افکار کی دھول

جسکی دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اُسکی دنیا سے بھی انکار کروں یا نہ کروں

راستے

ارض ''ناقوس'' و ''اذاں'' جولانگہ اہل کتاب
اک شب بے ماہ و اختر، اک سحر بے آفتاب

وہ زمیں بستے ہیں جس پر زہد کے پالے گناہ
معبدوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے والے گناہ

برہمن زادوں کی گلیاں، راہبوں کے رہ گذار
پے بہ پے کوچہ بہ کوچہ آدمیت کے مزار

''زہد'' کی فتنہ گری ''زنار داروں'' کے فریب
ایسی کالی رات اور یہ ''چاند'' ''تاروں'' کے فریب

خون آدم کا تلاطم رہگزر در رہگزر ......
آدمیت کا جنازہ ''کفر'' و ''دیں'' کے دوش پر

کس قدر ''تسبیح خواں'' ہیں کس قدر ''زنار دار''
اٹھ رہا ہے ہم نفس وہ دیکھ رستوں سے غبار

آہ وہ رستے رواں ہوں جن پہ ڈاکو سیکڑوں
گامزن ہوں جن پہ چنگیز و ہلاکو سیکڑوں

روندتے ہوں جن کو ''منعم'' جن پہ ہنستے ہوں ''امیر''
جن پہ لو دیتی ہوں نظریں جن سے بجھتے ہوں ضمیر

کس قدر مفلوج ان رستوں میں محو خواب ہیں
گود میں ان ساحلوں کی کس قدر سیلاب ہیں

کتنے ''عارف'' کتنے ''صوفی'' کتنے کعبے کے ''امام''
گامزن ہیں کتنے قیدی، گرم رو کتنے غلام

خاک برسر کیسے کیسے بے نوا خانہ بدوش
کتنی آہیں، کتنی چیخیں، کتنے غم، کتنے خروش

کتنی میلی چادریں ہیں کتنے برقعوں میں ہے خاک
کتنے دامن ہیں دریدہ، کتنے پیراہن ہیں چاک

سوختہ کتنے جگر ہیں، کتنے سینے دل فگار
کتنی آہیں بے اثر ہیں، کتنی آنکھیں اشکبار

کیسے کیسے بے سر و ساماں بڑھاپے صرف خواب
کتنے افسردہ لڑکپن، کتنے پژمردہ شباب

کس قدر جلوے غبار راہ میں گم ہیں یہاں
خون میں ڈوبے ہوئے کتنے تبسم ہیں یہاں
جانب ''دیر'' و ''کلیسا'' جانے والے رہگزار
اُف یہ سانپوں کی طرح لہرانے والے رہگزار
''خانقاہوں'' کے مقدس خواب دکھلاتے ہوئے
مرمریں آذر کدوں کے زمزمے گاتے ہوئے
دور سے آغوش پھیلاتے ہیں کتنے راستے
بن بلائے سامنے آتے ہیں کتنے راستے
ہم نوا میرا نہ کوئی ہم سفر میرے لئے
کتنی وحشت ناک ہے ہر رہگزر میرے لئے

ملّاح

یہ گاتے زلزلے ' یہ ناچتے طوفان کے دھارے
ہوا کی نیتوں سے بے خبر ملاح بیچارے
وہ طوفانوں کے ہل چلنے لگے سیال کھیتی میں
وہ کشتی آکے ڈوبی گوہریں قطروں کی ریتی میں
وہ ٹوٹیں موج کی شفاف دیواریں سفینوں پر
وہ پھر لہریں اُبھر آئیں ارادوں کی جبینوں پر
وہ ٹکرانے لگی آواز نیلے آسمانوں سے
وہ خط رہگزر پر جل اُٹھیں شمعیں ترانوں سے
ہوائیں تھم نہیں سکتیں ' تلاطم رک نہیں سکتے
مگر موج و ہوا کے سامنے سر جھک نہیں سکتے
سفینے ہیں کہ طوفاں کے تھپیڑے کھائے جاتے ہیں
مگر ملاح گیت اپنے برابر گائے جاتے ہیں
ہیں کتنے غم کہ جنکی مے سرور انگیز ہوتی ہے
ہیں کتنے گیت جنکی لو ہوا سے تیز ہوتی ہے
کھنچا ہو جن کا خط رہگزر طوفاں کے دھاروں پر
بڑی مشکل سے اُن کو نیند آتی ہے کناروں پر

نہال سیوہاروی

عبدالخالق نام نہال تخلص ۲۷ اگست ۱۹۰۱ء کو سیوھارہ ضلع بجنور (یو۔پی) میں نعمت ھستی سے بہرہ ور ھوئے۔ آپ کے والد قاضی عبدالواسع صاحب سیوھارہ کے شرفا و معززین میں شمار ھوتے تھے اور ساتھ ھی شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

نہال صاحب نے ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول کی زندگی سے کنارہ کشی کر لی۔ فارسی و انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ فطری طور پر آپ کا رجحان طبع جس قدر ادب کی طرف مائل تھا اُسی قدر ریاضی سے طبیعت دور بھاگتی تھی یہی وجہ تھی کہ آپ گھریلو تعلیم اور ذاتی مطالعہ پر اکتفا کر کے اپنی علمی و ادبی تشنگی بجھاتے رھے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی اور اتفاقات کی عجوبہ کاری دیکھئے کہ بچپن میں جس ''حساب کتاب'' سے طبیعت راہ فرار اختیار کرتی تھی وھی ''حساب کتاب'' اُن کا ذریعہ معاش بنا۔ چنانچہ نوجوانی میں جب وہ تلاش روزگار میں سیوھارہ سے دھلی آئے تو ڈویزنل اکاؤنٹس آفس نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ملازم ھوئے اور تقسیم ھند تک وہ دھلی میں اسی محکمہ سے متعلق رھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان چلے آئے اور کراچی میں اپنی پرانی جگہ پر کام کرتے رھے۔ تاآنکہ جنوری ۱۹۵۲ء میں موصوف نے انتقال فرمایا۔

حضرت نہال کو بچپن ھی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ مشق سخن کی بدولت اس دلچسپی میں اور بھی اضافہ ھوتا گیا۔ پھر مشرقی و مغربی شاعری کے مطالعہ اور عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں پختگی اور گہرائی و گیرائی بھی پیدا ھوتی گئی۔ نہال صاحب اُن شعرا میں سے ھیں جنھوں نے دبستان فطرت سے درس انسانیت و محبت لیا اور مکتب زندگی سے انسانی اُخوت اور بھائی چارے کا سبق سیکھا۔ چنانچہ زندگی سے براہ راست حاصل کئے ھوئے تجربات اُن کے ذھنی سرمائے کا بڑا حصہ ھیں۔ اُن کا کلام تخریبی میلانات، تشکک اور لذت پرستی کے عناصر سے پاک ھے۔ اُن کے موضوعات اپنی گہرائی، پہنائی اور تنوع کے اعتبار سے پوری زندگی پر حاوی ھیں زندگی کا جدلیاتی نظریہ، انسانی فطرت کی لازوال عظمت اور اُس کا احساس، غموں میں تفاول اور مجبوریوں میں بلند عزائم کی پاسداری، عالمگیر محبت کا خواب، یہ اُن کے محبوب ترین موضوعات ھیں۔ ساتھ ھی اُن کے کلام میں رجائیت اور سرمستی اس بلا کی ھے کہ بجھے ھوئے دلوں میں ایک بار زندگی کروٹیں لینے لگتی ھے۔ اُن کی غزلیات، رباعیات اور منظومات کا ھر شعر ایک نئے جوش، نئے ولولے اور نئے عزم سے بھر پور نظر آتا ھے اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اُردو کا یہ جوان سال شاعر ازل سے استقلال و پامردی کی لازوال خصوصیات سے مشرف تھا ورنہ

پائے ہمت سے مصائب کو کچلنا چاہئے
مسکرا کر سرخ انگاروں پہ چلنا چاہئے
باوجود غم مسلسل قہقہے اے نامراد!
کاروان زندگی کے ساتھ چلنا چاہئے

مصائب و آلام زندگی کے دھکتے ہوئے انگاروں کو روندنا اور کاروان زندگی کے ساتھ چلنے کے لئے نامرادی و رنجوری میں مسلسل قہقہے لگانا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔

حضرت نہال مرحوم ہمیں ایک نئے دور کا پیغام دیتے ہیں۔ اس پیام میں خواجہ حافظ کا لب و لہجہ اور علامہ اقبال کا اعتماد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم کے ذہن میں کوئی ایسا واضح اور متعین تصور نہیں تھا جسکی تفصیلات و جزئیات فلسفہ کی بنیادوں پر قائم ہوں تاہم اُن کے تصورات میں ایک ہم آہنگی اور وسعت ضرور پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی چونکہ نیم پخت رومانیت اور انقلاب کے ترانے ہی اُن کا سہارا نہیں ہیں اس لئے اُن کی ہیئت شعر میں ایک وقار پایا جاتا ہے۔ جس میں کلاسیکی انداز ہیں۔ تفکر کے باوجود اُن کی زبان میں انتہائی سادگی، سلاست اور ترنم ہے اور الفاظ آئینہ سے زیادہ صاف، تلوار سے زیادہ تیز اور پانی سے زیادہ رواں ہیں۔

جدلیاتی نظریہ، اکثر شعر کے دو مصرعوں میں الفاظ کی خاص تکرار اور دروبست سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ فن کارانہ وصف جناب نہال کا طغرائے امتیاز ہے۔ اُن کے کلام میں الفاظ کی تازگی، آہنگ اور آرائش کا بڑا اچھا اہتمام ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ گو مرحوم کی شاعری پر کوئی خاص لیبل نہیں لگایا جا سکتا تاہم موضوعات کی وقعت، زندگی کی تنقید، انتخاب کی قوت، ہیئت کی رعنائی اور خلوص کی شدت کے معیار پر اگر اُن کے کلام کو پرکھا جائے تو اُنہیں ایک خوش فکر شاعر ضرور تسلیم کرنا پڑیگا۔ افسوس کہ مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کیا ورنہ وہ جس ذہن اور جذبے سے اپنی شاعری کی آبیاری کر رہے تھے اُس سے اُن کے کلام کے اور زیادہ نکھرنے اور سنورنے کی توقعات وابستہ تھیں۔ حضرت نہال کے دو مجموعے ''گلبانگ آزادی'' اور ''شباب و انقلاب'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''گلبانگ آزادی'' وطنی اور قومی رباعیات کا مجموعہ ہے اور ''شباب و انقلاب'' منظومات و غزلیات پر مشتمل ہے۔

انتخاب کلام

منظومات

کھیل

گزر دلاورانہ کر جہاں سے کھیلتا ہوا
زمیں سے کھیلتا ہوا، زماں سے کھیلتا ہوا

بساط عشق پر وہی ہے کامیاب عشق جو
سدھار جائے اپنے نقد جاں سے کھیلتا ہوا
مصائب جہاں ہیں دل شکن یہ مانتا ہوں میں
گزر بھی جا مصائب جہاں سے کھیلتا ہوا
نہ روک پائے عزم ابھی ہے دور منزل یقیں
قدم یوں ہی بڑھائے جا گماں سے کھیلتا ہوا
الم کی تلخیوں میں بھی مسرتوں کے گیت گا
نوا زنِ بہار بن خزاں سے کھیلتا ہوا
مرے وطن کی زندگی کا کہیئے جس کو عہد نو
وہ آ رہا ہے نیزہ و سناں سے کھیلتا ہوا
سمجھ گیا جہاں کے نظم کہنہ و جواں کو میں
جہاں کے نظم کہنہ و جواں سے کھیلتا ہوا
بلند و بے نیاز رکھ سر غرور زندگی
ہزار دشمنہائے جانستاں سے کھیلتا ہوا
ہمیں ہے یاد سرگزشت زندگی "نہال" کی
ہوا تمام، حسن گل رخاں سے کھیلتا ہوا

آدم

کون و مکاں میں غایت کون و مکاں ہے آدمی
اصل جہاں سے بے خبر اصل جہاں ہے آدمی
روز ازل سے ہے لئے دوش پہ بار کائنات
ذرۂ ناتواں نہیں کوہ گراں ہے آدمی
اس کا خرام تند و تیز رونق عرصۂ ستیز
عرصہ گہ ستیز میں سیل رواں ہے آدمی
جب یہ نہ ہو تو رونق خمکدۂ حیات کیا
خمکدۂ حیات کا پیر مغاں ہے آدمی
عقل جسے نہ پا سکی، ذہن میں جو نہ آ سکا
وہ دل کائنات کا سرِ نہاں ہے آدمی
ایک نفس کے ساتھ ہیں گرچہ ہزار انقلاب

همت آدمی تو دیکھ پھر بھی جواں ہے آدمی
مالک همت بلند ' مہر مبیں سے ارجمند
عرش نشاں ہے اور کون ' عرش نشاں ہے آدمی
خم رہے کیوں سر غرور جلوۂ دھر کے حضور
اپنی تجلیوں سے آپ ایک جہاں ہے آدمی
معرض گفتگو میں ھیں تازہ ترین مکاشفات
ارض و سما سنو سنو گرم بیاں ہے آدمی
حیرت و اشتیاق سے دیکھ رہے ھیں برق و باد
کون سی منزلوں کی سمت تیز رواں ہے آدمی
کچھ خزاں نہ کچھ بہار' اک سرور اک خمار
وجہ بہار آدمی ' وجہ خزاں ہے آدمی
جس کی بلندیوں سے ہوش آڑتے ھیں جبرئیل کے
دیکھ تو کس مقام پر زمزمہ خواں ہے آدمی
اُف رے یہ تابناکیاں ایک شرار عشق کی
عہد ازل سے آج تک شعلہ بجاں ہے آدمی
فطرت آدمی ہے یہ ' ثمرۂ آگہی ہے یہ
کوئی ہو مبتلائے غم ' صرف فغاں ہے آدمی
رونق کاروبار دھر همت آدمی سے ہے
جوش پہ یہ بہار دھر همت آدمی سے ہے

گلبانگ آزادی

هر موج کے لب پہ صبح و شام آزادی بہتے ہوئے دریا کا خرام آزادی
زنہار یہ اے بندۂ آزاد نہ بھول فطرت کا ہے اولیں پیام آزادی

سرمایۂ عیش کائنات آزادی هر غم سے وسیلۂ نجات آزادی
یہ راز سکندر کو بھی معلوم نہ تھا ہے خمکدۂ آب حیات آزادی

ڈس لے جو غلامی کو وہ ناگ آزادی گرمائے جو باطن کو وہ آگ آزادی
اک مطرب نوخیز یہ کل کہتا تھا آزاد جوانی کا ہے راگ آزادی

سر مخزن احساس تمام آزادی — ہے بادۂ زندگی کا جام آزادی
ہے آب بقا ہے جنکی مینائے حیات — آں مردہ دلوں پہ ہے حرام آزادی

عزم و عمل

اے دور فلاکت و مصیبت کٹ جا — آہستہ خرامی سے نہ چل ' سر پٹ جا
اے روز نشاط مسکراتا ہوا بڑھ — اے غم کی سیاہ رات پیچھے ہٹ جا

سر تا بقدم زندگی ایمانی — پر جوش سمندر کی طرح طوفانی
یہ موت کے سرد راگ اوروں کو سنا — اے مطرب دہر میں ہوں پاکستانی

ذرے ہیں اگر تو مل کے صحرا ہو جائیں
قطرے ہیں اگر تو مل کے دریا ہو جائیں
ہے قوم کو اک لشکر اعظم درکار
ہیں جتنے فدائے قوم یک جا ہو جائیں

محنت کش و نباض مزاج دوراں — ترمیم کن رسم و رواج دوراں
دیکھے تو کوئی مرد مسلماں کی یہ شان — کاندھے پہ گلیم ' سر پہ تاج دوراں

طوفان کی سختیاں اٹھانے والا — طوفان کو خاطر میں نہ لانے والا
گھستا ہے جبین عجز سے دنیا کا غرور — درکار ہے دنیا کو جھکانے والا

ہو بزم جہاں میں جب درندوں کا عمل — اے مرد جری بعزم پیکار نکل
مایوس نہ ہو کہ رنگ لائے گی ضرور — یہ جنگ وجدل ' جنگ وجدل ' جنگ وجدل

ناموس وطن کی پاسباں ہے تلوار — محبوبۂ مردان جہاں ہے تلوار
بے زور ہے جس ہاتھ میں تلوار نہیں — ارباب شجاعت کا نشاں ہے تلوار

زائل جو کبھی نہ ہو وہ مستی ہے جہاد — ہستی کے لئے ثبوت ہستی ہے جہاد
اونچی ہے جو شاخ گل تو مایوس نہ ہو — ایسے میں تری دراز دستی ہے جہاد

غزلیات

چارہ فرمائی دل رسم بتاں ہے تو سہی
ابھی کچھ مہر و محبت کا نشاں ہے تو سہی

نقش پا تیرا ہے گر تو نہیں اے حشر خرام
اک نہ اک باعث آشوب جہاں ہے تو سہی

آپ سے آپ تو پیدا نہیں یہ لالہ و گل
کوئی آخر چمن آرائے جہاں ہے تو سہی

یہ بھی کہتے ہیں کہ ہے عرض تمنا بے سود
یہ بھی کہتے ہیں ترے منہ میں زباں ہے تو سہی

جلوۂ دوست کو سمجھا نہیں یہ بات ہے اور
جلوۂ دوست محیط دل و جاں ہے تو سہی

چاہئیے اور تجھے کیا پئے ہنگامۂ حسن
تیرے قرباں یہ سب کون و مکاں ہے تو سہی

ہم نے مانا کہ نہیں حالی و مجروح، نہال
پیروِ غالب اعجاز بیاں ہے تو سہی

گرمئی عشق کے بغیر لطف حیات رائیگاں
عشق ہے زندگی کا روپ، عشق سے زندگی جواں

ہائے وہ چند ساعتیں گزریں جو تیرے قرب میں
رشک سے دیکھتی رہی جن کو حیات جاوداں

اُف ری منازل بلند تیرے حریم ناز کی
پائے طلب کو کتنے طے کرنے پڑے ہیں آسماں

برق کی دسترس سے دور، عصرِ نوی کے اے طیور
اور بلند آشیاں اور بلند آشیاں

گرم حصول جوئے شیر، ہاں یوں ہی مرد تیشہ گیر
تیشہ زنی ہے دہر میں اصل حیات کامراں

محتسبِ شراب تو بزم جہاں میں ہیں بہت
یہ بھی کہو کہ ہے کوئی محتسب غم نہاں

جذبۂ ہمت اے نہال جب ہو مرا شریک حال
میرے لبوں پہ آئے کیوں شکوۂ گردش زماں

رابطہ ہے مجھے شیشے سے نہ پیمانے سے
پھر وہ کیا بات ہے منسوب ہوں میخانے سے
اہل میخانہ سلیقے سے پئیں آب حیات
ورنہ پھر موت ہے چھلکے گی جو پیمانے سے
ایک عالم سے جدا مصلحتیں ہیں اسکی
کون ہر بات پہ اُلجھے ترے دیوانے سے
خرد آشوب ہے ہر نکتۂ عرفان حیات
اور بڑھتا ہے جنوں عقل کے بڑھ جانے سے

دلِ نا مطمئن اندیشۂ برق طپاں میں ہے
جو بے تابی قفس میں تھی وہی اب آشیاں میں ہے
مری بے تابئی دل کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
خدا جانے ترا حرف تسلی کس زباں میں ہے
یہی انداز ہیں تو غم نہیں کچھ بعُد منزل کا
اُمنگیں جاگ اُٹھی ہیں، زندگی سی کارواں میں ہے
اسی کے راگ سے گونجیں گی کل راہیں مسرت کی
یہ مانا آج انسان منزل آہ و فغاں میں ہے
کوئی نسبت نہیں منزل رسی کو رہ نوردی سے
وہ لذت کامیابی میں کہاں جو امتحاں میں ہے
یہ تخصیص چمن کیا، التجائے باغباں کیسی
بہت اے ہمت پرواز گنجائش جہاں میں ہے

عہد حاضر میں عیار صبح تو بدلا مگر
اے اندھیری رات تجھ کو بھی بدلنا چاہئے
باوجود غم مسلسل قہقہے اے نا مراد!
کاروان زندگی کے ساتھ چلنا چاہئے
شان رندانہ کی ہے توہین از خود رفتگی
سہل ہے پینا مگر پی کر سنبھلنا چاہئے
زندگی وہ کیا جو ہو ناواقف آشوب عشق
سینۂ آدم میں طوفانوں کو پلنا چاہئے

اقتضائے عصر نو ہے زندگی تو درکنار   موت کو بھی حسن کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے
اے جنوں کچھ دیر شغل خاکبازی ہی سہی
دل تو اس صحرائے ہستی میں بہلنا چاہئے

کچھ ایسے انجم رخشاں زمیں پہ آئے نظر   میری نگاہ میں توقیر مہر و ماہ نہیں
جمال مہر درخشاں ہے بے نقاب تو کیا   ہر ایک ذرہ کی تقدیر میں نگاہ نہیں
جھپک نہ جائے تری آنکھ ہوشیار نہال   مقام رزم یہ دنیا ہے خواب گاہ نہیں

یہی بے لوث محبت یہی غمخوارئی خلق   اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی
نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغاز شباب   ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی
جسقدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعت فکر   عقل رکھتی ہے بنائیں نئے زندانوں کی
اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں   کہ نگاہیں طرف شمع ہیں پروانوں کی
ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام   سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی
ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے آجڑے ہوئے کاشانوں کی

اڑا لئے ہیں کچھ ارباب گلستاں نے تو کیا   ہزار شیوۂ نو ہیں مری فغاں کیلئے
زمین کوچۂ جاناں سے آرہی ہے صدا   بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کیلئے
ہے ختم حوصلہ مندی وجود آدم پر   ستیزہ کار ہے فتح غم جہاں کیلئے
ہے سخت بے ادبی گر کہے فسانۂ عشق   ہر ایک بات مناسب نہیں زباں کیلئے
اندھیری رات، تھکی ہمتیں، کڑی منزل   سلامتی کی دعا مانگ کارواں کیلئے
سجائی فکر درخشاں نے میری بزم نجوم
تھی منتظر یہ زمیں ناز آسماں کیلئے

زمانہ کیا دیکھئے دکھائے، نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور ہیں خشمگیں سے، زمیں کے دل میں غبار سا ہے
کمال دیوانگی تو جب ہے، رہے نہ احساس جیب و دامن
اگر ہے احساس جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے
کچھ آج ایسی ہی جی پہ گزری، دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
جسے سنبھالے ہوا تھا دل میں وہ نالہ بے اختیار سا ہے

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے
کیا سے کیا یہ مئے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گزاری ہے غم عشق و محبت میں حیات
کچھ سپرد غم ایام ہوئی جاتی ہے

پھر کسی مرد براہیم کا محتاج ہے دہر
پھر وہی کثرت اصنام ہوئی جاتی ہے

ہوس سیر و تماشہ ہے کہ ہوتی نہیں ختم
زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

جو کبھی خالق ہنگامۂ طوفاں تھی وہ موج
حیف ! خُو کردۂ آرام ہوئی جاتی ہے

صحبت پیر مغاں میں یہ کھلی عظمت عشق
عقل بھی دُرد تہ جام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو شکلِ در و دیوار ہے اور
کتنی رنگین مری شام ہوئی جاتی ہے

غزل مسلسل

اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ہوگا
وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا

وہ دھوم زمانے میں مرے جوش جنوں کی
وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا

بھولے تو نہ ہوگے وہ تجلی کی حکایت
وہ تذکرۂ داغ جگر یاد تو ہوگا

ہر گام پہ وہ حسن کی پرہوش نگاہیں
وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا

ہر لمحہ وہ دنیائے محبت میں تغیّر
ہر سانس میں وہ رنگ دگر یاد تو ہوگا

وہ دل کو ترے حسن خود آرا سے تعلق
وہ خاک سے پیمان نظر یاد تو ہوگا

وہ کارگہ دہر سے اک بے خبری سی
وہ طعنۂ ہر اہل خبر یاد تو ہوگا

وہ دیدہ کہ تھا روکش آرائشِ گیتی
پہروں طرف راہ گذر یاد تو ہوگا

وہ عشق کے جذبات کا بھرپور تلاطم
طوفان کی موجوں میں گذر یاد تو ہوگا

گم کردہ سکوں پا کے مجھے اپنی گلی میں
کہنا وہ تجاہل سے ''کدھر'' یاد تو ہوگا

انوار مجسم وہ ملاقات کی راتیں
راتوں میں وہ انداز سحر یاد تو ہوگا

بھولی تو نہ ہوگی مری اُلفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ہوگا

احمد ندیم قاسمی



احمد شاہ، خاندانی اور احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے ۔ ندیم تخلص کرتے ہیں ۔ مولد موضع انگہ، تحصیل خوشاب، ضلع شاہ پور پنجاب ہے جہاں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو آپ کی پیدائش ہوئی ۔ اجداد مجاہدین عرب کے ساتھ ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور اُن میں سے چند بزرگ ملتان میں رہ کر تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے ۔ مغلوں کے دور حکومت میں ان فدائیان اسلام نے سکیسر پہاڑی کی وادی میں اسلام آباد نامی گاؤں بسایا لیکن تیمور کی یلغار میں یہ تباہ و برباد ہو گیا تو اسی کے قریب موجودہ گاؤں انگہ آباد کیا ۔ رفتہ رفتہ یہ خاندان تبحر علمی، پرہیز گاری اور صلح کلی کے باعث محترم اور سلسلۂ پیری مریدی کی بدولت مشہور ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی جن میں سے اکثر آج بھی گجرات اور سیالکوٹ کے اضلاع اور ریاست کشمیر میں موجود ہیں ۔ اس خاندان کے بزرگ و محترم ارکان میں ایک ندیم صاحب کے والد پیر غلام نبی مرحوم و مغفور بھی تھے جو اپنی عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے ۔

ندیم صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی ۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد اُن کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اُن کے حقیقی چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم نے اپنے ذمہ لی اور ۱۹۲۵ء میں وہ اُن کے ہمراہ کیمبل پور چلے گئے ۔ پیر حیدر شاہ صاحب عربی و فارسی کے عالم اور شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے چنانچہ اُنہوں نے بھتیجے کو اسکول کی تعلیم کے علاوہ تفسیر حقانی کا درس بھی دیا اور اشعار سے صحیح طور پر محظوظ ہونے کے طریقے بھی سکھائے ۔ غرض شفیق چچا کی صحبت میں حضرت ندیم کو مذہبی، علمی اور شاعرانہ ماحول میسر آیا اور اُنکی قابل رشک تربیت ہونے لگی ۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے میٹرک پاس کیا اور ایجرٹن کالج بھاولپور میں داخل ہو گئے جہاں آپ کے چچا مشیر مال تھے ۔ ۱۹۳۴ء میں آپ بی ۔ اے میں تھے کہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے چچا کا انتقال ہو گیا ۔ یہ زمانہ ندیم صاحب کی بڑی ذہنی و روحانی پریشانیوں کا زمانہ تھا، بارے جوں توں کر کے آپ نے ۱۹۳۵ء میں بی ۔ اے پاس کیا ۔ پھر چار سال مسلسل تلاش معاش میں سر گرداں رہے لیکن کہیں کامیابی نہ ہوئی آخر ۱۹۳۹ء میں ایک عزیز کی وساطت سے محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر ہو گئے اور ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء تک اس خلاف مزاج ملازمت میں دن گزارنے کے بعد اس سے مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے اور ۲۵ ستمبر

۱۹۴۲ء سے دارالاشاعت پنجاب لاہور میں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے - ۱۹۴۳ء میں رسالہ ''ادب لطیف'' کی ادارت سنبھالی - ۱۹۴۴ء میں سالنامہ ''ادب لطیف'' کے ایک مضمون کی اشاعت کی بنا پر حکومت پنجاب نے آپ کو گرفتار کر لیا - یہ مقدمہ ایک برس تک چلتا رہا- مقدمہ کے دوران ہی میں آپ بیمار ہوگئے- مئی ۱۹۴۵ء میں مقدمہ سے بری ہوکر آپ اپنے وطن چلے گئے اور فروری ۱۹۴۶ء میں علالت کے پیش نظر ''ادب لطیف'' کی ادارت سے دست بردار ہو گئے - تقسیم کے بعد پشاور ریڈیو میں ڈیڑھ سال ملازم رہے - پھر ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت شروع کی لیکن کچھ دنوں بعد یہ رسالہ بھی سیفٹی ایکٹ کا شکار ہوکر بند ہو گیا - اب ۵ مارچ ۱۹۵۳ء سے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس معیاری روز نامے کی ادارت کے لئے آن جیسے معیاری ادیب کا انتخاب نہ صرف موزوں بلکہ مستحسن ہے -

ندیم صاحب کی شاعری کا آغاز پندرہ برس کی عمر سے ہوا - آنہیں کسی سے تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں لیکن شعر گوئی کے معاملے میں وہ اپنے چچا مرحوم ' مولانا عبدالمجید صاحب سالک اور اختر شیرانی مرحوم کے رہین منت ضرور ہیں ' جنکے مفید مشورے آن کی رہنمائی کا باعث ہوئے - یہاں بقول ندیم صاحب اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''آج تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میرا اپنا سرمایہ ہے ' میری آنکھوں ' میرے دل اور میرے دماغ کا خزانہ ہے جس پر کسی دوسرے کا کوئی اثر نہیں - البتہ ماحول کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ' میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کا خود ہی خالق ہوں اور خوش ہوں کہ مجھے اپنا مستقبل روشن و تاباں نظر آتا ہے'' - اس قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر و شاعری کے معاملے میں وہ اپنی انفرادیت کے سختی سے پابند ہیں اور آنہوں نے اس سلسلے میں اپنے ذاتی مشاہدات ' احساسات ' تفکر اور آسلوب سے کام لیکر اپنے فن کی پرورش کی ہے -

حضرت ندیم نے غزل ' نظم ' قطعہ' رباعی غرضیکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے آن کے کلام کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بڑے خلوص و دیانت داری کے ساتھ کہتے ہیں آنکے یہاں شدید احساس ' مطمئن تخیل ' حالات کا صحیح تجزیہ ' حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی اور آسلوب کی پختگی وغیرہ خصوصیات نمایاں ہیں اور ان خصوصیات نے مل جل کر ان کے کلام کو نہ صرف ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے بلکہ آسے عظیم شاعری کی آن سرحدوں کے قریب پہنچا دیا ہے جہاں شعر ایک ابدی حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے -

اس میں شک نہیں کہ جدید شاعری کا یہ جواں سال فنکار اپنی فنی زندگی کے ایک مخصوص دور میں فکر و فن کی بہت سی آلجھنوں میں پھنسا رہا ہے جسکے باعث آس زمانہ کی تخلیقات میں ژولیدگی ' عسیرالفہمی اور کہیں کہیں شدید تلخی و تندی پیدا ہو گئی ہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں مطالعہ ' صحبت اور غور و فکر نے جب ان آلجھنوں کو صاف کر دیا تو تخلیقات بھی صحت مند اور روشن عناصر سے ہم آہنگ ہو کر نکھرنا شروع ہو گئیں ' حتیٰ کہ اب آن کی شاعری فن کی آس منزل میں قدم رکھ چکی ہے جس میں نہ صرف انسان کے بنیادی مصائب اور زندگی کے اٹل حقائق کی دلکش تفسیر پیش کی جاتی ہے بلکہ آن کی تطہیر کا عرفان بھی پیدا ہو جاتا ہے -

ندیم صاحب کے اسلوب بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالمجید سالک ''شعلہ و گل'' کے تعارف میں فرماتے ہیں: ''ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے - اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف وغیرہ کے معاملے میں بھی صرف اسی قدر تجاوز یا انحراف کا روا دار ہے جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو، وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے، وہ اُن کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات اُن کے محل استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے شعرا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور اُنھیں انکار و اعتراض کی جرائت نہیں ہوتی'' - بلاشبہ مولانا کی یہ رائے اس بارے میں حرف بہ حرف صحیح ہے -

ندیم صاحب کے حالات زندگی اور اُنکی شاعری سے متعلق یہ چند باتیں کہنے کے بعد خود جناب ندیم کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی ہیں ہمارے نزدیک اُن خوبیوں اور صلاحیتوں کا حقیقی اعتراف ہے جو قدرت نے اُنھیں ودیعت کی ہیں اور جن کے جائز استعمال نے اُن کی زندگی اور فن کو باوقار اور پر عظمت بنایا ہے - موصوف کی نثری نگارشات سے قطع نظر اُن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں - جن میں ''دھڑکنیں'' اور ''رم جھم'' محض قطعات اور ''جلال و جمال'' اور ''شعلہ و گل'' - منظومات اور غزلیات کے مجموعے ہیں -

انتخاب کلام

غزلیات

ہر مسرت سے سرگرانی ہے — کیا یہی عالمِ جوانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو — وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

جو پاس ضبط سے ڈر ڈر کے ٹپکا — وہ آنسو چاند سے بڑھ کر گراں ہے

فصلِ گل آئی نشیمن جل گئے — ہائے دیوانوں کی دور اندیشیاں

زخم ہوتے ہیں دنوں میں مندمل — اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات

پھر حسینوں پہ اعتبار کریں
آؤ پھر دل کو لالہ زار کریں
ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی
آؤ مل جل کے ذکرِ یار کریں

ہم ترے شوق میں پرواز جہاں کرتے ہیں
اور وہ پرواز، کہ بیگانۂ رفتار ہیں ہم

ذرّے ذرّے میں ترا عکس نظر آتا ہے
راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا

جانے کہاں تھے، اور چلے تھے کہاں سے ہم
بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم
آخر دعا کریں بھی تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم
اب جی میں ہے کہ کعبۂ مقصود کے عوض
مانگیں ترے نقوشِ قدم کہکشاں سے ہم
یہ خانۂ تباہ، یہ سلطان کجکلاہ
پوچھینگے آج اپنا پتہ میہماں سے ہم

تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ
وہ خرد کی تنگ ظرفی، یہ جنوں کی بیکرانی
نہ گمانِ یار ان پر، نہ جمالِ یار ان میں
ترے کو کب و قمر سے نہ بہل سکی جوانی
نہ سمجھ سکی مشیّت، نہ بدل سکا زمانہ
وہی تیغ اصفہانی، وہی خون ارغوانی

راستہ دیکھتا ہے تیرا حریم
جانے کس بے نیاز راہی کا

وہ میرے عشق کا مقصود خاص پوچھتے ہیں
ضرورت آن پڑی آئینہ دکھانے کی
ندیم کھیل رہا ہوں پرانی یادوں سے
یہی تو آخری کوشش ہے بھول جانے کی

عجیب شمع ہے جو جل کے خود نہیں بجھتی
عجیب تر ہیں مگر بے نیاز پروانے
رخِ ملیح، لبِ سرخ، زلف ژولیدہ
بہت لطیف ہیں رسوائیوں کے افسانے

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے احترامِ جفا مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں
اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات مری مگر یہ شوق، تماشائے جانکنی تو کروں

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرت بشری
یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری
فلک پہ ٹوٹے ستارا، زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم، یہی ہے کمال بخیہ گری

ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے اک مدعا ہے محتاج اظہار
اے ذوق پرواز اب ضبط کیسا! اٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار

میں تجھ کو بھول چکا لیکن ایک عمر کے بعد ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ ابھر آئی

ذکر اک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے اک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے

میں جسے شرط ادب کہتا ہوں، تو فرط حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی
ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایوان نہیں درکار ابھی
کتنے ساگر ہیں سنبھالے ہوئے ناسفتہ گہر
کتنے اسرار ہیں آمادۂ اظہار ابھی
ابھی نسلوں کے اک انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی
راہیں لٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نقوش
سن رہا ہوں تری پازیب کی جھنکار ابھی

اگر حضور ابھی مائل ظہور نہ تھے — تو تشنگانِ محبت بھی ناصبور نہ تھے
اُفق کی دھند میں لپٹے ہوئے چراغ سے ہیں — وہ دن جب آپ کے انداز پُرغرور نہ تھے
جزا تو خیر، سزا کے لئے ترستے رہے — غلام آپکے، اتنے تو بے قصور نہ تھے
مرے نصیب کو کیوں تابع نجوم کیا — اگر نجوم مری دسترس سے دور نہ تھے

تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے — اُمنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں
تمام میکدہ سنسان، میگسار اُداس — لبوں کو کھول کے کچھ سوچتی ہیں مینائیں

نئے چراغ جلا لوں، مگر یہ عزم صمیم — کہ شمع کشتہ سے ہر حال میں نباہ کروں
کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو — کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

چشمِ سرشار میں حیا چمکی — ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی
گردشِ چشم ہے کہ گردش دھر — پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی
کائنات ایک دشت بے انجام — اب کہاں ڈھونڈیئے کسی کی گلی

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے — ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں — آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب — کس دھند لکے میں ہمیں پہنچا گئے
رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی — آج سیّارے اگر ٹکرا گئے ؟
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

کس نے ڈھالا تھا پیکرِ آدم — کوئی لذت اگر ہوس میں نہیں
کاکلیں کھیلتی ہیں شانوں پر — کائنات اب کسی کے بس میں نہیں

کلیاں کس دور کے تصور میں — خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

یہ تیری چاپ ہے یا مرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دور کی آواز
غبار ، اوجِ بصارت ، ستارے بارِ نظر
بہت لطیف ہیں احساس کے نشیب و فراز

چاند بھی ساکن وقت بھی ساکن — شاید تُو کچھ سوچ رہا ہو
تو نے یوں شرما کر دیکھا — جیسے تھک کر دِیا بجھا ہو
وقت سحر یوں کلیاں چٹکیں — جیسے تیرا نام لیا ہو
تو کہتا ہے تارا ٹوٹا — اور اگر آنسو ٹپکا ہو !

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ — چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں
اگر نہایت بے چارگی ہے چارہ گری — تو کس امید پہ زخم جگر کا ذکر کریں
تمام عمر کٹے چاک دامنی کے گِلے — بعزم بخیہ گری ، بخیہ گر کا ذکر کریں
مرے ندیم ! مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

ہجومِ فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہرسو چراغ جلتے ہیں
چمک رہے ہیں شگوفے ، دھک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسم گل ہے کہ باغ جلتے ہیں
ترے نصیب میں راتیں ، مرے نصیب میں دن
ترے چراغ ، مرے دلکے داغ جلتے ہیں

مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کناں — یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں
میں گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں — گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں
یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں — جو تو رفیق سفر ہو تو رات ، رات نہیں

اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا — وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں

یہی عنوانِ کرم ہے تو زہے لطف و کرم — سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں نشتر تیرے

ہوتا نہیں ذوق زندگی کم — بنیادِ حیات ہے ترا غم
تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی — کوندے کی لپک غزال کا رم
زخموں میں چٹک رہی ہیں کلیاں — ہوتی ہے یونہی بساط برہم

یہ اور بات کہ انجان بن گئے ورنہ — ترے خرام کو پہچان لیں ہزار میں ہم

یہ سوچتا ہوں کہ پھولوں کے رقص کی بنیاد
نہ جانے باد چمن ہے کہ تیرا حسن خرام

یہ کیا طلسم ہے ، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رکے ہوئے بھی تمہی ہو ، رواں دواں بھی تمہی

ہر گل ہے پناہ گاہِ زنبور — گلچیں کو گِلہ ہے باغباں سے
جو پیار نہ کر سکے زمیں سے — پائیں گے نہ بھیک آسماں سے
ہم آبلہ پا ہی اے زمانے ! — اُلجھیں گے تیرے یمِ رواں سے
یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس — انساں ہٹا جو درمیاں سے
گنجینۂ وقت بن گئی ہے — جو بات نکل گئی زباں سے

منظومات

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ جھانکا کس نے
نیندِ کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھا مے
کس نے پائل کی مدھر تال پہ دوہے گائے

سونی سونی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جنکی جھنکار

مرمریں گالوں پہ روشن ہیں شفق رنگ دیئے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر جیسے
سیپی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کہانوں سی بھنوؤں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی
مسکراہٹ میں گجردم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں
جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا
وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادئ خواب میں وہ سرسر دنیائے شعور
جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آ جائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہن تار
تارے ٹکرائے خلاؤں میں فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لئے صبح کی دیوی آئی

رات بیکراں تو نہیں

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنہیں — اداس نہیں

آفق دھڑک تو رہا ہے، سجھائی دے کہ نہ دے
شفق آبل تو رہی ہے ، دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاؤں کے انتظار میں ہے
کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں
وہ ایک اور ستارا لرز کے ٹوٹ گیا !
بجا کہ رات بھیانک ہے ، بیکراں تو نہیں
عظیم وقت کی رفتار رائگاں تو نہیں
سنا ہے دو قدم آگے مہک رہے ہیں چمن
اسی لئے تو ہواؤں میں ہے لطیف چبھن
اسی لئے تو اندھیرے میں پڑ رہی ہے شکن
اسی لئے تو قدم تیز تیز آٹھتے ہیں
طلسم شب کا یہی توڑ ہے قدم نہ رکیں
اندھیرا ٹوٹ کے برسے ، مگر یہ سر نہ جھکیں
نجوم بجھتے رہیں ، تیرگی آمنڈتی رہے
سحر کا توڑ کسی ذی نفس کے پاس نہیں

انسان عظیم ہے !

اس نے تجھے عرش سے بلایا
انسان عظیم ہے خدایا !
تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا !
تو نور ہی نور بن رہا تھا وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایا
انسان عظیم ہے خدایا !
تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے تو آگ ہے اور وہ آجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ تو دشت ہے ، وہ چراغ لالہ

انساں نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا !

تو عین حیات ہے، مگر وہ تزئین حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام سامان ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا !

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سواب ہے وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا !

مری شکست

مجھے تسلسل لیل و نہار کی سوگند بجھا نہیں ہے سرِ راہ انتظار چراغ
گلوں میں لپٹی ہوئی یادِ یار کی سوگند کھلا ہوا ہے ابھی تک مری شکست کا باغ
چٹخ گیا ہے اگر فرط تشنگی سے ایاغ
اگر غبارِ سرِ راہ سے اٹا ہے دماغ
تو اس غبار میں ہیں کتنی منزلوں کے سراغ
مجھے شباب کی اس یادِ یار کی سوگند

اسی شکست تمنا کے دم سے آج مجھے دکھائی دیتے ہیں کتنے صنم چٹانوں میں
رہی عزیز کچھ ایسی جہاں کی لاج مجھے کہ میں بھٹک نہ سکا تیرہ آسمانوں میں
کوئی گداز نہیں خلد کے فسانوں میں
مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں
بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں
لبھا سکا فقط انسان کا مزاج مجھے

میں تیرے جسم کی حدّت ابھی نہیں بھولا اسی کی آگ مرے شعلۂ حیات میں ہے
میں اپنے شوق کی شدّت ابھی نہیں بھولا وہ کیفیت تو عیاں میری بات بات میں ہے
مرا غرور ترے حسن کے ثبات میں ہے
تو میرے دل میں نہیں، ساری کائنات میں ہے
تو دن کی طرح نہاں اس اندھیری رات میں ہے

میں تیرے ذوق کی حدّت ابھی نہیں بھولا
ترے لبوں کی نمی اور تری نظر کی کرن
مرے شعور میں تحلیل ہو کے پھول بنی
یہ رات جسکی جبیں پر ہے تیرگی کی شکن
مرے لئے تو ترے گیسوؤں کا طول بنی
مری شکست، مری فتح کا رسول بنی
مری شکست مرے راستے کی دھول بنی
مری شکست تو ادراک کا آصول بنی
کلی کا خون ہوا اور سنور گیا ہے چمن

قطعات

عزم

ان بھیانک، جلی چٹانوں میں
زندگی کا سراغ پاؤں گا!
ہم سفر تو ٹھہر سکے تو ٹھہر
میں تو ان چوٹیوں پہ جاؤں گا

سانولا سلونا

ڈھول بجتے ہیں، دنا دن کی صدا آتی ہے
فصل کٹتی ہے، لچکتی ہے، بچھی جاتی ہے
نوجواں گاتے ہیں جب سانوے محبوب کا گیت
ایک دوشیزہ ٹھٹک جاتی ہے، شرماتی ہے

انجم شناس

اندھیروں میں کٹی ہے زیست جن کی
نہیں کرتے ستاروں، کی غلامی
بھٹک جاتے ہیں جب پگڈنڈیوں سے
تو بنتی ہے سہارا نرم گامی

ہمہ اُوست

میں نے معصوم بہاروں میں تجھے دیکھا ہے
میں نے موہوم ستاروں میں تجھے دیکھا ہے
میرے محبوب! تری پردہ نشینی کی قسم
میں نے اشکوں کی قطاروں میں تجھے دیکھا ہے

مسافر

دلِ بیدار و توفیق سفر دے
مقام جستجو پاؤں نہ پاؤں
جہاں سے کارواں گزرا ہے تیرا
میں ان راہوں کو جا کر دیکھ آؤں

نور پوشی

آداس چاند نے بدلی کی آڑ میں ہو کر
کنارے کالی گھٹاؤں کے کر دئے روشن
شبِ وصال میں جیسے تصوّر رخِ دوست
دلِ حزیں کے اندھیرے میں روشنی کی کرن

سکندر علی وجد

سکندر علی متخلص به وجد ' اورنگ آباد کے رہنے والے ہیں جہاں اُن کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں ہوئی - تعلیم کے ابتدائی مراحل وطن میں طے کرنے کے بعد آپ نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی - اے کی ڈگری حاصل کی - پھر حیدرآباد سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر سر رشتۂ عدالت میں ملازم ہوئے - جب سے اس شعبہ سے متعلق ہیں اور قیام زیادہ تر حیدرآباد ہی میں رہتا ہے -

وجد صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے شاعری کا شوق ہے ' شعر گوئی کا آغاز تقریباً ۱۹۳۰ء سے ہوا ' اُس وقت سے مشق سخن برابر جاری ہے اور آج ان کا شمار حیدرآباد کے نوجوان شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے - نظم و غزل دونوں میں دستگاہ حاصل ہے - لیکن اُن کا رجحان زیادہ تر نظم نگاری کی طرف رہا ہے اور یہی اُن کی شہرت و مقبولیت کا باعث ہوئی - اُن کی نظمیں رنگینی ' موسیقیت' جدت اور عشقیہ سوز و گداز سے لبریز ہیں - اپنی نظموں میں اُنھوں نے ایسے موضوعات و مسائل پر بھی قلم اُٹھایا ہے جنھیں وقت کا راگ کہنا چاہئے' مثال کے طور پر ''کسان'' ''نوجوان سے خطاب'' ''پنکھا قلی'' ''وقت کی آواز'' وغیرہ لیکن اس سے کہیں زیادہ دلکش اُن کی تاریخی و رومانی منظومات ہیں - خصوصاً تاریخی آثار و مشاہیر پر طبع آزمائی کر کے اُنھوں نے بعض ایسے شاہکار پیش کئے ہیں جن میں شاعر کی قوت تخیل ' مشاہدہ ' جدت طرازی اور لطف بیان اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں جذب و دلکشی اور درد و اثر زیادہ ہے - اس سلسلے میں وجد صاحب کی ''اجنتا'' ''عبدالرزاق لاری'' ''چاند بی بی'' ''تاج محل'' ''محمد علی'' وغیرہ نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں -

جہاں تک اُن کی رومانی نظموں کا تعلق ہے اُن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے - وہ اپنی عشقیہ وارداتوں اور رومانی لمحات زندگی کا بیان کچھ ایسے حسین الفاظ اور رنگیں و لطیف پیرائے میں کرتے ہیں کہ ساری نظم میں حسن و نغمہ کی ایک مخصوص فضا پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا اس کیف آور فضا کے اثر سے محظوظ و متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا - اپنی رومانی شاعری کا تعارف خود وجد صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

سنا رہا ہوں یہ روداد اُس زمانے کی ‏ ‏ ‏ چمن کی تھی کوئی پروا ' نہ آشیانے کی
مصیبت آئی نہ تھی پیش ' سر جھکانے کی ‏ ‏ ‏ ہر ایک بات پہ ہمت تھی مسکرانے کی

جنوں بدوش تھا ہنگام نوجوانی کا
نئی بہار تھی ' موسم تھا گلفشانی کا

اور بلا شبہ شعر میں ایسی رنگینی و سرمستی زندگی کے ایک ایسے ہی دور میں پیدا ہو سکتی ہے جب ہر نوجوان شباب و خواب کی ایک مثالی دنیا میں دن گزارا کرتا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ حسن و عشق سے اس درجہ شیفتگی ہونے کے باوجود ان کی نظموں میں وہ کھویا ہوا پن اور مظلومیت نہیں ہے جو ہماری رومانی شاعری کی ایک لازمی خصوصیت ہے۔ علیٰ ہذالقیاس غزلوں میں ایک پھیکا پن ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجد صاحب غزلیں نظموں کی طرح ڈوب کر نہیں کہتے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ اس صنف سخن کی طرف ان کی توجہ نسبتاً کم رہی ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرف زور دیں تو یقیناً بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ وجد صاحب کا ایک مجموعۂ کلام ''لہو ترنگ'' ۱۹۴۴ء میں چھپکر ادبی دنیا میں خاصا مقبول ہو چکا ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

یہ سب قصور ہے اے قیس کم نگاہی کا نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے
سفینہ ڈوب چکا اب سکوں ہے اے طوفاں بھنور کو دامن ساحل بنا دیا تو نے
بچاؤ اپنے نشیمن کا ''وجد'' خوب کیا جو بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

عجب آرزو ہے انوکھی طلب ہے تجھی سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

رہےگا ''وجد'' بیاں عشق کا سدا یکساں بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

دل کی بستی عجیب بستی ہے یہ اجڑنے کے بعد بستی ہے
سارا عالم ہے خواب کا عالم ساری ہستی فریب ہستی ہے
خوف صیاد آشیاں کو نہیں برق کے زیر سر پرستی ہے
''وجد'' مت بھول اوج قسمت پر
ہر بلندی کے بعد پستی ہے

ترے آتے ہی سب دنیا جواں معلوم ہوتی ہے
خزاں رشک بہار جاوداں معلوم ہوتی ہے

کسی کی جستجو میں ''وجد'' اس منزل پہ پہنچا ہوں
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

دیر سے یاد آ رہی ہے تری — کیا تجھے یاد آ رہا ہوں میں
جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو — برق پر مسکرا رہا ہوں میں

کھلائے غنچۂ گل ، غنچہ ہائے دل نہ کِھلے
نسیم واقف طرز خرام یار نہیں
ہمیشہ باد مخالف میں جگمگاتا ہے
چراغ عشق چراغ سر مزار نہیں

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے — ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی

خوش ہوا قلب چمن جب وہ شگوفے نہ کِھلے
جن کے انداز سے پیدا تھا گلستاں ہونا
اے صبا لالۂ کم ظرف سے اتنا کہہ دے
دل کی توہین ہے داغوں کا نمایاں ہونا

دل و جاں تری طرز پرسش کے صدقے — مجھے تجھ سے کچھ بد گمانی نہیں ہے

رہرو راہ محبت کے لئے منزل نہیں — زندگی کا عشق حاصل ،عشق کا حاصل نہیں
ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل — اب کوئی غم امتحاں عشق کے قابل نہیں

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو — اک بار دل میں شمع محبت جلا کے دیکھ

ہنگام سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں — انجام جھلکتا ہے شباب گل تر کا

یقیناً کوئی شمع ہستی بجھے گی — جبین محبت پہ تا بندگی ہے

تیری نیچی نگاہ کے آگے کس کو دعویٰ ہے خوش بیانی کا

اُس نے پوچھا تو بات کر نہ سکے خلش عرض حال نے مارا
بزم میں تجھ کو دیکھتے ہی رہے لذت انتخاب نے مارا

سینے میں جیسے پھانس کھٹکتی ہے دم بدم
تیرا خیال درد جگر بن کے رہ گیا

پھول چننے سے پہلے گلچیں نے بند کر دی زباں عنادل کی

نگاہ اہل گلشن کہہ رہی ہے خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے
چراغ زندگانی بجھ رہا ہے وہ جان انتظار آئے نہ آئے

جو چھلکتی ہے چشم ساقی سے وہی صہبائے ناب ہوتی ہے
نوجوانی کا حسن کیا کہنا
ہر ادا لا جواب ہوتی ہے

منظومات

اجنتا

جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنت قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب کہنہ کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی، آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں، جو لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہر شان جمالی ہے

جگر کے خوں سے سینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیّر خانۂ مانی
مشّکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی
تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی
گلستان اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا اہل جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصل بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا
سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا
دل کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھدی
جگر داروں نے بنیاد جہان جاوداں رکھدی

ہنر مندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذت درد جگر دی ہے
کُھلیں گے راز، اس ڈر سے دھن پر مُہر کر دی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ ارباب ہمم کی سعئی پیہم کا
جنھیں احساس بھی باقی نہ تھا کچھ شادی وغم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسن عالم کا
قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسم اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقیّد بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے، جاوداں پیغام کی خاطر
خوشامد اہل دولت کی نہیں کی نام کی خاطر

نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جئے بھی کام کی خاطر، مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ھیں نگاھوں کے
رھیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاھوں کے

شباب و خواب کی دنیا

یہاں اکثر سنے تھے حسن کے راز نہاں میں نے
یہاں پہروں کہی تھی درددل کی داستاں میں نے
یہاں ڈھونڈا تھا سجدوں کیلئے اک آستاں میں نے
یہاں پائی تھی آخر اک بہشت جسم و جاں میں نے
یہی تھی ھمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

وہ آ جاتا تو شب رشک سحر معلوم ھوتی تھی
ھر اک شے حسن سے جنت نظر معلوم ھوتی تھی
جوانی کی نظر صہبا اثر معلوم ھوتی تھی
خوشی میں زندگانی مختصر معلوم ھوتی تھی
یہی تھی ھمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

بھری برسات میں پچھلے پہر گِھر کر سحاب آتا
بہاریں ٹوٹ پڑتیں ذرے ذرے پر شباب آتا
جنوں کا دور ھوتا دور میں جام شراب آتا
مثال موج مے، ساقی کے چہرے پر حجاب آتا
یہی تھی ھمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

پیام زندگی دیتی تھیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
بیاں کرتے تھے دونوں حسن و اُلفت کی کراماتیں
فضا میں گونجتی رھتی تھیں پیہم دل نشیں باتیں
یہی تھی ھمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

محبت کے نشے میں حسن کے دریا بہاتے تھے
مجھی کو ابتدائے عشق کا قصہ سناتے تھے
کہیں میں مسکرا دیتا تو فوراً روٹھ جاتے تھے
ستانے کے لئے منہ پھیر کر کچھ گنگناتے تھے

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

کبھی قبل سحر پورا نہ ہوتا میرا افسانہ
جھکورے نیند کی موجوں میں کھاتی جان میخانہ
بھڑک کر شمع بنتی زینت آغوش پروانہ
یونہی اکثر چمکتی رات بھر تقدیر غم خانہ
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

اندھیری رات میں آن کا چلا آنا قیامت تھا
مری حیرانیوں پر پھول برسانا قیامت تھا
صدائے جنبش داماں سے گھبرانا قیامت تھا
سحر کے نور میں ، ہنس کر سہا جانا قیامت تھا
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

ایک نرس

گھٹا رحمت کی برسے روز و شب تیرے نشیمن پر
مصائب جھیلتا ہے تیرا قلب نازنیں اکثر
نسیم آتی ہے سب سے پیشتر تیرے جگانے کو
گلوں سے قبل اوس آتی ہے تیرا منہ دُھلانے کو

سحر ملبوس نورانی قمر سے مانگ لاتی ہے
تجھے پہنا کے جوڑا گُل جہاں پر پھیل جاتی ہے
ہوائیں مست و عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں
ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں

دل پژمردہ پاتے ہیں رہائی بے قراری سے
تری آمد نہیں کم آمدِ باد بہاری سے
بلا کی دل نشینی ہے تری گفتار نے پائی
تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی

نہاں جذبات سہر و لطف ہیں خدمت گزاری میں
اثر اکسیر کا پنہاں ہے تیری غمگساری میں
تبسم ، جس سے پھولوں کے دلوں میں رشک پیدا ہو
تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو
نظام دھر کو تھا ناز اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پر

وقت کی آواز

اے مرد خدا اٹھ ، ہے یہ ہنگام تگ و تاز
جنگاہ کی بنیاد ہلا دے تری آواز
اس معرکۂ سخت میں تقلید جنوں کر
بھٹکائے نہ تجھ کو خرد تفرقہ پرداز
بیکار نہ جائے گی تری شعلہ نوائی
تدبیر سے ہو جائیں گے تقدیر کے درباز
پھر بزم میں اس رنگ سے مضراب زنی کر
نغمات کے شعلوں پہ مچلتا ہو دل ساز

درکار ہیں اس وقت وہ پر عزم نگاہیں
ہوں جن سے خجل برّش شمشیر کے انداز
اک بار گراں روح پہ ہے قوت بازو
دل ہی میں نہیں جب خلش لذت پرواز
یہ کام نہیں لشکر و شمشیر و سناں کا
ہمت ہے جہاں گیر، جہاں سوز، جہاں ساز

مٹ جائیگی وہ قوم جو بیدار نہ ہو گی
کٹ جائے گا جس ہاتھ میں تلوار نہ ہو گی

میرا مسلک

میں بزم عشرت احباب کو برہم نہیں کرتا
کبھی اشکوں سے اپنے اُن کا دامن تر نہیں کرتا
یہ اک دستور ہے میرا کہ اپنے قدر دانوں کو
شریک عیش کرتا ہوں ، شریک غم نہیں کرتا

ایک تازہ غزل

زندگی جب اجل سے ٹکرائی
دیر تک روشنی نظر آئی
شب نوازوں کا دور ختم ہوا
آ رہے ہیں سحر کے شیدائی
ہر ادا شعر، ہر سخن نغمہ
نوجوانی تمام رعنائی
اُس نے جب مسکرا کے منہ پھیرا
ایک بجلی سی دل پہ لہرائی

"وجد" حسن سخن پہ ناز نہ کر
خامشی ہے کمال گویائی

ساحر لدھیانوی



عبدالحئی متخلص بہ ساحرؔ لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ سال ولادت غالباً ۱۹۲۲ء ہے۔ ساحر صاحب لدھیانے کے ایک مقتدر جاگیردار کے چشم و چراغ ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے وہ کمسن ہی تھے کہ اُن کی ماں اور والد کے تعلقات خراب ہوگئے اور ایک نزاعی مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ کس کے پاس رہیں۔ جاگیردار باپ کو ایک ولی عہد کی ضرورت تھی اور حسن اتفاق سے ساحر کے علاوہ اُن کے کوئی اولاد نرینہ بھی نہ تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے گھر کا جھگڑا عدالت میں پہنچا دیا۔ ساحر نے مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہو کر ماں کے پاس رہنے کی فطری خواہش کا اظہار کیا۔ اس واقعہ کے بعد ظاہر ہے ساحر کے والد کو اُن سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور وہ ہمیشہ کے لئے شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔

ساحر صاحب کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری اُن کی والدہ اور ماموں کے سر رہی ہے۔ اُنہوں نے ۱۹۳۸ء میں خالصہ ہائی سکول لدھیانہ سے انٹرنس پاس کیا۔ اُس کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں اُنہوں نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اُن کی سیاسی دلچسپیاں اس درجہ بڑھ گئیں کہ ۱۹۴۲ء میں جبکہ وہ بی۔اے فائنل کے طالب علم تھے اُنہیں یہ پتہ چلا کہ انگریز دشمنی کے جرم میں عنقریب کالج سے نکال دئے جائینگے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی وہ لدھیانہ کو خیرباد کہکر لاہور چلے آئے اور اسلامیہ کالج میں داخل ہوگئے۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بی۔اے کے امتحان میں شریک ہونے سے قبل ہی انہیں اپنی تعلیم کو ختم کردینا پڑا۔ کالج سے نکل کر ساحر صاحب نے "ادب لطیف" "شاہکار" اور پھر "سویرا" میں مختلف اوقات میں کام کیا۔ اسی دوران میں وہ ۱۹۴۵ء سے اواخر ۱۹۴۶ء تک کئی مرتبہ بمبئی گئے۔ معاشی نقطۂ نظر سے یہ شہر انہیں بہت پسند آیا چنانچہ تقسیم ہند کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں وہ مستقل طور پر لاہور سے بمبئی چلے گئے اور اب فلمی گانے و مکالمے لکھنے کے سلسلے میں اُنہوں نے وہاں بڑی اچھی ساکھ قائم کر لی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مشغلہ اُن کی فکر و فن کے لئے کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہوگا مگر نہ جانے اس معاشی بد حالی کے دور میں ساحر جیسے کتنے فنکار پیٹ کی خاطر ایسے ہی مشاغل اختیار کئے ہوئے ہیں۔

ساحر کی شاعری کا آغاز ۳۸ء سے ہوا جب وہ ہائی سکول کے طالب علم تھے - شعر گوئی کے معاملے میں وہ نہ کسی کے شاگرد ہیں اور نہ ہی کسی سے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے - البتہ فیض کی شاعری سے بہت متاثر ہیں اور غالباً یہ فیض ہی کا اثر ہے کہ ساحر نے عام نوجوان شعرا کی طرح ہیئت شاعری میں کسی قسم کا اجتہاد کرنے کے بجائے معنی و موضوع اور سب سے زیادہ انداز بیان میں اجتہاد کیا ہے - اُن کے کلام میں یوں تو تفکر کی گہرائی ' مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثر آفرینی سب کچھ موجود ہے لیکن ان خصوصیات سے کہیں زیادہ شدت احساس کی کار فرمائی ہے پھر چونکہ ساحر کے فن کی بنیادیں صالح اور پر خلوص احساس پر استوار ہیں اسلئے اُن کا کلام نہایت حقیقت افروز اور موثر ہے -

ساحر نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں اور سیاسی و سماجی بھی - اُن کی رومانی نظموں میں عشق و محبت کی رنگینیاں و سر شاریاں تو موجود ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مدت تک رومان کے دھندلکوں میں رہنے کے بجائے حقائق کے اُن کھلے میدانوں میں نکل آئے جہاں قدم قدم پر خلاف فطرت معاشی مفروضوں اور خود ساختہ اخلاقی معیاروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے زندگی کی یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر ساحر کی محبت غور و فکر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

یہیں سے ساحر کے یہاں ایک ذہنی انقلاب شروع ہوتا ہے جو اُنہیں حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھاتا ہے - ساحر کی فکری نظموں میں ایک مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے اور اُن کے ایک ایک شعر سے ایک نئے دکھ' ایک نئے زاوئیے اور ایک نئی صبح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں -

ساحر کا اسلوب نہایت دلکش' واضح اور منفرد ہے - آپ ساحر کی تمام نظمیں پڑھ جائیے آپ کو کہیں ابہام کا شائبہ بھی نظر نہیں آئیگا - اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں کوئی اُلجھاؤ نہیں ہے اور وہ قانون' مذہب یا سماج جس پر بھی قلم اُٹھاتا ہے تو دور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں کے بجائے نہایت نرم و نازک اشاریت سے کام لیکر ایسی جچی تلی باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان باتوں سے محظوظ اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس میں شک نہیں کہ ساحر کے یہاں کہیں کہیں تھوڑی بہت تلخی ضرور پائی جاتی ہے لیکن سچ پوچھئے تو ابھی اُن کی اور اُن کے فن کی عمر ہی کیا ہے - تا ہم اُنکے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ پختگی عمر کے ساتھ ساتھ جوں جوں اُن کا مشاہدہ وسیع' تجربات متنوع اور قوت فکر رسا ہوتی جائیگی اُن کی اس تلخی میں شیرینی کا عرفان بھی پیدا ہوگا اور کلام کی ہمہ گیری و رچاؤ میں بھی اضافہ ہوگا - اس سلسلے میں ساحر کی شاعری سے متعلق احمد ندیم قاسمی صاحب کے خیالات بھی قابل ذکر ہیں وہ ساحر کے مجموعہ کلام '' تلخیاں '' کے مقدمے میں فرماتے ہیں '' ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیز اور نمایاں ہے - اور چونکہ اُس کا احساس زندہ اور بیدار ہے اس لئے اردو کے جدید شعرا میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہے - اگر اُس کے کلام کی پختگی' زبان کی پاکیزگی اور اُسلوب کی بے پناہ

جاذبیت کے مقابلہ میں اُس کی عمر کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا ہے۔ لیکن شاعری سن وسال کی محتاج نہیں۔ ساحر کی اُٹھان نہایت درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے۔ اگر وہ افراط و تفریط سے بچا رہا اور اپنے خلوص کو بے لوث اور اپنے احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعرا کی صف اول میں شامل ہو جائیگا۔''

غرض ساحر لدھیانوی دور حاضر کے ایسے نوجوان شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام کی گوناگوں خوبیوں کی بدولت ایک مخصوص و منفرد مقام حاصل کر لیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے موجودہ مشاغل و مصروفیات سے وقت نکال کر نہ صرف اپنی اس بندھی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھیں گے بلکہ اُن توقعات کو بھی پورا کرنے میں کامیاب ہونگے جو ادبی حلقوں نے جائز طور پر اُن کی شاعری سے وابستہ کر رکھی ہیں۔

انتخاب کلام

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے
اور اب جبکہ مری روح کی پہنائی میں
ایک سنسان سی معصوم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعائیں لے کر
گُل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے
میری محبوب یہ ہنگامۂ تجدید وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کے لئے
اُن کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں
ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ اُمید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے

میری در ماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش
ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابر گریزاں سے مجھے کیا لینا ؟
بجھ چکے ہیں میرے سینے میں محبت کے کنول
اب تیرے حسن پشیماں سے مجھے کیا لینا ؟
تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگی غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاہوں کا پیام تجدید
اک تلافی ہی سہی --- میری تمنا تو نہیں

گریز

مرا جنون وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسون زیبائی
ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گرد مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریب شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کار فرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
عجیب عالم افسردگی ہے رُو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
تری نظر ترے گیسو تری جبیں ترے لب
مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تیری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گذر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بِکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرور برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوت حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اسکے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی

نہیں نہیں، مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تاب نغمہ پیرائی
مرا جنون وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسون زیبائی

پھر وہی کنج قفس......

چند لمحوں کے لئے شور اُٹھا ڈوب گیا
کہنہ زنجیر غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیل بلا ہے وہی دام امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطل کا فسوں
نبض اُمید وطن اُبھری مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا
دست اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کیلئے چھوڑ گئے
ارض بنگال! اُنھیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول چٹگاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول!
بول اے پیپ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار
روک ان لوٹتے قدموں کو، انہیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کر دو

فریب جنت فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی اُمیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشن وُرود بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہ گل ولالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے ۔۔۔ اُفق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہر منور، کہاں کی تنویریں ۔۔۔ کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے ۔۔۔ خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا ؟
وہی شکست تمنا وہی غم ایّام ۔۔۔ نگار زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا ؟

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں ۔۔۔ حریم شاہد رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہگذر ختم ہو گئی ——— لیکن ۔۔۔ ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو ! قدم بڑھائے چلو ۔۔۔ پرانے رہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے ۔۔۔ شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہر اُلفت ہی سہی
تجھ کو اس وادئی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب ! کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی ؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشان
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی ؟
میری محبوب ! پس پردۂ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں

سینۂ دھر کے ناسور ھیں کہنہ ناسور
جذب ھے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں
میری محبوب! اُنھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ھے اِسے شکل جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رھے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ھم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ھے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

ایک منظر

اُفق کے دریچوں سے کرنوں نے جھانکا   فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کُہرے کی چادر   جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اُٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے   پُر اسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے   لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دئے جھلملائے

متفرقات

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں   جو کچھ مجھے دیا ھے وہ لوٹا رھا ھوں میں

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا   آہ کن آنکھوں سے انجام تمنّا دیکھتے

ابھی زندہ ھوں لیکن سوچتا رھتا ھوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

آنھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو — برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے
میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو — دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے
اب اے دل تباہ ترا کیا خیال ہے — ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوار نے

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ — دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھکو

ٹوٹا طلسم عہد محبت کچھ اس طرح — پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے — وہ بھی نشاط روح کا ساماں نہ کر سکے

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے — پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب — ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

فطرت کی مشیّت بھی بڑی چیز ہے لیکن — فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

مجھے معلوم ہے انجام رُوداد محبت کا — مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعئی رائیگاں کرلوں

موت آ گئی نہ ہو مرے ذوق آمید کو — محرومیوں میں کیف سا پانے لگاھوں میں

اپنی تباھیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی

زمیں نے خون اُگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری
میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے ابتک
مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری
یہ منظر کونسا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

معمورہ احساس میں ہے حشر سا برپا　　خاموش مگر طبع خود آراء نہیں ہوتی
نالاں ہوں میں بیدردیٔ احساس کے ہاتھوں　　دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی
بیگانہ صفت جادہ منزل سے گزر جا　　ہر چیز سزا وار نظارا نہیں ہوتی
فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے، لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

ز۔خ۔ش صاحبہ

اردو کی یہ شاعرۂ شعلہ‌نوا' جو ادبی حلقوں میں اپنے نام کے مخفف ز-خ-ش سے متعارف ہے' کا اصل نام زاھدہ خاتون شروانیہ تھا ۔ زاھدہ' نزھت اور ز۔خ تینوں تخلص کرتی تھیں ۔ آپ دسمبر ۱۸۹۴ء میں اپنے والد مرحوم نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کی قدیم سکونت گاہ بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئیں اور جدید فرودگاہ ''ظفر منزل'' جو ریاست بھیکم پور کے قریب ھی‌واقع ھے' میں پرورش پائی ۔ چار پانچ سال کی عمر میں چونکہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے والد مرحوم کے کاندھوں پر آ پڑی ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ انھیں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ھے کہ زاھدہ صاحبہ اسم بامسمیٰ ھونے کے ساتھ ساتھ صاحب علم و فضل اور نہایت باذوق خاتون بنیں ۔ آپ کی تعلیم قدیم مشرقی انداز کے مطابق گھر پر ھی ھوئی اور تربیت کے لئے ایک ایرانی معلمہ رخشندہ نامی مقرر کی گئیں ۔ یہ معلمہ ایران کے شاھی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور فارسی کی بڑی اچھی شاعرہ تھیں ۔ چنانچہ انھیں کے فیض سے ز ۔ خ ۔ ش کے لئے فارسی زبان مادری زبان کی حیثیت اختیار کر گئی ۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ھے کہ اُن کی فارسی شاعری میں وھی یگانگت' تسلسل اور روانی پائی جاتی ھے جو اُن کی اردو شاعری کا جزو خاص ھے ۔

زاھدہ صاحبہ نہایت روشن خیال ۔ حریت پسند ' پکی مسلمان اور مشرقی اخلاق و عادات کا کامل نمونہ تھیں ۔ انھوں نے باوجودیکہ اتنی تعلیم حاصل کی کہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کر لیتی تھیں لیکن خاندانی رواج کے مطابق وہ نہ کسی عام جلسے میں شریک ھوتیں اور نہ کسی خاص علمی مجلس میں' تاھم اس محدود فضا میں رہ کر بھی اس ھونہار شاعرہ نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ھے وہ نہایت وقیع و لائق تحسین ھے ۔ افسوس کہ محترمہ نے بڑی مختصر عمر پائی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو بعالم دوشیزگی رحلت فرمائی ۔

مرحومہ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے اور اُن کا کلام اُس زمانہ کے اکثر رسائل میں مختلف ناموں سے شائع ھو کر خراج تحسین وصول کرتا رہا ۔ ان ناموں میں سے بعض ''سخن گو خاتون'' ''نادر خاتون'' ''ایک شریف بی‌بی'' ''ز ۔ خ ۔ ش'' وغیرہ ھیں لیکن علمی دنیا انھیں زیادہ تر موخرالذکر نام سے جانتی ھے ۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ھے کہ شعر و شاعری میں آپ کو کسی سے باقاعدہ تلمذ نہیں جیسا کہ خود کہا ھے ۔

بے فیض تلمذ ھوئی اُستاد سخن میں
یہ فخر ھے اس احقر خود ساز سے مختص

البتہ یہ فیضان رخشندہ خانم (معلمہ) ہی کا ہے کہ شعر کہنے کی صلاحیت جلا پا گئی - یوں تو مرحومہ عربی و فارسی میں بھی شعر کہتی تھیں لیکن اردو میں بالخصوص آپ کا رنگ نہایت پختہ و سنجیدہ ہے - آپ کے دو مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں - ان میں ''آئینہ حرم'' ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں آپ کے مشہور مسدس ''آئینہ حرم'' نیز چند دیگر منظومات شامل ہیں - یہ مجموعہ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا - دوسرا ''فردوس تخیل'' خاصا ضخیم مجموعہ ہے - یہ مجموعہ کلام باوجودیکہ خود زاہدہ صاحبہ کا مرتب کردہ اور اس کا نام بھی انھیں کا تجویز کردہ ہے لیکن اس کی اشاعت محترمہ کی وفات کے کافی عرصہ کے بعد ۱۹۴۱ء میں ہوئی -

زاہدہ صاحبہ کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ قومی و ملی رنگ آپ کی شاعری پر چھایا ہوا ہے - اس کے علاوہ اُن کی شاعری کا اہم موضوع خواتین کی مذہبی سماجی' تمدنی' اور اخلاقی اصلاح ہے - اس ضمن میں گو مرحومہ نے بہت کچھ لکھا اور بڑے موثر انداز میں حقائق کو پیش کیا ہے لیکن چونکہ یہ مسائل بذات خود بڑے ٹھوس اور خشک ہیں اس لئے یہ ناصحانہ کلام شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ کیف و سرور کا حامل نہیں - بایں ہمہ یہ اپنی افادیت کے لحاظ سے حد درجہ قابل قدر ہے - ساتھ ہی اس سے خود شاعرہ کی فارسی اور عربی کی دقیع استعداد کے علاوہ اُن کے دینی اور اسلامی تاریخ کے شغف کا بھی پتہ چلتا ہے -

محترمہ نہایت پر گو شاعرہ تھیں اور آپ نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے - آپ کے مجموعہ کلام میں حمدونعت' قصیدہ' مسدس' رباعی' غزل' نظم' قطعات غرضیکہ سب کچھ ملتا ہے اور اس میں عرفان حقیقت سے لے کر جذبات نگاری تک کی مثالیں موجود ہیں - لیکن آپ کی قومی و ملی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ علامہ اقبال سے خاصی متاثر تھیں اور ہونا بھی چاہئیے تھا کیونکہ یہ تو پورا دور ہی اقبال کا دور ہے اور اس نسل میں علامہ موصوف کی فکر کے اثرات شعوری' و غیر شعوری دونوں صورتوں میں موجود ہیں -

مختصر یہ کہ مرحومہ ز - خ - ش صاحبہ اردو کی بڑی ہونہار شاعرہ تھیں اور اُن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر افسوس کہ وہ نو عمری میں ہی اس جہاں فانی سے کوچ کر گئیں - تاہم انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے مرحومہ کی سنجیدہ مزاجی' علمیت اور قوم و ملت بالخصوص مسلم خواتین سے حددجہ ہمدردی اور اُلفت کا پتہ ضرور چل جاتا ہے - اور سچ پوچھئے تو یہ اسی پر خلوص شاعری کا نتیجہ ہے کہ گو مرحومہ نے تمام عمر خود کو گوشہ' گمنامی میں رکھا اور تا دم آخر اپنے اصلی نام سکونت اور شخصیت سے دنیا کو روشناس نہ ہونے دیا لیکن اس کے باوجود آج ادبی حلقوں میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ز - خ - ش کے نام سے واقف نہ ہوں -

انتخاب کلام

آئینہ حرم (انتخاب)

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر　　　لب پیوستہ' لب شہد فشاں سے بہتر

صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شے کے لئے حد ہے معیّن لوگو
ضابطہ درد ہو کب تک جگر زن لوگو

مہد سے تابہ لحد ظلم اٹھائے صدیوں تیر پر تیر دل خستہ نے کھائے صدیوں
چپکے چپکے گہُر اشک لٹائے صدیوں قصص حسرت دل، دل کو سنائے صدیوں
صنف غالب میں گر اس صبر و سکوں کا شمّہ
سعی و تفتیش سے مل جائے تو میرا ذمّہ

بھائیو! آہ رہے سینہ میں مدفوں کب تک دل ہی دل میں گلۂ طالع واژوں کب تک
آستیں سے ہو نہاں دیدۂ پر خوں کب تک غم کو پوشیدہ رکھے خاطر محزوں کب تک
حال دل کیوں نہ کہیں منہ میں زباں رکھتے ہیں
ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم خستۂ جور ہیں ہم، کُشتۂ بیداد ہیں ہم
تختہ مشق سناں بازئ صیّاد ہم ہیں آدمی کا ہے کوھیں پیکر فولاد ہیں ہم
ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر
اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

آتش ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر پھونک ڈالا تپ دق بن کے غموں نے اکثر
بے اجل مرتے ہیں تہ‌خانہ کے اندر گھُٹ کر ہیں جو تنگی میں منافق کی لحد سے بدتر
ڈاکٹر کہتے ہیں ''در کھولو ہوا آنے دو''
تنگدل کہتے ہیں ''ہرگز نہیں مر جانے دو

یاد ایّام کہ تھا بخت فدائے مسلم ڈھونڈھتے تھے فلک و ارض رضائے مسلم
دلِ ہرقل کو ہلاتی تھی ندائے مسلم تاج ایران تھا زیر کف پائے مسلم
رتبہ ''انتم الاعلون'' تھا اس کے لائق
قول ''اکملت لکم دینکم'' اس پر صادق

ہم سے غافل نہ تھی یوں انجمن قال اقول نہ گرایا تھا ہمیں صورت حرف معلول
عائشہ کے دھن پاک سے جھڑتے تھے جو پھول آج تک ہیں وہ بہار چمن شرع رسول
عرصۂ جنگ میں بھی ہم نے کئے کار وقیع
صنف نازک سے نہ تھی خولۂ جانباز و شجیع

کون ؟ مسلم وہی فرماں بر شاہِ انساں ہاں وہی مصلح اخلاق تباہِ انساں
ہاں وہی اوج دہ رایت جاہِ انساں ہاں وہی نور دہِ بخت سیاہِ انساں
ہاں وہی واقف عقلیت اسباب و علل
ہاں وہی واصف حریت افکار و عمل

مردوزن مل کے آٹھا سکتے ہیں وہ اثقل بار — کانپ آٹھا جس سے دل ارض و سپہر دوّار
مردوزن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار — جو خلیج متلاطم میں پڑی ہے بیکار

آؤ وحدت کی امانت کو آٹھالیں مل کر
آؤ ! اسلام کی کشتی کو بچا لیں مل کر

شوق نظارہ تھیٹر و بازار نہیں — مقصد حریت و علم یہ زنہار نہیں
حُکم برداریٔ شوہر سے بھی انکار نہیں — بخدا پردہ دری کے بھی روا دار نہیں

ہے حیا بادشہ علم کے سر کا افسر
قول مشہور ہے ''العلم حجاب الاکبر''

سدّ راہ ستم فتنہ گراں ہے پردہ — خازن معتمد گنج نہاں ہے پردہ
مظہر شان خداوند جہاں ہے پردہ — جذبۂ غیرت مسلم کا نشاں ہے پردہ

اثرعصر سے محفوظ ہے پردے کا وجود
دُور ہوں اس سے جو ناقابل برداشت قیود

مرد کا رتبہ گھٹانا نہیں ہر گز مقصود — زن کو بے شبہ رضا جوئی شوہر ہے ضرور
لیکن اس کو تو فراموش نہ فرمائیں حضور — بطن عورت سے ہوا نور محمّد کا ظہور

یہ تنفر، یہ حقارت کی نگاہیں کب تک
عرش جنباں ہوں خواتین کی آہیں کب تک

لذّتِ عرفاں

رنگ فطرت ہے وجہ حیرانی — عقل ہے اور حیائے نادانی
رازداں مدعا کو کہتے ہیں — حسن الفت کا داغ پیشانی
حسن ''باقی'' نے دل کو کھینچ لیا — رخصت اے حسن ہستئی فانی
دل ہے وقف رجائے رحم و کرم — جاں ہے نذر رضائے ربّانی
اب میں سمجھی کہ ہے فنائے خودی — انبساط بہشت لا فانی
غم نہ کر ہے نقیب ابر بہار — خشکی موسم زمستانی
دل صد پارہ کے الم گن لوں — دیکھی جائے گی سبحہ گردانی
کر سکے طے نہ ملک عرفاں کو — رومی و مغربی و کرمانی
دورئ بزم دوست کے غم میں — محو افغاں ہے اک افغانی
عرش کے کنگرے پہ طائر قدس — رات کرتا تھا یوں خوش الحانی
کہ ہے انساں طلسم شان خدا — قدر اپنی نہ اس نے پہچانی
بندکیں اس نے جب ذرا آنکھیں — کھل گیا راز بزم امکانی

چارۂ روح فلسفی ہے نہ شیخ
ایک وھمی ہے ایک خفقانی
کثرت این وآں میں وحدت دوست
گنج نایاب کی فراوانی
شیخ رنج بیاں کا ڈر نہ کرے
لا بیاں ہے یہ کیف وجدانی
متشکک ہے اور شکایت ھجر
"نزھت" اور شکر لطف پنہانی

پیام

دل فسردہ کو اب طاقت قرار نہیں
نگاہ شوق کو اب تاب انتظار نہیں
نہیں نہیں مجھے برداشت اب "نہیں" کی نہیں
خدا کے واسطے کہنا نہ ابکی بار "نہیں"
ہمیشہ وعدے کئے اب کے مل ھی جا آ کر
حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں
دکھاتی اپنی محبت کو چیر کر سینہ
مگر نمود مرا شیوہ و شعار نہیں
مری بہن ! مری محبوبہ ! حُب عجب شے ہے
جہان خاک نہیں کچھ، جو دوست دار نہیں

تحفۂ درویش

بحر غم میں ہے سخت طغیانی
سر سے آوپر گزر گیا پانی
کب تک اے نزھت برشتہ جگر
شور "یا رب" سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھونے سے
کہیں بنتے ھیں کام دیوانی
درد دل درد آفرین کو سنا
کر گزر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشت وحدت ہے دشت وحدت ہے
دیکھ آھستہ کرفرس رانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پر
عظمت بارگاہ یزدانی
مایۂ اشک، یاں بضاعت مور
ھیچ واں شوکت سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا
پہلے کر جان و دل کی قربانی
صدف فکر سے نکال گُہر
تر بتر کر عرق سے پیشانی
"نزھت" بے نوا سے ھدیہ بدست
ھو قبول جناب سلطانی
ھدیہ کیا ؟ ایک سادہ دفتر پر
لکھ کے لائی ھوں لفظ " لاثانی "
دیں ہے الفت، وطن افغانستان
عرف مجنوں ہے پیشہ حسّانی

دو رباعیاں

جاں بلب ضعف سے ہوں لب کو ھلاؤں کیونکر
دسترس اس پہ نہیں خامہ اٹھاؤں کیوں کر
حال پوچھو نہ مرا خود ھی بتاؤ مجھ کو
ایسی حالت میں تمہیں حال بتاؤں کیوں کر

مسلمانو! کہاں تک بے زباں حیواں کی قربانی
درِ جاں آفریں پر آؤ، کردیں جاں کی قربانی
موقر تھی خلیل رب کی قربانیٔ لختِ دل
مگر ھے اور شے شبیر با ایماں کی قربانی

تضمین براشعار غالب

درد الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری، ھائے ھائے
کیوں لگایا پھر وفا کا زخم کاری، ھائے ھائے
تجھ سا بے فکر - اور کسی کی غمگساری، ھائے ھائے
درد سے میرے ھو تجھ کو بے قراری ھائے ھائے
کیا ھوئی ظالم! تری غفلت شعاری؟ ھائے ھائے

کچھ ھنسی تھا شرکت رنج و الم کا حوصلہ
آہ یہ - اک خوگر ناز و نعم کا حوصلہ
کیوں کیا بے قوّت دل اس ستم کا حوصلہ
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ھائے ھائے

تھا مرا غمخوار بن کر پھولنا پھلنا محال
کٹ گیا آخر نہ تیرا نخل عمر؟ اے نونہال
آہ ناداں! کیوں نہ سوچا میری الفت کا مآل
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ھائے ھائے

جیتے جی ھم تم رھے گریک دل ویک جا — تو کیا
تا دم آخر - بھرا گردم محبت کا — تو کیا
عمر بھر پیماں رھا منت کش ایفا — تو کیا
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا — تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ھے پائیداری ھائے ھائے

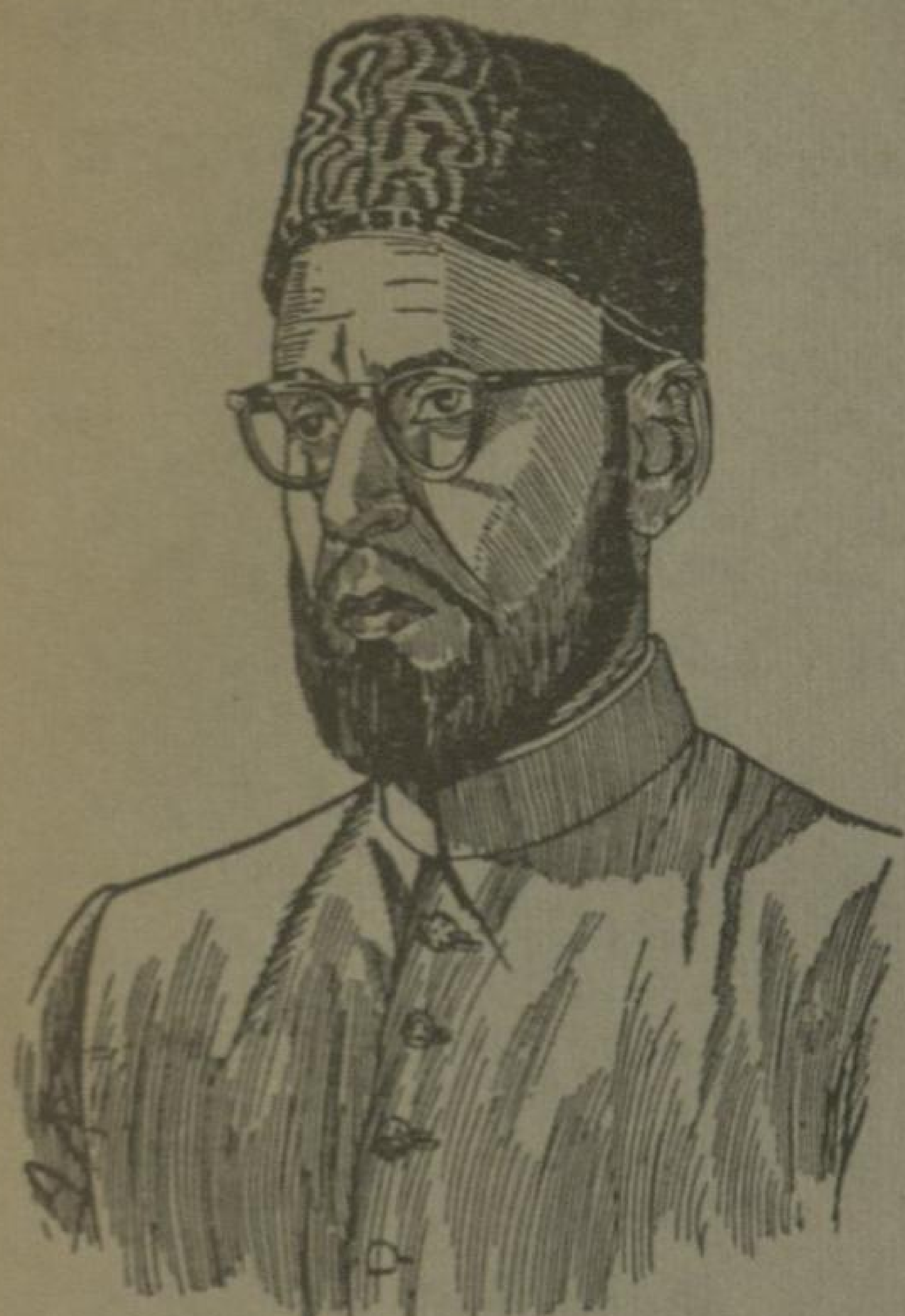
چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو تو نے راہ خلد لی
تیرے زخم ناوک فرقت سے میں جیتی بچی
ہو چکی بس اعتماد دل کی شیخی کِر کِری
خاک میں ناموس پیماں محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری، ہائے ہائے

وا دریغا تھا دل بیمار غم کو آسرا
"آب تیغ ناز سے اک دن مجھے ہوگی شفا"
حسرت اے شوق جراحت! رخصت اے ذوق فنا
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

غم ہرے کرتی ہے فصل اشکبار برشگال
مثل قسمت تار ہیں لیل و نہار برشگال
کب کھلے گا ہائے۔ ابر سایہ دار برشگال
کیسے کاٹوں ہائے۔ میں شب ہائے تار برشگال
ہے نظر خوکردہ، اختر شماری ہائے ہائے

ایک دن وہ بھی تھا جب دم بھر کی فرقت تھی محال
آہ اک دن یہ بھی ہے جب رونما ہے انفعال
یہ الم کب تک سہوں؟ کب تک نہ ہو جینا وبال
گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تِس پر یہ نا آمیدواری ہائے ہائے

جلال الدین اکبر



چودھری جلال الدین نام اکبر تخلص، ستمبر ۱۹۰۵ء میں علی وال نہراں والا ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چودھری فتح علی مرحوم شہ زوری میں شہرہ آفاق تھے۔ اور اپنی سیر چشمی و فیاضی کی بدولت سارے علاقہ میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اکبر صاحب نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل اپنے گاؤں میں کی۔ پھر میٹرک ایم۔ بی ہائی سکول گوجرہ سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں اکبر صاحب نے تقریباً ہر درجہ میں اپنی نمایاں کامیابی کی وجہ سے وظیفہ پایا اور اسی دوران میں انہیں تعلیمی زندگی سے اس قدر رغبت پیدا ہو گئی کہ گورنمنٹ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے معلمی کی سند لی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی ملازمت اختیار کر لی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ آجکل آپ انجمن کے اسلامیہ ہائی اسکول ملتان روڈ لاہور کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

اکبر صاحب کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے شغف رہا ہے۔ شعر گوئی کا آغاز ثانوی تعلیم کے زمانے سے ہوا۔ جب لاہور تشریف لائے تو ادبی حلقوں میں آپ کا کلام مقبول ہوا اور پھر ملک کے مقتدر جرائد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ کا تعارف منصور احمد صاحب مرحوم سے ہوا جو اس وقت ''ہمایوں'' کے مدیر تھے۔ رفتہ رفتہ یہ شناسائی گہرے روابط کی صورت اختیار کر گئی اور ان تعلقات کا یہ اثر ہوا کہ پھر آپ نے جو کچھ لکھا وہ پہلے منصور صاحب کو دکھا لیا اسکے بعد اشاعت کے لئے بھیجا۔ منصور صاحب کے علاوہ آپ اپنے استاد سید عابد علی صاحب عابد (پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور) کے بہت ممنون ہیں۔ چونکہ عابد صاحب نے نہ صرف آپ کے کلام کی بیشتر اصلاح کی بلکہ آپ کا مجموعہ کلام ''نقش ارژنگ'' بھی انہیں کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ البتہ یہاں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہوں نے خط و کتاب کے ذریعہ شعر و سخن کے بہت سے نکات اکبر صاحب کو بتائے اور ''نقش ارژنگ'' پر ''معاف'' میں نہایت معقول و حوصلہ افزا تبصرہ لکھ کر ان کی شاعری کی داد دی۔

''نقش ارژنگ'' کی اشاعت کے بعد اکبر صاحب کی مشق سخن جاری رہی - آن کی زندگی میں کوئی بھی ایسا واقعہ نہیں گزرا جو قابل ذکر ہو سوائے اس کے کہ وہ طالب علمی کی حدود سے گزر کر آستاد بن گئے - البتہ ۱۹۳۸ء میں آن کی ملاقات ایک ایسے مرد درویش سے ہوئی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی روحانیت کے اثر سے آن کے خصائل ' رجحانات ' معتقدات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا - یہ بزرگ حضرت حاجی حافظ حاکم علی رحمۃ تھے - آپ کا وصال ۱۹۴۰ء میں ہوا لیکن وصال سے پہلے آپ نے اکبر صاحب کے حسن سیرت اور عقیدتمندی کے پیش نظر آنہیں اپنا خرقۂ مبارک دیکر خلافت عطا فرمائی - بہر حال اس واقعہ کی اہمیت اکبر صاحب کی زندگی کے دوسرے تغیرات سے قطع نظر ہمارے لئے یوں زیادہ ہے کہ اس سے آن کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور اب آن کا کلام رنگینی و مستی کی فضاؤں سے نکل کر سرحد عرفان میں قدم رکھ چکا ہے -

حضرت اکبر کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ایک بات جو نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ آنہوں نے نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ خالصتاً غزل گو شاعر ہیں - چنانچہ آن کی منظومات میں بھی جو دلکشی و جاذبیت پائی جاتی ہے وہ در اصل آن کے تغزل کی وجہ سے ہے - آن کے تغزل میں ایک سادگی ' ایک دھیماپن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے - اکبر صاحب کے جذبات عام طور پر بلند ہیں لیکن ساتھ ہی وہ چونکہ بڑے سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اس لئے آن میں بڑی کشش ہے - غزل میں یوں بھی ''کیا کہا ہے'' کے مقابلہ میں ''کیونکر کہا ہے'' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ ایسا جادو ہے جو پیش پا آفتادہ خیالات میں بھی ایک نئی روح پھونک دیتا ہے - اکبر صاحب اس ''کیوں کر کہا ہے'' کے گر سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ آن کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین آسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت و روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں - وہ فارسی کی تراکیب بالعموم کم استعمال کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں استعمال کرتے ہیں آن میں تنوع اور رنگینی سے کام لے کر کلام کو پر زور بنا دیتے ہیں -

یوں تو آپ کا سارا کلام ہموار و شیریں ہے لیکن آپ کی چھوٹی بحروں کی غزلیں خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں - مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''نقش ارژنگ'' کی انہیں غزلیات سے متاثر ہو کر اکبر صاحب کو پنجاب کا ''حسرت موہانی'' کہا تھا - اور اس میں شک نہیں اس رنگ میں شاعر موصوف نے بعد میں اور بھی ترقی دکھائی ہے - تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حسرت مرحوم کے تغزل کے لئے نہایت رچی ہوئی شعریت اور بلا کی فنی مشاطگی کی ضرورت ہے - ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حسرت کی زندگی اور آن کی غزل سرائی میں ایک لطیف ہم آہنگی بھی تھی جو بلاشبہ ہر شاعر کے یہاں پیدا نہیں ہو سکتی - بہر حال حسرت تو بہت کچھ تھے لیکن یہ کیا کم ہے کہ جناب اکبر نے اپنے مذاق و سلیقہ کے مطابق آن کے رنگ سخن کو اپنایا اور ایسا اپنایا کہ کہیں کہیں آن کی آواز پر ''رئیس المتغزلین'' کی آواز کا دھوکا ہونے لگتا ہے -

جہاں تک زبان کا تعلق ہے یقیناً حضرت اکبر قابل مبارک باد ہیں اُن کی زبان ایسی صاف ' سادہ اور شستہ ہے کہ پڑھنے والا اُن کی اور دلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی خاص امتیاز نہیں پیدا کر سکتا ۔ پھر وہ جذبات کے بیان میں ایسے برمحل و پرتاثیر الفاظ سے کام لیتے ہیں کہ کلام میں درد و لطافت کی ایک عام کسک محسوس ہوتی ہے ۔

آخر میں اُن کے عارفانہ رنگ کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے چونکہ یہی وہ رنگ ہے جسے اُن کے پچھلے پندرہ سولہ سال کے ذہنی تغیرات کی نمائندگی حاصل ہے ۔ اُن کے اس رنگ میں ابھی وہ کیفیت تو نہیں پیدا ہوئی جسے ہم ''من تو شدم تو من شدی'' کے مصداق کہہ سکیں مگر تغزل کی رنگینی پر ایک طہارت و پاکیزگی ضرور غالب آ چلی ہے ۔ اور اُن کے لب و لہجہ میں اعتماد کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ یقین ہے کہ اس رنگ کی کامیابی اُن کے کلام میں سپردگی کی وہ لازوال خصوصیت پیدا کر دے گی جسکے بغیر غزل کا شعر ایک اچھا شعر تو بن سکتا ہے نشتر نہیں بن سکتا ۔

انتخاب کلام

تغزل

ہو گیا حسن شرمسار جفا — عشق نادم ہوا جفا کر کے
آئے تسکین اضطراب کو وہ — اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

مرے دیر آشنا کو مجھ سے اُلفت ہوتی جاتی ہے
تمنا دل کی پامال مسرت ہوتی جاتی ہے
وہ ظلم ناروا کے ذکر پر شرمائے جاتے ہیں
شکائت بھی مجھے وجہ ندامت ہوتی جاتی ہے

ہر دل ہے جوش بادۂ اُلفت سے میکدہ — تیری نگاہ انجمن آرائے کیف ہے

بھولتا ہی نہیں ہے وہ مجھ کو — بھول کر بھی کیا نہ جس نے یاد

جدا ہیں مجھ سے وہ لیکن نہیں پھر بھی جدا مجھ سے
مرا دل اُن میں رہتا ہے وہ میرے دل میں رہتے ہیں

تصور کی خیال آرائیاں دل سے نہیں جاتیں
نکل کر تیری محفل سے تری محفل میں رہتے ہیں

قیامت ہے اُنھیں مجھ سے گلہ ہے کم نگاہی کا
غضب ہے مرے ارماں اُنکے ارماں ہوتے جاتے ہیں

ہم سے قائم جنون اُلفت ہے | یعنی سرگشتۂ وفا ہیں ہم
ایک عالم کے دل میں بستے ہیں | یعنی اک دلنشیں ادا ہیں ہم
عشق سے ہے فروغ رنگ جہاں | ابتدا ہم ہیں انتہا ہیں ہم

حسن اگر آشکار ہو جائے | فتنۂ روزگار ہو جائے
دل کو اس طرح دیکھنے والے | دل اگر بے قرار ہو جائے
شوخئی یار کا تقاضا ہے | شوق بے اختیار ہو جائے
کوئی شکوہ رہے نہ ''اکبر'' کو | تو اگر ایک بار ہو جائے

اُن کے جلووں نے پھول برسائے | ناز کی گل فروشیاں نہ گئیں
ظلم بھی اُن کے لطف ٹھیرائے | دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

ہو گئے ایک مہرباں سے جدا | مٹ گیا لطف زندگانی کا

تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ کیا حسن کلام | تیرے انکار میں اقرار نظر آتا ہے

حیرت فروز ہو گئیں تیری تجلیاں | دیدار برق حسن کی جرائت نہ ہو سکی
تمکین ناروا میں وہ پرسش نہ کر سکے | خود داریوں میں ہم سے شکایت نہ ہو سکی

اب وہ نگاہ یار کی دلداریاں کہاں | اب ظلم آشکار میں لطف نہاں کہاں

اب رنگ التفات کہاں چشم شوخ میں اب شوق کامگار کی گستاخیاں کہاں
اب میں ہوں اور کاہشِ ناکامئ وفا اب وہ فریب شوق کی سرمستیاں کہاں

آپ کی بندہ نوازی تو مسلّم لیکن
مجھے معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے
اس میں کچھ میری نظر کا بھی کرشمہ ہے ضرور
یہ جو اک حسن نمایاں تری تصویر میں ہے

نرالا ہے طریق رازداری اُن کا دنیا سے
جسے کچھ ہوش آ جائے وہی دیوانہ ہو جائے

میں تاثیر وفا کو رو رہا ہوں ترے تمکین بے حد کا گِلا کیا
پلٹنا ہی پڑے گا سوئے کعبہ نہیں ہوگا در میخانہ وا کیا

اللہ اللہ تیرا جلوہ ناز خود بخود جھک گئی جبین نیاز
اضطراب وفا کا حال نہ پوچھ دل دھڑکنے کی سُن ذرا آواز

شکایت سے کہیں شکر ستم کو دل نشیں پایا
کہ ہم نے اُس وفا نا آشنا کو شرمگیں پایا

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے
اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے
''اکبر'' وہ مہربان ہے جان جہان تو پھر اہل جہاں کو ہو جو عداوت ہے آپ سے

بیگانگی میں بھی تھا کبھی رنگ التفات لیکن اب التفات میں بیگانگی سی ہے

اُنہیں غرور مجھے ناز بے نیازی تھا ملے، مگر کبھی دل سے ملے نہ آپس میں

یاد گناہ و اشک ندامت میں لطف ہے ورنہ نہیں ہے خاک بھی لذت گناہ میں
یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات گزری تمام عمر اسی اشتباہ میں
زندہ دلی کے ساتھ مٹا زندگی کا لطف لذت ثواب میں نہ مزا ہے گناہ میں
''اکبر'' کو ایسے منزل مقصود مل چکی
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے کمبخت راہ میں

نہ سہی دیر و حرم کوچۂ جاناں ہی سہی
ایک سجدے سے غرض ہے وہ کہیں ہو جائے

خلوص عشق کو شکوے بہت ہیں تمہارے التفات بد گماں سے
تمہاری ہمدمی کا ایک لمحہ کہیں بہتر ہے عمر جاوداں سے

ایک آنسو میں کہہ دیا غم دل کس قدر ہم نے اختصار کیا

عشوہ و ناز کا قصور نہیں مجھ کو ذوق نگاہ نے مارا
تنگ دستی نے پارسا رکھا آرزوئے گناہ نے مارا

تھا مژدۂ وصال کہ شرما کے رہ گئے کچھ آج زیر لب جو وہ فرما کے رہ گئے
پاس ادب نے دی نہ کبھی فرصت کلام شکوے مری زبان پر آ آ کے رہ گئے

یہ کائنات یہ بزم ظہور کچھ بھی نہیں
تری نظر میں نہیں ہے جو نور کچھ بھی نہیں
نگہ اگر ہو تو ہر ذرہ میں ہزاروں طور
نگہ اگر نہ ہو بالائے طور کچھ بھی نہیں
یہ قرب و بُعد بمقدار شوق سالک ہیں
جسے تو دور سمجھتا ہے دور کچھ بھی نہیں

دنیا کا غم نہ خواهش عقبیٰ کرے کوئی میری طرح جو تیری تمنا کرے کوئی
ہر آن ایک تازہ تجلی ہے روبرو میری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

آن کو تو اپنی جلوہ نمائی سے کام ہے — دیکھا کرے کوئی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
سرمایۂ نشاط دو عالم ہے درد عشق — اچھا کرے کوئی جو نہ اچھا کرے کوئی

اور ٹھہرا ہے کہیں اور نہ کہیں دل ٹھہرے
وہ مری زندگیٔ شوق کا حاصل ٹھہرے
گو ہر اک گام پہ آفات سفر تھیں در پیش
ہم جو منزل کو چلے بر سر منزل ٹھہرے

کہاں نہیں ہے اگر دل میں ہے مقام اس کا
کہیں نہیں ہے اگر وہ یہاں نہیں ملتا

یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد
تو یاد ہے اور کوئی نہیں تیرے سوا یاد
اس حسن تعلق کا ادا شکر ہو کیوں کر
میں نے جو کیا یاد تو اس نے بھی کیا یاد
اس مرد خدا مست کی کیا بات ہے ''اکبر''
جس کو نہ رہا کچھ بھی بجز یاد خدا یاد

ترا وصل ہے مجھے بے خودی' ترا ھجر ہے مجھے آگہی
ترا وصل مجھ کو فراق ہے' ترا ھجر مجھ کو وصال ہے
میں ہوں در پر اس کے پڑا ہوا "مجھے اور چاہئے کیا بھلا
مجھے بے پری کا ہو کیا گلا' مری بے پری پر و بال ہے
وہی میں ہوں اور وہی زندگی' وہی صبح و شام کی سرخوشی
وہی میرا حسن خیال ہے' وہی ان کی شان جمال ہے

''اکبر'' بتوں کے لطف سے محروم ہوں اگر — کچھ غم نہیں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

دل مردہ پہ ہیں مسدود سب راہیں محبت کی
جو دل زندہ ہو ہر دم دوست کا پیغام آتا ہے

کوئی کیا جانے دل کا اور اُن کا رابطہ کیا ھے
کہ دل ھی دل میں ھم اُن کو ھمیشہ یاد کرتے ھیں
اب اس سے بڑھ کر اوج طالع عشاق کیا ھوگا
کہ جب ھم یاد کرتے ھیں تو وہ بھی یاد کرتے ھیں

منظومات

نغمۂ ناھید

(کسی وفا نا آشنا کے حضور میں)

میری خاموش التجاؤں کی سماعت ھو نہ ھو
تیرے انداز تغافل کی نہایت ھو نہ ھو
میرے حال زار پر چشم عنایت ھو نہ ھو
اے وفا نا آشنا تجھ کو محبت ھو نہ ھو

عشق میرا سربسر رنگینئی اُمید ھے
آنکھ محو جستجو ھے دل میں ذوق دید ھے

عشق تیرا ھے بہشت جاوداں میرے لئے
یاد تیری ھے نشاط کامراں میرے لئے
رنج تیرا ھے سرور بے کراں میرے لئے
تیرے جلوے حاصل کون و مکاں میرے لئے

باوجود نامرادی عشرت جاوید ھے
میرے ارمانوں کی دنیا میں ھمیشہ عید ھے

مجھ کو تجھ سے خواھش لطف و کرم کوئی نہیں
یہ ترا جور و ستم جور و ستم کوئی نہیں
شوق میں تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں
مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جام غم واللہ مجھ کو ساغر خورشید ھے
نالۂ حسرت سرود و نغمۂ ناھید ھے

وعدہ آنے کا وفا کیجئے

اے ۰۰۰۰ اے پیکر شائستۂ مہر و وفا
تیرا ہر انداز مجھ کو باعث صد ناز ہے
تیرے الطاف فراواں کا یہ سارا فیض ہے
آج بھی حاصل جو مجھ کو لذت آغاز ہے
تیرا ہر شیوہ ترے اکرام پیہم کی دلیل
میرا ہر انداز تیرے شوق کا غماز ہے
تیری الفت ہے سرور زندگانی کی کفیل
میں جو زندہ ہوں اسی الفت کا یہ اعجاز ہے
آج بھی تیری تمنا میں وہی ہیں گرمیاں
آج بھی دل کی جگہ طوفان سوز و ساز ہے
اب نہیں جان حزیں کو تاب رنج انتظار
وعدہ آنیکا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
بڑھ گئیں حد سے جنون شوق کی بے تابیاں
روح اب قید بدن سے مائل پرواز ہے
اک ھجوم شوق ہے دل میں مگر خاموش ہوں
آ، کہ تیرے واسطے میں سر بسر آغوش ہوں

تحریک عمل

دیکھے اگر تو یاس ہے انکار ذات حق
امید وار رحمت پروردگار رہ
آئیں گی مجھ کو راس نہ سرمستیاں کبھی
رہنا ہے اس جہاں میں اگر ھوشیار رہ
اب دشت گردیوں کے زمانے گزر گئے
ہنگامہ زائے محفل زیبائے یار رہ
شایان عاشقی نہیں مایوسی و فراق
ہر دم رہین کشمکش انتظار رہ
جاتی رہیں گی حسن کی بے اعتنائیاں
تو اپنے عہد شوق پہ خود استوار رہ
اچھی نہیں ہیں دوست یہ عزلت گزینیاں
تو حق و راستی ہے سدا آشکار رہ
یہ تیرہ خاکداں ترے دم سے جھلک اٹھے
رخشاں عمل کے چرخ پہ خورشید وار رہ
اھل نظر کو زندگئی پر سکوں ہے موت
بحر جہاں میں برق صفت بیقرار رہ
پیدا ہر اک بہار میں اپنی بہار کر
اور بے نیاز عہد خزان و بہار رہ

کس نے کہا تجسس و تدبیر چھوڑ دے
سنگ عمل سے شیشۂ تقدیر توڑ دے

رباعیات و قطعات

از بسکه بلند ہے طبیعت میری
ہمدوش ثریا ہے یہ رفعت میری
ہوں بندۂ سرور دو عالم ''اکبر''
مسجود ملائک ہے محبت میری

جتنا که میں سرشار ہوا جاتا ہوں
اتنا ہی خبردار ہوا جاتا ہوں
کیا شے ہے شراب معرفت بھی ''اکبر''
پی پی کے میں ہشیار ہوا جاتا ہوں

وہ لطف بھی گیا وہ مدارات بھی گئی
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی
تدبیر تھی که اور فزوں لطف یار ہو
تقدیر کا برا ہو کہ وہ بات بھی گئی

پیکار عمل کو آبرو کہتا ہوں
دنیا کو مقام ہاؤ ہو کہتا ہوں
''اکبر'' ہے سکون، موت میرے نزدیک
ہستی کو مذاق جستجو کہتا ہوں

مشتاق جمال ہیں نگاہیں میری
اشراق جمال ہیں نگاہیں میری
طاری ہے جہان پر میرا حسن نظر
خلّاق جمال ہیں نگاہیں میری

اگر بے تابیاں دل کی یہی ہیں
تو اب جا کر ملا اس جان جاں سے
ہوائے شوق اڑائے جا رہی ہے
بڑھا جاتا ہوں آگے کارواں کے

الہی کیسی مصیبت ہے ہجر جاناں میں
که ہر خوشی مجھے وجہ ملال ہو جائے
کسی طرح تو دل مضطرب کو چین آئے
نہیں جو وصل ہے ممکن وصال ہو جائے

زیب عثمانیہ

تاجور نام ، زیب تخلص ، عثمانیہ نسبت خاندانی سے مشہور ہیں - ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں - بچپن ہی میں آپ کے عم محترم خان غلام محمد خاں صاحب یکتا نے جو لاولد تھے ، آپ کو متبنیٰ کر لیا چنانچہ زیب صاحبہ کی تعلیم و تربیت انہیں کی آغوش عاطفت میں ہوئی - اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق آپ کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام گھر پر کیا گیا اور محترمہ نے اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت جلد ہی اردو فارسی علم و ادب پر عبور حاصل کر لیا - تقریباً بیس سال کی عمر میں آپ کی شادی اپنے پھوپھی زاد بھائی سلطان بہاؤالدین صاحب سے ہوئی اور اس طرح موصوفہ کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا -

محترمہ زیب کے عم محترم حضرت یکتا ایک کہنہ مشق شاعر تھے - چنانچہ آپ کو اوائل عمر ہی سے ان کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا اور یہی چیز آپ کے لئے ترغیب شاعری کا باعث ہوئی اس پر مستزاد یہ کہ خود بھی قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشغلۂ شعر و سخن دلچسپی کے ساتھ آسان بھی نظر آنے لگا - ابتدا ہی سے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنا شروع کی اور چند سال کی مشق نے خیالات میں بلندی اور کلام میں پختگی پیدا کر دی - دسمبر ۱۹۳۷ء میں آپ پہلی مرتبہ ادبی دنیا کے سامنے ایک بلند پایہ شاعرہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں - جب کہ آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ لاہور میں آپ کو ایک نظم ''مقصد حیات'' پر انجمن اردو پنجاب کی طرف سے طلائی تمغہ عطا کیا گیا - علم و ادب کی بیرونی فضا میں اس پہلی کامرانی کے بعد رفتہ رفتہ آپ کا کلام ملک کے اکثر مؤقر جرائد و اخبارات میں چھپنے لگا اور ادبی حلقوں میں نہ صرف مقبول ہوا بلکہ نہایت وقیع نظروں سے دیکھا گیا - یہ حوصلہ افزائی بالآخر آپ کے مجموعہ کلام ''متاع حرم'' کی تدوین کا باعث ہوئی جو ۱۹۴۱ء میں لاہور سے شائع ہوا - تقسیم ہند کے بعد محترمہ پاکستان آ گئی ہیں اور فکر سخن جاری ہے یہاں کے رسائل بالخصوص عصمت میں آپ کا کلام دیکھنے میں آتا ہے -

موجودہ دور شاعری در حقیقت حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کا دور ہے اور اس دور کے ادباء ، شعرا اور مفکرین ارادی یا غیر ارادی طور پر اقبال کے کلام و پیام سے متاثر ضرور ہیں - تاہم وہ شعرائے کرام جنہوں نے صحیح معنوں میں علامہ موصوف کا اتباع کیا ہے ان میں حضرت اسد ملتانی اور جناب امین حزیں خاص طور قابل ذکر ہیں - ان دونوں بزرگوں کے بعد متبعین اقبال میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ہماری

شاعرہ زیب صاحبہ کا ہے ۔ آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد قاری اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آپ نے نہ صرف موضوعات اقبال پر طبع آزمائی کی ہے بلکہ اقبال کے فلسفہ ' پیغام اور روح کو حسب بضاعت بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کامیابی اُس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک اس عظیم شاعر کے کلام کا غائر مطالعہ نہ کیا جائے اور اُن بنیادی مسائل کو نہ سمجھا جائے جو اُس کی فکر کا محور ہیں ۔ زیب صاحبہ اس کڑی منزل سے تو گزری ہی ہیں ساتھ ہی چونکہ اُنہیں ملکی ' ملی اور سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی رہی ہے اور آپ کا بیشتر وقت ایسے ہی اُمور سے متعلق غور و فکر میں گزرا ہے اس لئے اُن پر علامہ مرحوم کا اثر بہت ہی گہرا پڑا ہے ۔

تاثرات اقبال کو اپنے اندر جذب کر لینے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ محترمہ کا فکر و اُسلوب دونوں اقبال کے رنگ میں رنگے گئے ہیں ۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے آپ کے یہاں بھی عمل کی تلقین ' خودی کا درس اور اقوام مشرق بالخصوص اسلام کی بیداری کا پیام ملتا ہے ۔ ساتھ ہی مغربی قوموں کی سیاست و سفاکی کے پول قدم قدم پر کھولے گئے ہیں ۔ لیکن یہ حقائق ایک ایسے سادہ ' دلنشین اور پرجوش اُسلوب میں پیش کئے گئے ہیں کہ کلام میں ثقالت یا گرانی کے بجائے جذب و دلکشی پیدا ہو گئی ہے ۔ بلکہ بعض جگہ تو اُن کی آواز پر سچ مچ اُس ''دانائے راز'' کی آواز کا شبہ ہونے لگتا ہے مثال کے طور پر زیب صاحبہ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ۔

قوموں کی تقدیر وہ مرد جنگاہ ایمان جس کا الحکم لِلّٰہ
دنیا ہے خود اک جنگ عناصر باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ
ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملت شمشیر جسکی الملک لِلّٰہ

جن کے ایک ایک لفظ سے اقبال جیسے حریت پسند شاعر کی للکار ٹپکتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس حقیقی اتباع کے باوجود زیب صاحبہ کے کلام میں وہ ہمہ گیری ' وہ تبحر و ژرف نگاہی اور عمق و گہرائی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو علامہ مرحوم کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں ایک مقلد سے یہ توقع بھی نہ رکھنی چاہئے ۔ تاہم اُنہوں نے جو کچھ کہا ہے ۔ اس میں خلوص و صداقت کی ایسی کارفرمائی ہے کہ یہ اتباع بھی قابل قدر بن گیا ہے ۔ اور محترمہ زیب عثمانیہ اس اس لحاظ سے لائق مبارک باد ہیں کہ اُنہوں نے ایک پردہ نشین خاتون ہوتے ہوئے وہ کچھ کر دکھایا جو اچھے اچھوں کے بس کا روگ نہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

بے شک ہمیں صیاد نہ دے اِذن فغاں اور
بڑھ جائے مگر اس سے نہ احساس زیاں اور

پہنچا ہے گزند اس سے مریدوں کے یقیں کو
تھا مرشد مغرب کا جو دل اور زباں اور

اہل نظر اس بزم میں لاکھوں سہی لیکن
فیض نظر کمیاب ہے معلوم نہیں کیوں

خضر کا نام لے کر ہم سفر نے
حقیقت ہی بتا دی رہنما کی
بتاتے ہیں جسے قشقہ و محراب
بہت معروف شکلیں ہیں ریا کی
وہ جسکو ''زیب'' کہتا ہے زمانہ
بری حالت ہے اُس درد آشنا کی

خاک پر ہی مرے آنسو ہیں نہ دامن میں کہیں
جو تری راہ میں کھویا گیا پایا نہ گیا
سبب خندۂ گل، گل کو نہیں خود معلوم
اس طرح کوئی بھی دیوانہ بنایا نہ گیا
مختلف نغمہ سے ہے قلب مغنّی کا راز
جو لب ساز پہ بھی بزم میں لایا نہ گیا
رکھ دیا خلق نے نام اس کا قیامت اے ''زیب''
کوئی فتنہ جو زمانے سے اُٹھایا نہ گیا

آہ اُس آنکھ کی گراں خوابی!
جو یہ سمجھی ہے خواب ہے دنیا
دل کو یک قطرۂ خوں کہتی ہے
کس قدر تنگ نظر ہے دنیا
کوئی منزل ہے نہ منزل کا نشاں
رات دن پا بہ سفر ہے دنیا

ہیں خندۂ زن تری حالت پہ شمع و آئینہ
کسی کی بزم میں اپنا مقام پیدا کر
کسی کی بزم میں مڑ مڑ کے نقش پا کو نہ دیکھ
مہ و ستارہ کی شان خرام پیدا کر

کسی کے چار تنکے ہوں چمن میں
فلک کی آنکھ میں وہ آشیاں ہے

ادھر دل ہے مرا اور شوق منزل آدھر میں ہوں غبار کارواں ہے
جسے محفل میں کوئی بھی نہ سمجھا وہی فقرہ فریب داستاں ہے

خود کو دنیا میں جو راضی بہ رضا کہتے ہیں
اپنی ہستی سے وہ اک بات سوا کہتے ہیں
موت آتی ہے تو اک فرض ادا ہوتا ہے
اُن کو دھوکا ہے قضا کو جو قضا کہتے ہیں
درد دل گو تیری اک گونہ مراعات سے ہے
نکتہ چیں اس کو بھی انداز جفا کہتے ہیں
حرم و دیر ہوئے ترک عدل سے رسوا
دیکھئے اہل عقیدت اسے کیا کہتے ہیں
صورتیں ہیں یہ دو احساس دروں کی اے "زیب"
حشر میں جن کو سزا اور جزا کہتے ہیں

تجھ سے بڑھ کر ہے کہیں اُن کا مقام اے ساقی
مست رہتے ہیں جو بے بادۂ و جام اے ساقی
قطرے قطرے کو پھریں تیرے سبوکش لاچار
ہے یہ کس کے لئے غیرت کا مقام اے ساقی ؟
مکرمت سے تری ہو جائیں نہ میکش بد دل
سنگدل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی
"زیب" بھی عرض حقیقت میں ہے اکثر محتاط
اہل محفل میں یہ احساس ہے عام اے ساقی

آزادئی افکار سے بھی جو ہوئی محروم
سچ یہ ہے کہ اُس قوم کے جینے کا بھرم کیا
بیداد زمانے کو مٹانے جو اُٹھے ہیں
خود بھی وہ اُٹھائینگے زمانے کے ستم کیا

اٹھا ہے محفل ہستی سے اعتماد وفا
کہو کسی سے کہ رسم جفا پہ ناز کرے
ہے عیب فرد کو وہ انہماک ذوق مجاز
جو زندگی کے حقائق سے بے نیاز کرے
مآل دانش مغرب میں ''زیب'' ہے یہ سبق
کوئی زمانہ نہ اہل خرد پہ ناز کرے

کہتے ہیں جب حقیقت راز نہانِ دل
دیتے ہیں اک فریب نیا رازداں کو ہم
گھبرا کے سرد مہری دنیا سے رات دن
رویا کئے ہیں ''زیب'' کسی مہرباں کو ہم

آ گیا خود سے گذرنے کا سلیقہ جس کو
وہ نظر کا تری شرمندۂ احساں نہ ہوا
تجھ کو بھی دیتا زمانہ. مہ نو سے تشبیہ
تو بھی کیوں رنج کش گردش دوراں نہ ہوا
گھڑ لئے عقل نے دو چار عناصر ہی کے نام
اُس سے جب تجزیۂ عالم امکاں نہ ہوا

اہل دنیا حشر کا ہنگام کہتے ہیں جسے
اک زمانہ ہے دلوں سے درد اُٹھ جاتا ہے جب
عقل کو حاصل نہیں دونوں جہاں کا اعتماد
اس کے آگے طے نہ کر اے ''زیب'' زانوئے ادب

ناداں نہیں کچھ وادئ ایمن ہی سے مخصوص
دنیا میں ہر اک ارض محبت ہے شرر ریز
اُس قوم کا آفاق پہ چھا جانا ہے ممکن
سیلاب صفت جسکا ہے ہر پیکر نوخیز
چاہا تھا کہ پوشیدہ ہی رہ جائے غم دل
ہے ''زیب'' مگر اہل زمانہ کی نظر تیز

یہ تیری چشم لطف سے پہلے کی بات ہے
اے جان گلستاں ہمیں اب گلستاں سے کیا
علم زباں سے'' ہو کوئی نسبت نہ جسکو ''زیب''
دعوائے ہمسری اُسے اہل زباں سے کیا

اہل وفا کی قدر کر حاصل داستاں ہیں یہ
حسن بھی ایک داستاں عشق بھی ایک داستاں

کسی کا حسن بے پردہ بھی سو پردوں میں پنہاں تھا
بہت برخود غلط اس بزم سے اھل نظر نکلے
فلک کی طرفہ کاری ھے کہ آج اے "زیب" دنیا میں
جو تھے صیاد وہ خود طائر بے بال و پر نکلے

منظومات

نیستاں نالہ

(اقبال کے رنگ میں)

تو صاحب تدبیر نہ میں صاحب تدبیر
تدبیر پہ موقوف ھے ھر قوم کی تقدیر
مغرب کی نظر کیف امارت سے پُر از خواب
مشرق کی نگاھوں میں عیاں قوت تعبیر
سازش میں جہاں شام و سحر نفس و خرد ھو
انسانیت اُس ملک میں ھے بیکس و دلگیر
بولا کہ خودی اور خدائی میں تفاوت !
یزداں سے جو پوچھی گئی اوھام کی تفسیر
قومیں جو ھمیشہ نشۂ حال میں تھیں مست
لے آیا اُنھیں راہ پہ دور فلک پیر
اے "زیب" پلٹ آئی ھیں اس راہ سے قومیں
ناکام رھی غرب کی یہ کوشش تزویر

اقوام کی جاگیریں بے دردی و سفاکی
ھمدردی و دل داری انسان کی جاگیریں
اقوام نے دیکھا ھے جو خواب حصول زر
بربادی و ناکامی اس خواب کی تعبیریں
اسؔ دین کے معنی ھیں اب خار و خذف سے کم
مہر و مہ و انجم تھیں جس دین کی تفسیریں
شمشیر کو دنیا میں ھے نصرت حق سے کام
مغلوب جو حق ھے پھر بیکار ھیں شمشیریں

توحید پرستوں کی اک ضرب یداللّٰہی
اوہام پرستوں کی صد آہنی تدبیریں
احساس غم انساں اے ''زیب'' ہے دیں جس کا
نازاں نہ ہوں کیوں آں پر خود قوم کی تقدیریں

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری
مری کوتاہ افکاری سے بے وقعت مرے نغمے
تیری کوتاہ کاری سے تری منزل میں دشواری
ابھی تہذیب وہ محروم ہے ایماں کی دولت سے
کسی تہذیب میں گر فقر کے معنی ہیں ناداری
زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں
بچائے گی تجھے کیا کفر کی آئینہ دیواری
مجھے اے ''زیب'' پہروں خون کے آنسو رلاتی ہے
مری ملت کی کم کوشی مری ملت کی ناداری

وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام
جس کے قواء ہیں محروم آرام
تو سادہ رہرو، میں سادہ رہرو
فتنوں سے پر ہے منزل کا ہرگام
اپنی خودی کو پوج اے برہمن
کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام
اس کو زمانہ رکھتا ہے قائم
جس قوم کو ہے احساس انجام
ہے عہد عسرت عہد بغاوت
اور عیش و عشرت عسرت کا پیغام

مقصد حیات

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ
شاہد دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا سمجھ
امن کی آرزو نہ کر، امن کا مدعا ہے موت
ہر نفس حیات کو درد میں مبتلا سمجھ
شاہرہِ حیات میں رہبر و راہزن نہ بن
اپنے سفر کا مدعا ان سے کہیں سوا سمجھ

منزل ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ
جوہر درد ہے اگر گوہر اشک میں ترے
دامن کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ
تیرے صفائے قلب کا دھر میں امتحان ہے
خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ
"زیب" حریم قلب کی خاک میں جب جمود ہے
فتنہ کوئی آٹھا سمجھ، حشر کوئی بپا سمجھ

فلسفہ ایمان

ایماں محکم قوموں کا معیار
ایماں ناقص ملکوں کا ادبار
ایماں نبوت کا ہے درس اول
ایماں خدا کے آئیں کا شہکار
ایماں سے محکم حمزہ کے بازو
ایماں سے فاتح حیدر کی تلوار
ایماں ہمارا ساز تمدن
ایماں ہمارا سامان پیکار
مومن کے تابع ساری خدائی
مومن خدا کا احکام بردار
ایماں محکم ہوتا ہے اس دم
جب ضرب غم سے ہو روح بیدار
ذکر خدا سے تازہ ہوں احساس
فکر خودی پر مائل ہوں افکار

بھکارن

رات کا ہنگام، جنگل کا سماں، عورت کی ذات
کس لئے برہم نہیں ہوتا نظام کائنات
جا رہی ہے بھیک دامن میں لئے حرماں نصیب
ہاتھ پکڑے ساتھ ہیں دو طفل معصوم و غریب

آہ ! اے ہندوستاں ! اے فاقہ مستوں کے وطن
چھوڑ مغرب کی پرستش بت پرستوں کے وطن
اپنے دست و پا کی قوت ہو نہ جب تک استوار
مرگ ذہنی ہے مراعات و رعایت پر مدار
بھوک کی تکلیف ہرگز سہ نہیں سکتے عوام
بن رہی ہے اُن پہ جو کچھ کہہ نہیں سکتے عوام
گر غریبوں کی نہ رمز خامشی سمجھی گئی
مسکنت ان کی دلیل بے حسی سمجھی گئی
کوئی دم میں ٹوٹ پڑنے کو ہے فطرت کا عذاب
تیرے دروازے پہ دستک دے رہا ہے انقلاب !

جگن ناتھ آزاد



جگن ناتھ نام آزاد تخلص - دسمبر ۱۹۱۸ء میں میانوالی کی سنگلاخ سر زمین میں پیدا ہوئے لیکن پرورش راولپنڈی میں پائی جہاں آپکے والد لالہ تلوک چند محروم عرصہ تک بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ آپ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیمی مراحل سے گزر کر ۱۹۳۹ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی - اے کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد آزاد صاحب تحریک رفاقت اور دیگر اداروں میں مختلف خدمات سر انجام دیتے رہے - تین سال بعد سلسلۂ تعلیم دوبارہ جاری کیا اور دیال سنگھ کالج لاہور سے ایم-اے کیا - قیام پاکستان کے وقت مجبوراً ترک وطن کرکے پنجاب سے دہلی پہنچے اور رسالہ ''آجکل'' کے ادارۂ تحریر میں منسلک ہوگئے - چنانچہ آج تک اسی ادارے سے وابستہ ہیں اور اپنے فرائض بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے سر انجام دے رہے ہیں -

جگن ناتھ آزاد کو ذوق شعری اپنے والد محترم منشی تلوک چند محروم سے ورثے میں ملا مگر ساتھ ہی چونکہ محروم صاحب ایک پختہ کار استاد سخن ہونے کے علاوہ بڑے وسیع المشرب، صاحب نظر اور سنجیدہ کردار کے انسان ہیں اسلئے ان کے فیضان صحبت سے بیٹے میں نہ صرف شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا بلکہ وہ تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی جس کی عدم موجودگی میں ایک نوجوان کم از کم جوان صالح نہیں بن سکتا - اس فیضان پدری کے ماسوا آزاد نے اپنے کلام کی آبیاری کلام اقبال سے بھی کی ہے - اور اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ان نوجوان شعرا میں سب سے زیادہ قد آور شاعر ہیں جنھوں نے اقبال کی پیروی کرتے ہوئے اقبال کے رنگ سخن میں اپنی تخلیقات شعری کو ڈھالا اور اس پیر ہندی کے معنوی و روحانی شاگرد بننے پر فخر محسوس کیا -

جگن ناتھ آزاد نظم، غزل، قطعہ رباعی وغیرہ تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں - اور دور جدید کے حساس شاعروں کی طرح وہ بھی زندگی کے مسائل کو شاعری کے سانچے میں خوبصورتی سے ڈھالتے ہیں - زندگی کے ترجمان ہونے کی وجہ سے ان کا کلام ایک طرف تو تصنع اور سطحیت کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا ہے دوسری طرف اس میں وہ حقائق بھی رچ گئے ہیں جو نوع انسانی کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا کلام بڑی تیزی کے ساتھ فکر و فن کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اب ورثے میں ملی ہوئی شاعری خود آزاد کے خون

جگر کی آبیاری کی بدولت برابر سنورتی اور نکھرتی جا رہی ہے اور ماضی کی بہترین فنی روایات نئے مگر خوبصورت سانچے میں ڈھل رہی ہیں -

تقسیم ہند سے قبل تک بقول حضرت آزاد شعر گوئی کے ساتھ اُن کا تعلق سرسری تھا اور ادب برائے زندگی کی تحریک سے بھی وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور اُس کے بعد کے پیدا ہونے والے واقعات' نے اُن کے قلب و نظر کو اس درجہ متاثر کیا کہ جذبات و خیالات کے بند چشمے اب گویا ہمیشہ کیلئے پھوٹ پڑے ہیں - قیام پاکستان تک اُن کی نظموں کے بیشتر موضوعات وہی تھے جو علامہ اقبال کے یہاں ملتے ہیں مگر اُس کے بعد ترک وطن کرنے پر اُن کی نظموں کے موضوعات میں سیاسی اور وطنی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے - ان نئے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے وقت اُن کے یہاں کہیں کہیں تبلیغی انداز ضرور پیدا ہو گیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی جس دلیری اور جرأت کے ساتھ اُنھوں نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے وہ بلا شبہ اُنھیں کا حصہ ہے - اُن کے ہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس بھی ہے اور اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش بھی - بلا شبہ انھیں دو باتوں کی بدولت اُن کی شاعری میں ایک تڑپ اور حوصلہ مندی پیدا ہوگئی ہے -

جگن ناتھ آزاد کی غزلیات سادہ اور سلیس ہوتی ہیں مگر اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اتنا اندازہ بھی ضرور ہوتا ہے کہ شاعر نے اس صنف میں غم جاناں سے کہیں زیادہ غم دوراں کو سمویا ہے اور چونکہ وہ فن کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بخوبی واقف ہے اس لئے زندگی کے تلخ حقائق بھی اُس کی غزلوں میں ایسی دلکشی و رعنائی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ روح تغزل کہیں مجروح نہیں ہونے پائی اور کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ درد' تپش' اُمنگ اور حوصلہ مندی کے امتزاج نے اُن کی غزلیات کو بہت خوشگوار بنا دیا ہے -

غرض جگن ناتھ آزاد کی شاعری ایک درد مند دل کی آواز ہے جو نظم و غزل دونوں میں گونجتی ہے - اُن کے کلام میں معنی اور حسن بیان' انقلابی چوٹیں اور شاعرانہ اشاریت اور فن اور مقصد کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے - انہی خصوصیات کلام کی وجہ سے اُردو کے نوجوان شعرا میں اُنھیں ایک خاص مقام حاصل ہے اور آج ہماری شاعری کی بہت سی اُمیدیں اُن کی ذات سے وابستہ ہیں - حضرت آزاد کے اب تک دو مجموعہ کلام " بیکراں " اور " ستاروں سے ذروں تک " زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبولیت کا شرف حاصل کر چکے ہیں -

انتخاب کلام

تغزل

نظر کی حد تک لگا دیا ہے سیاہ راتوں نے شامیانہ
اسی اندھیرے میں دیکھتا ہوں اُبھر رہا ہے نیا زمانہ

فضا میں چمکی نئی تجلی، زمیں پہ گونجے نئے ترانے
ہر ایک ذرہ پکار اٹھا وہ آ رہا ہے نیا زمانہ

زندگی ہے تمام سوز و گداز　　اے غم دوست ! تیری عمر دراز
اے نشیمن ! مجھے فریب نہ دے　　جا چکی اب تو حسرت پرواز

ہزاروں بار آیا ہے جنوں امداد کو لیکن
ہزاروں بار کھایا ہے فریب آگہی میں نے

تیرا کرم ہے باد بہاراں　　ہر شاخ زخمی ہر پھول بسمل

یہ جو دل کی کیفیت ہے نہیں راز اگر تو کیا ہے
کبھی گلستاں میں چپ ہوں کبھی دشت میں غزلخواں
مرے درد کی لطافت ہے تری نظر کا پر تو
مرے پردۂ سخن میں ترا نطق ہے غزلخواں

پیام دوست بن کر آ رہی ہے　　نوائے دلربائے آبشاراں

سُست گامی کا گِلہ کیا وادئی پر خار میں
جب چلیں گے ہم نئے رستے بناتے جائیں گے
اس جہاں اور اُس جہاں کی تلخیوں کے روبرو
رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے
اس جہاں کو بخش کر اے دوست ! جنت کا جمال
قہقہے جنت کی دنیا پر لگاتے جائیں گے

بہ فیض مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیر کارواں کہنا ہی پڑتا ہے
تجھے اے طائر شاخ نشیمن کیا خبر اسکی
کبھی صیّاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

مروت کی قسم تری خوشی کے واسطے اکثر
سراب دشت کو آب رواں کہنا ہی پڑتا ہے
نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دل خود دار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

واپس دلادو ہم کو اسیری آزادیوں کے پروردگارو !
بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل آزاد ! اٹھو ان کو سنوارو !

آسماں کے اوج سے افکار کو واپس بلا
یہ زمیں سب کچھ ہے ناداں آسماں کچھ بھی نہیں
عزم و ہمت کے کرشمے ہیں یہ اے اہل چمن
عزم ہو دل میں تو یہ دور خزاں کچھ بھی نہیں

پرانی غزل کے معائب نہ دیکھ پرانی غزل میں بھی اک بات ہے
غم دوست کے بعد دنیا کا غم منازل اسی طرح ہوتی ہیں طے

اب جو ممکن ہو تو افسانۂ مزدک بھی سنا
قصہ خواں چھوڑ بھی اس دور میں افسانۂ جم
اے قلمکار ذرا وقت کا فرمان بھی سُن
ٹوٹ تو جائے مگر مڑ نہ سکے نوک قلم

غنچۂ وگل کی جگہ پھوٹ رہے ہیں شعلے موسم گل ! تری ممنون ہے ہرشاخ چمن

یوں گلستاں میں آئی باد نسیم ہمصفیروں کا ساتھ چھوٹ گیا
میں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

تری یاد سے ہوئے محو ہم ترے ذہن سے ہم اتر گئے
یہ بھی منزلیں تھیں کہ طے ہوئیں، یہ بھی مرحلے تھے گزر گئے

تو کہاں ہے بادخزاں کہ پھر ہے چمن کو تیری ہی جستجو
وہ فضا میں رنگ بکھر گیا ، وہ زمیں پہ پھول نکھر گئے

دیار دوست کو اب کون جاسکے گا ندیم   دیار دوست کی اب رہگذر تلاش نہ کر

تجھے بھلا نہ سکوں تجھ کو یاد رکھ نہ سکوں
یہ راہ عشق میں آیا عجب مقام اے دوست !
غمیں نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے
برنگ صبح درخشاں ہر ایک شام اے دوست !

پھر حسن خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحان قلب و جگر کر رہا ہوں میں
دنیا میں مجھ کو جنس وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاش گہر کر رہا ہوں میں
اب دل کو نا پسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوق نظر کر رہا ہوں میں

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں روح کو یہ کس نے پکارا
ہر منزل دشوار کو آسان بنایا
کیا چیز ہے اے ذوق نظر تیرا سہارا
اے عقل ! خدا تیرے سفینے کا محافظ
یہ عشق کا دریا ہے نہیں جسکا کنارا

ترتیب نشیمن کیا ہوگی، آئین گلستاں کیا ہوگا
آغاز بہاراں کچھ تو بتا انجام بہاراں کیا ہوگا
تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

اے دل اُلجھ گیا ہے مذاق نظر کہاں
منزل کہاں یہ حسن سر رہ گزر کہاں
گم ہوچکی ہے کاہکشاں گرد راہ میں
اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں
مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں
راز جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں
خارا شگافیوں کے زمانے گزر گئے
اب ڈھونڈتا ہے شوق کہ ہیں شیشہ گر کہاں

یہ کاش تجھ کو بھی ذوق نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوق نظر پہ کیا گزری
حضور دوست کا عالم بتا نہیں سکتا
میں کیا کہوں مرے قلب و نظر پہ کیا گزری
نظر تو محو غم جستجو تھی اے آزاد
یہ اُس کے ساتھ دل بے خبر پہ کیا گزری

چاند تارے اب تو گرد راہ میں گم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دل دیوانہ ہم
زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی گئی
چھیڑ بیٹھے یا الٰہی کون سا افسانہ ہم

پھولوں سے، بہاروں سے ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوق نظر تیرا ٹھکانہ

اب کے تو رنگ و بو کا تماشا ہی اور ہے
یوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

فصل گل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی
آہ ! وہ شوق فسردہ کہ غزل خواں نہ ہوا

منزل سے بھی ناواقف ہیں راہ سے بھی آگاہ نہیں
اپنی دھن میں پھر بھی رواں ہیں یہ بھی عجب دیوانے ہیں

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا
پھر اُس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گزری
مرے چمن میں بھی آئی تو تھی بہار مگر
میں کیا بتاؤں کہ اہل چمن پہ کیا گزری
وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گزری

منظومات

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے
جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے
تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
ان بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے
آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے
آج بھی دل میں ہیں بے تاب تکلم نالے
اور سینے میں دل زار تپاں آج بھی ہے
جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ھیں محیط
حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ھے
عندلیب آج بھی گلزار میں ھے محو فغاں
درد ھر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ھے
یہ الگ بات ھے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آھوں کا دھواں آج بھی ھے
رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ھی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ھے
آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ھے وھی
دیدۂ عدل بہر سو نگراں آج بھی ھے
آج بھی شور فضا میں ھے وھی محنت کا
گوش سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ھے
بزم احباب سے آتی ھے صدا آلجھی ھوئی
شور ناقوس سے آواز اذاں آج بھی ھے
آج بھی مفت نظر ھے وھی سینوں کا عناد
بند اخلاص و محبت کی دکاں آج بھی ھے
آج بھی پائی نہیں دین سے دنیا نے نجات
نالہ کش محفل صاحب نظراں آج بھی ھے
اس نئے عصر میں انصاف کی اے جنس لطیف
صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ھے ؟
کون اس دور میں ماحول کا ھو شکوہ طراز
نطق پر دشنۂ احکام رواں آج بھی ھے

زندگی

(۱)

ھر طرف سے گھٹا گھر کے آتی رھی
چار جانب اندھیرے گراتی رھی
تیرگی ایک عالم پہ چھاتی رھی
لیکن ایسے میں بھی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی
ہر طرف اپنے نغمے لٹاتی رہی

(۲)

بربریّت کی رو تیز ہوتی رہی
یاس ہنستی رہی، آس روتی رہی
خوں سے انسانیت چہرہ دھوتی رہی
ایسے ماحول سے
اپنا دامن ہمیشہ بچاتی رہی
زندگی ہر طرف جگمگاتی رہی

(۳)

چرخ پر بادلوں میں خراماں رہی
باد صحرا کے جھونکوں میں رقصاں رہی
قمریوں کے گلو میں غزل خواں رہی
حادثے دیکھ کر
قہقہے حادثوں پر لگاتی رہی
زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

(۴)

گاہ طوفان بن کر اُبھرتی رہی
گاہ دریا کے دل میں اُترتی رہی
وقت کے ساز پر رقص کرتی رہی
شورشوں سے الگ
گنگناتی رہی، مسکراتی رہی
زندگی اپنا پرچم اُڑاتی رہی

(۵)

کہکشاں میں چمکتی دمکتی رہی
نرم رو ندیوں میں سرکتی رہی
پھول کی پتیوں میں لہکتی رہی
گویا تھی ہی نہیں

تلخئی دھر کو یوں بھلاتی رھی
شورشوں کو نظر سے گراتی رھی

(۶)

زندگی بے نیاز زماں و مکاں
زندگی بے نیاز غم این و آں
زندگی بے نیاز بہار و خزاں
تند ماحول میں
گنگناتی رھی، مسکراتی رھی
اور ظلمات میں جگمگاتی رھی

سخنے بہ پاکستان

(طویل نظم 'وطن میں اجنبی' کا ایک حصہ)

اے مری ارض وطن! اے ارض پاکستاں سلام
بھیجتا ھے آج تجھ پر تیرا اک مہماں سلام
میں تری دنیا میں آیا اک مسافر کی طرح
جذبۂ اخلاص لایا اک مسافر کی طرح
تیرے گلزاروں میں آیا صورت باد سحر
لوٹنے والا ھوں اب تیرے گلستاں چھوڑ کر
منتظر ھیں میرے گھر والے جہاں جاتا ھوں میں
اے وطن! اب جانب ھندوستاں جاتا ھوں میں
اے وطن! میرے وطن! میرے بزرگوں کے وطن
میری دنیا کے عرب میری مرادوں کے چمن
تجھ سے رہ کر دور، میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں
نقش الفت اپنے سینے سے مٹا سکتا نہیں
تیرے لاکھوں رنگ پوشیدہ مرے سینے میں ھیں
تیری لا تعداد تصویریں اس آئینے میں ھیں
لیکن ان سب سے ھے بڑھ کر درد کا تحفہ ترا
ھے فنائے نام سے نا آشنا تحفہ ترا

درد کی سوغات بخشی ہے جو تیرے پیار نے
روح انعامات بخشی ہے جو تیرے پیار نے
" یہ ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا "

رباعی

اے منظر بیقرار دم بھر تو ٹھہر
اے جلوۂ زرنگار دم بھر تو ٹھہر
جی بھرکے میں اک بار تجھے دیکھ تو لوں
اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

حیا لکھنوی

کنیز فاطمہ متخلص بہ حیا عصر حاضر کی خوش فکر و قادر الکلام شاعرہ ہیں۔ آپ کا آبائی وطن قصبہ سترکھ ضلع بارہ بنکی ہے لیکن چونکہ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا ہے اس لئے ادبی دنیا میں آپ کو لکھنوی تصور کیا جاتا ہے۔ حیا صاحبہ اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت خاتون ہیں کہ انہوں نے ایک نہایت معزز، مقتدر اور با ذوق خاندان میں آنکھ کھولی۔ چنانچہ یہ اُن کی خاندانی روایات اور روشن خیال گھرانے کی تربیت کا اثر ہے کہ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ ادبی و تہذیبی مشاغل میں گزرا ہے۔ آپ کے والد چودھری نعمت اللہ صاحب لکھنؤ کے نہایت کامیاب بیرسٹروں میں سے ہیں۔ حیا صاحبہ کی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی لیکن آپ نے اپنے ذاتی مطالعہ کی بدولت نہ صرف اُردو فارسی کی اچھی دستگاہ حاصل کی بلکہ شعر و ادب کا بڑا سلجھا ہوا مذاق بھی پیدا کیا۔ اس کا بین ثبوت محترمہ کا وہ ادبی ماہنامہ ''حیا'' ہے جو آپ کی ادارت میں کافی عرصہ تک لکھنؤ سے نکلتا رہا اور حلقۂ نسواں میں بہت مقبول ہوا۔

حیا صاحبہ کو ادبی دلچسپیوں سے قطع نظر تہذیبی و اصلاحی کاموں سے بھی شغف رہا ہے۔ اس سلسلے میں ''زنانہ پارک لکھنؤ'' جہاں ہر ہفتہ خواتین لکھنؤ کا اجتماع ہوا کرتا تھا، سے متعلق آپ کی سرگرمیاں لائق صد ستائش ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ نے بڑی تندھی و خلوص کے ساتھ یہاں شرکت کرنے والی خواتین کی اصلاح و ترقی میں حصہ لیا۔ اس کے ماسوا خواتین لکھنؤ کی اور بھی کئی انجمنیں ایسی تھیں جن کی آپ خاموش مگر وقیع کارکن رہی ہیں۔ محترمہ کی یہ خدمات لکھنؤ میں تقسیم ہند سے پہلے برابر جاری رہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے رفیق حیات چودھری عبدالرحمان صاحب سندیلوی کے ہمراہ لاہور تشریف لے آئیں۔ لیکن یہاں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو ایک ایسے سوہان روح حادثہ سے دو چار ہونا پڑا جس کا اظہار کرتے ہوئے بھی سچ مچ دکھ ہوتا ہے۔ یہ جانکاہ واقعہ آپ کے شوہر عزیز کے انتقال پر ملال کا ہے۔ ظاہر ہے اس مرگ ناگہاں کا اثر حیا صاحبہ جیسی حساس خاتون کے دل پر جتنا بھی پڑا ہو کم ہے۔ اور غالباً یہ اسی واقعہ کا اثر ہے کہ آپ کا کلام عرصہ سے کسی پرچے میں نظر سے نہیں گذرا۔

حیا صاحبہ نے گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے۔ آپ کی سب سے پہلی نظم ''گلاب'' تہذیب نسواں لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اُن کا کلام آئینہ، عصمت، زیب النساء، رومان، حیا، اور دوسرے رسائل میں چھپنے لگا۔ گو آپ نے اپنے کلام کی تدوین کا خیال کبھی نہیں کیا لیکن اس وقت تک آپ نے جو کچھ کہا ہے اگر اسے یکجا کیا جائے تو یقیناً ایک ضخیم مجموعہ کلام تیار ہو سکتا ہے۔ آپ نظم و غزل دونوں کہتی ہیں اور ہر دو اصناف سے پختگی و قدرت کلام ٹپکتی ہے۔ آپ کے ابتدائی اشعار میں تصوف کی جھلک پائی جاتی تھی مگر کچھ ہی دنوں بعد ایسے

اشعار کی آمد ختم ہو گئی اور آپ کے حقیقی رومانی رنگ کا آغاز ہوا ۔ شعر گوئی کے معاملے میں محترمہ حیا کا مسلک بقول حضرت صفی مرحوم،

شاعری کیا ہے ؟ دلی جذبات کا اظہار ہے

رہا ہے ۔ چنانچہ آپ کے کلام کا نمایاں وصف جذبات کی شدت ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے محسوسات کو نہایت خلوص و بے تکلفی کے ساتھ نظم کیا ہے ۔

حیا صاحبہ کی شاعری در حقیقت جذبات محبت کی ترجمانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام پر بحیثیت مجموعی رومانی رنگ چھایا ہوا ہے ۔ اردو شاعری کے دور جدید میں کئی رومانی شاعر پیدا ہوئے لیکن ان میں اختر شیرانی مرحوم ایک امتیازی شان کے مالک تھے ۔ حیا صاحبہ بھی چونکہ رومان پسند شاعرہ ہیں اس لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اختر شیرانی مرحوم کے کلام سے کافی متاثر معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ آن کے کلام میں اختر کی سی نفیس موسیقیت نہیں پائی جاتی تا ہم رنگینئی تخیل اور نزاکت ادا کے اعتبار سے دونوں کا کلام ایک دوسرے سے بہت کچھ قریب ہے ۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپ کے طرز ادا میں بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے ساتھ ہی چونکہ ہماری شاعرہ کو اہل زبان ہونے کا بھی فخر حاصل ہے اس لئے زبان کی جملہ خصوصیات سلاست و روز مرہ، تشبیہات و استعارات وغیرہ آپ کے کلام کے ایک نمایاں جوہر بن گئے ہیں ۔ اور زبان و بیان کی انہی خوبیوں نے مل کر آپ کے کلام کو نہایت کیف آور، وجد آگیں اور مؤثر بنا دیا ہے ۔

غرض کنیز فاطمہ حیا صاحبہ دور جدید کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں ۔ آپ کی شاعری واردات قلبیہ کی آئینہ دار ہے مزیدبرآں چونکہ طرز بیان بھی پختگی و بے تکلفی اور زبان میں سادگی و پاکیزگی پائی جاتی ہے اس لئے آپ کا کلام مجموعی طور پر نہایت بلند و پر کیف واقع ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

چمن وہی ہے گھٹائیں وہی، بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی

ہے دلکشی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیت رنگ و بو نہیں باقی

شباب دھر کی اب بھی ہے وہ فراوانی
مگر خیال میں جوش نمو نہیں باقی
ہے دل میں درد بھی، پہلو میں دل بھی ہے لیکن
کسی کے درد پہ رونے کی خو نہیں باقی
حرم کی شمع فروزاں ہے آج بھی لیکن
تجسسِ نظرِ شعلہ جُو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں حباب اے ''حیا'' اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

نگاہ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرہ ذرہ محبت کا راز داں ہو جائے
پھر اُس کے رنج و غم دائمی کی حد ہے کوئی
جو اس جہاں میں گھڑی بھر کو شادماں ہوجائے
کسی سے کیا گلۂ جور آسماں کیجیے
کہ جس زمیں پہ رہیں ہم وہ آسماں ہوجائے
''حیا'' ٹھکانا بھی کچھ ایسی درد مندی کا
کہ لب تک آئے نہ اک حرف اور فغاں ہوجائے

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف
چاہئیے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں
پھر بہار آئی ہے جی آمڈا ہے یاد دوست میں
دل کرے زاری اور آنکھیں اشکباری ان دنوں
آہ ! یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار
ہو گیا ہے خون دل آنکھوں سے جاری ان دنوں
کیا تقاضا کیجئے اُن سے نگاہ لطف کا
بے نیازی ہے وھاں، یاں سوگواری ان دنوں

نہ ھوتی حال دل کہنے کی جرأت تو اچھا تھا
نہ سنتے کاش وہ شرح غم الفت تو اچھا تھا

مری بیتابی دل بڑھ گئی ہے الاماں کتنی
نکلتی گر نہ شوق دید کی حسرت تو اچھا تھا
وہ راحت بیزیاں ثابت ہوئیں کتنی حباب آسا
کبھی ہوتا نہ اتمام شب فرقت تو اچھا تھا
ہوا کیوں التفات آنکا بڑھا کیوں حوصلہ میرا
نہاں پھولوں میں رہتی آہ گر نگہت تو اچھا تھا
تمنا ہے فزوں ہوں شورشیں جذب محبت کی
دل مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا
رہیں غم کی شرر انگیزیاں یارب قیامت تک
"حیا" غم سے نہ ملتی گر کبھی فرصت تو اچھا تھا

حرف شکایت (غزل مسلسل)

یہ کیا کہ مرے عشق کا چرچا نہیں کرتے
پہلے کی طرح اب مجھے رسوا نہیں کرتے
مکتوب میں اُن کے نہیں کچھ حرف و حکایت
لبہائے حسیں اب مرا شکوہ نہیں کرتے
سو آرزوئیں دل میں تھیں بیتاب تمہارے
کیوں مجھ پہ فدا اب دل شیدا نہیں کرتے
اللہ ری بے مہری و بیگانگئی عشق
اب بھول کے اظہار تمنّا نہیں کرتے
اک شکوۂ شیریں میں گزر جاتے تھے پہروں
اب کیا ہے جو اُلفت کا تقاضا نہیں کرتے
دے دے کے قسم اب نہیں لیتے کوئی وعدہ
خود وعدۂ فردا کو بھی ایفا نہیں کرتے
آنے کی خوشی اور نہ جانے کا کوئی غم
اب رسم محبت کا اعادا نہیں کرتے
ہو جاؤں خفا گر تو مناتے تھے وہ پہروں
اب پھر تسلی کبھی شکوا نہیں کرتے
یہ کیا ہوا اک دم سے جو بدلی نگہِ مہر
کیوں اب نظر شوق سے دیکھا نہیں کرتے

یہ کیا مئے اُلفت میں نہیں جوش ذرا بھی
کیوں میری طرف چشم تماشا نہیں کرتے

اُف ! قصۂ اُلفت کو بس اک وہم سمجھ کر
ٹھکرا دیا ، انسان تو ایسا نہیں کرتے

افسانۂ زرّیں کو پامال بتایا
دل والے ان افسانوں کو بھولا نہیں کرتے

یہ ''قصۂ پارینہ ہے اک خواب پریشاں''
یہ کہہ کے محبت کو مٹایا نہیں کرتے

یہ کیا کہ بھلانے پہ بھی تم دل میں سمائے
اس طرح جلے دل کو ستایا نہیں کرتے

کہتے ہیں تصوّر میں وہ ماضی کی کہانی
کس روز ''حیا'' مجھ کو رلایا نہیں کرتے

منظومات

شوہر کا تحفہ

خدائے حسن مرا پیکر جمال مرا — چراغ حسن مرا مرکز خیال مرا
سرور قلب مرا کیف لا زوال مرا — ہر ایک حال میں تنہا شریک حال مرا
اسی کے دم سے ہے راحت دل حزیں کیلئے
اسی کے در کے ہیں سجدے مری جبیں کیلئے

وہ اپنی پاک محبت کا زندہ افسانہ — وہ اپنی شمع حرم کا اسیر پروانہ
نشاط روح کا وہ حسن سحر کارانہ — وہ اپنے جلوۂ پنہاں سے آپ بیگانہ
وہ گلستاں بکنار و بہار در آغوش
وہ جان میکدہ و لالہ زار در آغوش

وہ کہکشان مرصع کے تار لایا ہے — متاعِ نور مہ زرنگار لایا ہے
وہ سلک گوہر تازہ بہار لایا ہے — دُرِ خوش آب کا خوشرنگ ہار لایا ہے
بہشت حسن کی تنویر جس کا ہر موتی
بہار خلد کی تصویر جس کا ہر موتی

یہ ہار اُلفت باقی کی یادگار حسیں　　یہ ہار عقد ثریا کی سلک خوش آئیں
کسی کے رشک مسرّت کا تحفۂ رنگیں　　کسی کے نقش محبت کا لا زوال نگیں
شعاع مہر منور سے جس کا رشتہ ہے
مرے حسین مقدر سے جس کا رشتہ ہے

گلے کا ہار ہے یا شرح مدعا ہے یہ　　مرا انیس شبستان پر ضیا ہے یہ
سفینۂ دل مضطر کا نا خدا ہے یہ　　سکون قلب کا اک نسخۂ شفا ہے یہ
ادائے حسن پہ صد جلوۂ خجل قرباں
یہ آرزو ہے کروں اس پہ جان و دل قرباں

رفیق جاں ہے یہ معصوم الفتوں کیلئے　　حریم دل ہے مرا اس کی عظمتوں کیلئے
یہ نذر شوق ہے میری مسرتوں کیلئے　　یہ کار ساز غم دل ہے راحتوں کیلئے
ہے جسکی دید سواد نظر کی اک تصویر
یہ تحفہ آسکی وفاؤں کی معنوی تفسیر

ضیائے سلک پہ صد جلوۂ بتاں صدقے　　مرا خیال تصدق، مری زباں صدقے
''حیا'' تمام محبت کی داستاں صدقے　　یہ کائنات ہو قرباں، دو جہاں صدقے
رہے یہ دل کے قریں آس کا دلنشیں تحفہ
نوید عیش فراواں بنے حسیں تحفہ

اقرار محبت

آن کا اصرار ہے اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو
کہتے ہیں نذر محبت دل بیمار کرو
جان محزوں کو رہین غم و آزار کرو
غم کا اقرار کرو عشق کا اظہار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

آپ غیروں میں رہیں پاس نہ آنے کو کہیں
پاس آئیں نہ کبھی ہم کو بلانے کو کہیں
گر کبھی بات کہیں وہ بھی رلانے کو کہیں
خود ستائیں ہمیں غیروں سے ستانے کو کہیں
پھر تقاضا ہے کہ اُلفت کا تم اقرار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

حکم یہ ہے کہ کسی غیر سے بولا نہ کریں
جس سے تکلیف اُنھیں پہنچے ہم ایسا نہ کریں
سب سے روپوش رہیں اُن سے ہی پردہ نہ کریں
غیر کو خط نہ لکھیں غیر کا چرچا نہ کریں
اُن کا اصرار ہے تم عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

جی میں حسرت ہے سنائیں اُنھیں افسانہ غم
کبھی موقع ملے سب کچھ ہی کہیں اُنکی قسم
لیکن آتے نہیں سنتے نہیں رو داد الم
کتنے مجبور ہیں بتلائیں یہ ہے کیسا ستم
اس پہ طرہ ہے کہ اُلفت کا بھی اقرار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

راز اُلفت کا بہت دن سے چھپا رکھا تھا
درد کو اپنے کلیجے سے لگا رکھا تھا
جذبۂ عشق کو سینے میں دبا رکھا تھا
غم کا اظہار قیامت پہ اُٹھا رکھا تھا
بے حد اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رات دن ہمکو رلاتے ہیں الٰہی توبہ
اپنی فرقت میں ستاتے ہیں الٰہی توبہ
خواب اُلفت کا دکھاتے ہیں الٰہی توبہ
ایسی باتیں وہ بناتے ہیں الٰہی توبہ
پھر بھی تکرار ہے اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

راز اُلفت کا ہماری نہ کھلا تھا جب تک
درد دل کا بھی نہ اظہار ہوا تھا جب تک
ہم نے حال دل مضطر نہ کہا تھا جب تک
اس قدر سوز دروں بھی نہ بڑھا تھا جب تک
اُن کا اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

چین لوٹا غم و آلام سکھایا ہم کو
مضطرب دن کو کیا شب کو رلایا ہم کو
ھجر میں ایک گھڑی چین نہ آیا ہم کو
خواب میں بھی کبھی جلوہ نہ دکھایا ہم کو
پھر بھی کہتے ھیں کہ اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ھمیں چاھو ھمیں تم پیار کرو
ایسے بے رحم ھیں انصاف کا بھی پاس نہیں
مہر کی ذرہ برابر بھی تو بُو باس نہیں
ایسی بے مہری پہ بھی دلکو مرے یاس نہیں
اب بھی آجائیں کہ جینے کی کوئی آس نہیں
اور خود آ کے کہیں عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ھمیں چاھو ھمیں تم پیار کرو

ایسے میں

سحر کے جھٹپٹے میں جب پرندے چہچہاتے ھیں
مناظر صبح کے جس دم رسیلے راگ گاتے ھیں
بہاروں کے جلو میں دلربا نغمے لٹاتے ھیں
حسیں غنچے چمن میں صبحدم جب مسکراتے ھیں
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

شفق جب جھانکتی ھے دامنوں سے کوھساروں کے
فضا میں تھرتھراتے ھیں ترانے آبشاروں کے
ھوا میں تیرنے لگتے ھیں نقشے جوئباروں کے
بیاباں جب بدل لیتے ھیں چولے سبزہ زاروں کے
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

پری قوس قزح کی آسماں پر جب سنورتی ھے
ادائے دلبری سے رنگ کے سانچوں میں ڈھلتی ھے
صبا کے مشکبو جھونکوں سے نکہت ٹوٹ پڑتی ھے
بہار آ کر چمن کی جب گلوں سے مانگ بھرتی ھے
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ھیں

کنار آب کا نظارہ جب مدھوش ہوتا ہے
درخشاں ریت کا میدان جب زر پوش ہوتا ہے
کنول آب رواں کی زینت آغوش ہوتا ہے
حسیں لہروں کے دل میں جذبۂ پرجوش ہوتا ہے

تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

خنک راتوں کی بھینی بھینی جب مہکار ہوتی ہے
ستاروں کی نظر جب واقف اسرار ہوتی ہے
کسی شاعر کی چشم روح جب بیدار ہوتی ہے
مرے پندار کے تاروں میں جب جھنکار ہوتی ہے

تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

پیغام عمل

اٹھیں پھر فصل گل میں آرزوؤں کو جواں کردیں
چلیں پھر بلبلوں کو آشنائے گلستاں کردیں
حوادث کے خس و خاشاک میں پیدا دھواں کردیں
زمانے بھر پہ اپنی شعلہ سامانی عیاں کردیں
چمن زادان خوش آواز کب تک چپ رہیں آخر
تقاضا ہے یہ فطرت کا انہیں پھر نغمہ خواں کردیں
بہت خواب گراں میں سو چکے اب وقت آیا ہے
کہ اپنی عقل و دانش کو ہم اپنا پاسباں کردیں
ثبوت زندگی دینا ہے پھر تہذیب حاضر کو
ہماری کوششیں پھر اس زمیں کو آسماں کردیں
اگر دنیا میں رہنا ہے تو یوں دنیا پہ چھا جائیں
کہ اپنے ہر عمل کو زندگی کا ترجماں کردیں
ضرورت ہے کہ ہم بیدار ہو کر درد قومی سے
بدل دیں فطرت غم، ختم یہ آہ و فغاں کردیں
سرشک بے بسی ٹپکے ہیں جن بے لوث آنکھوں سے
ستاروں کی طرح اُن موتیوں کو ضوفشاں کردیں

سنا دیں غنچہ و گل کو حکایت پائمالی کی
نگاہ نغمۂ فطرت کو اپنا راز داں کردیں

ترقی کے منازل چومتے ہیں پائے ہمت کو
اٹھائیں یوں قدم اک موج بیداری رواں کردیں

وہ پابندی جو سکھلا دے ہمیں بے لوث قربانی
نثار اس قید پر ہم سینکڑوں آزادیاں کردیں

شگوفے اب تو علم با عمل کے کھلنے والے ہیں
ہوائے ذوق سے بیدار روح گلستاں کردیں

نہیں ہے اس سے بہتر افتخار خدمت قومی
مٹیں تو یوں کہ مٹنے کو حیات جاوداں کردیں

''حیا'' مرکز رہا ہے لکھنو علم و تمدن کا
نہ کیوں نور عمل سے بھی اسے ہم ضوفشاں کردیں

صفیہ شمیمؔ

محترمہ صفیہ، متخلص بہ شمیم، عصر حاضر کی نامور شاعرہ ہیں - آپ کی ولادت ۲۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو ملیح آباد (مضافات لکھنؤ) کے ایسے گھرانے میں ہوئی جو معزز و مقتدر ہونے کے علاوہ نہایت با ذوق گھرانا تسلیم کیا جاتا ہے اور جس میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی ہے - چنانچہ شمیم صاحبہ کے مورث اعلیٰ، حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا سے لے کر اُن کے پرنانا نواب محمد احمد خاں احمد تعلقدار کسمنڈی اور نانا نواب بشیر احمد خاں تعلقدار ملیح آباد تک کوئی بزرگ ایسا نہیں ہے جو صاحب دیوان شاعر نہ ہو - پھر سب سے آخر میں محترمہ کے حقیقی ماموں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی تو دور حاضر کے اُن چوٹی کے شعرا میں سے ہیں جن کے پختہ آرٹ اور جوان نغموں نے ادبی حلقوں میں اپنا سکہ بٹھا رکھا ہے - غرض اس خاندانی تعلق کی موجودگی میں شمیم صاحبہ کا ذوق شعری بجا طور پر موروثی کہلانے کا مستحق ہے -

صفیہ شمیم صاحبہ کا قیام عموماً لکھنؤ میں رہا - یہیں آپ نے چند سال مسلم گرلز اسکول میں تعلیم پائی اور اس کے بعد گھر پر شوق علم پورا کرتی رہیں اور یہیں اُنہیں وہ ادبی صحبتیں نصیب ہوئیں جن کی بدولت اُن کا فطری شاعرانہ مذاق پروان چڑھا - تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے رفیق حیات کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئیں - آج کل آپ کا قیام راولپنڈی میں ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ فکر شعر برابر جاری ہے چنانچہ پاکستان کے چند معیاری رسائل ''ماہ نو''۔ ''ساقی'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے -

صفیہ صاحبہ نے دس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا - اس طرح اب اُن کی شاعری کی عمر کم و بیش ایک ربع صدی کی ہو چکی ہے - اتنی مدت تک فکر سخن کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ اُردو شاعرات میں اُنہوں نے نہایت وقیع و اہم مقام حاصل کر لیا ہے - وہ حضرت جوش ملیح آبادی کے رنگ سے خاصی متاثر ہیں اور اُن کے یہاں اس عظیم شاعر کے فن کی بعض خصوصیات بڑے نمایاں انداز میں جلوہ گر نظر آتی ہیں لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ جوش صاحب سے اتنی قربت کے باوجود اُن کا تاثر تمام تر غیر شعوری ہے اور خود محترمہ کے بقول جوش صاحب نے اُن کے ایک شعر کو بھی کبھی تنقیدی نظر سے نہیں دیکھا اور مشورہ، سخن کے معاملے میں ہمیشہ اُن کی مصروفیت حائل رہی -

محترمہ شمیم غزل، نظم، رباعی غرضکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خوب کہتی ہیں - آپ کے کلام کا نمایاں وصف محاکات کا حسن ہے - اس

سلسلہ میں آپ بھی جوش صاحب کی طرح نازک، لطیف، اور اچھوتی تشبیہات استعمال کرتی ہیں، بالخصوص مناظر فطرت کی تصویر کشی میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ مظاہر قدرت کو زیادہ جاندار، زیادہ دلکش اور زیادہ مؤثر بنانے کے لئے آپ اکثر ان کی لفظی تصویروں میں لطیف جذبات انسانی کا رنگ بھرتی ہیں لیکن اس پچیدہ اور دشوار فن میں آپ کو جیسا عبور حاصل ہے وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس خوبی کے علاوہ آپ کے کلام میں عام طور پر حقیقی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ اور یہ جذبات چونکہ شدید، عمیق اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے آپ کے اشعار زندگی سے زیادہ قریب اور نہایت مؤثر ہوتے ہیں۔

صفیہ شمیم کو تغزل سے فطری لگاؤ معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام کی مجموعی فضا رومانی ہے۔ محبت کا ابدی نغمہ آپ کے یہاں کچھ ایسے والہانہ اور پر کیف انداز میں دھرایا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان موضوعات سے قطع نظر آپ نے زندگی کے گہرے مسائل پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور اس ضمن میں اُن کے یہاں انسانی عظمت، ملک و قوم کی زبوں حالی اور اہل وطن کی خستگی و نکبت وغیرہ کے نقوش اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن بلا شبہ ان کی حیثیت ثانوی ہے کیونکہ ہندی نغمے تو وقت کے ہاتھوں نعرۂ مومن میں بدل سکتے ہیں مگر محبت کا راگ ایک ایسا راگ ہے جو زمان و مکان کے تغیر سے یکسر آزاد ہے۔

محترمہ شمیم کا اسلوب بیان نہایت ستھرا اور نکھرا ہوا ہے، اُنہیں اہل زبان ہونے اور زندگی کا بیشتر حصہ خاص لکھنؤ میں گزارنے کی وجہ سے الفاظ و محاورات کا عمدہ انتخاب اور بر محل استعمال خوب آتا ہے۔ اس کے ماسوا اُنہیں نہایت لطیف، رقصاں اور زندگی سے بھرپور تشبیہات کے برتنے کا بھی بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ مختصر یہ کہ صفیہ شمیم صاحبہ کا کلام زبان و بیان کی جملہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اور باوجودیکہ اُن کی شاعری ابھی ارتقائی منزل میں ہے اُن کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ موجودہ اُردو شاعرات میں صف اول کی شاعرہ ہیں۔

انتخاب کلام

تغزل

گرہے نئے نظام کی تخلیق کا خیال
آبادیوں کو نذر بیاباں تو کیجئے

گر جلوۂ جمال کی دل کو ہے آرزو
اشکوں سے چشم شوق چراغاں تو کیجئے

ہونا ہے درد عشق سے گر لذت آشنا
دل کو خراب تلخئی ہجراں تو کیجئے

اک لمحۂ نشاط کی گر ہے ہوس "شمیم"
دل کو ہلاک حسرت و ارماں تو کیجئے

دے موت ہی شاید غم ہستی سے رہائی
ہستی تو ہے اک صورت زنداں مرے آگے

یہ وضعداریٔ اہل وفا کوئی دیکھے
گلے تو رکھتے ہیں لیکن زباں نہیں رکھتے
نہ لطف برق سے واقف نہ زور طوفاں سے
جو بد نصیب کوئی آشیاں نہیں رکھتے

کر دیا باد خزاں نے خاک سارا گلستاں
لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لئے

اے ہمنشیں نہ چھیڑ حکایات رنگ و بو
مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو

مرے چمن کے نصیبوں میں گر بہار نہیں
تو اس کو ہدیۂ برق و شرار ہی کر دے
وفا نہ ہو نہ ہو، وعدہ تو کرے آنے کا
مجھے رہین غم انتظار ہی کر دے

بہاریں آئیں بھی اور ہوگئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی
کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

وہ حسرت بہار نہ طوفان زندگی
آلام و غم کے تند حوادث کے واسطے
جب زندگی کا موت سے رشتہ ہے منسلک
جب ربط و ضبط حسن محبت نہیں رہا
رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ مگر "شمیم"

آتا ہے پھر رلانے کو ابر بہار کیوں
اتنا لطیف دل مرے پروردگار کیوں
پھر ہمنشیں ہے خطرۂ لیل و نہار کیوں
ہے بار دوش ہستئ ناپائدار کیوں
اس کا گلہ ہے آئی چمن میں بہار کیوں

اہل خرد! تلطف یزداں کے باوجود
بیچارگئی حضرت انساں نہ پوچھئے
وقت سفر تسلئی پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے
چہرہ عرق عرق، وہ ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھئے
فرصت سی ہو گئی ہے غم روزگار سے
کیا کیا ہیں دل میں حسرت و ارماں نہ پوچھئے

ہم سے زندہ ہے گلستان دب گو خراب بہار ہیں ہم لوگ
اک بجھا سا چراغ حسرت ہیں اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ

رہ رہ کے اُمنڈ رہے ہیں آنسو یہ دل سے کسے بُھلا رہے ہیں
بے چین ہیں بجلیاں فلک پر گلشن ہیں کہ مسکرا رہے ہیں

مجھے گماں نہ ہوا اُن کی بے نیازی کا
کچھ اس ادا سے وہ بیگانہ وار گزرے ہیں
ہر ایک گام پہ راہ وفا میں تھے کانٹے
گزرنے والے مگر لاکھ بار گزرے ہیں
نہ پوچھ منزل ہستی کی بے بسی ہم سے
ادھر سے گزرے ہیں جو اشکبار گزرے ہیں
روش روش پہ چھڑی ہے حدیث لالہ و گل
چمن سے کیا وہ نسیم گزرے ہیں!

شمع امید جلا بیٹھے تھے دل میں خود آگ لگا بیٹھے تھے
ہوش آیا تو کہیں کچھ بھی نہ تھا ہم بھی کس بزم میں جا بیٹھے تھے
دشت گلزار ہوا جاتا ہے کیا یہاں اہل وفا بیٹھے تھے
اب وہاں حشر اُٹھا کرتے ہیں کل جہاں اہل وفا بیٹھے تھے

اللہ ری بے نیازئی آشفتگان شوق　　دامن بچا کے دیر و حرم سے گزر گئے

کچھ خبر ہو نہ سکی تیرے بغیر　　کب خزاں آئی کب بہار آئی

وہ بھی دل پر گزر گیا عالم　　دل میں طوفان اشک، لب پہ مہرِ سکوت

زندگی کی بدل گئی صورت　　غم سے جب سے ہوئی شناسائی

بے خبر، منزل مقصود نہیں دور مگر　　عالم ہوش سے ہستی کو گزر جانے دے

ٹھہر اے باد خزاں، ایک نفس کی مہلت　　رنگِ گلشن کو ابھی اور نکھر جانے دے

اک نگاہ کرم کی حسرت میں　　زندگانی گزار دی ہم نے

بجھی بجھی سی سہی شمع زندگی، لیکن
ضمیر عشق میں سرمایۂ شرار ہیں ہم
بایں کشا کش حرماں، بایں غم دوراں
کسی کے چشم کرم کے امیدوار ہیں ہم

کربِ تمام بن گئیں روح کی بے قراریاں
عالم جاں گداز ہے آن کا سکوت دل نواز
نبض جہاں رکی ہوئی شمع سحر بجھی ہوئی
پچھلے پہر نہ پوچھئے کیفیت شکستِ ساز
ارض و سما کی وسعتیں جس میں سما کے رہ گئیں
کون سمجھ سکے ''شمیم'' اس دل بے نوا کا راز

آمیدیں مٹ گئیں اب ہم نفس، کیا نشیمن کی خوشی، رنج قفس کیا
بسر کانٹوں میں ہو جب زندگانی بہار خندۂ گل یک نفس کیا
مری دیوانگی کیوں بڑھ رہی ہے بہار آئی چمن میں ہم نفس کیا
نہ ہو جب رنگ آزادی چمن میں تو پھر اندیشۂ قید قفس کیا
بہار نو کی پھر ہے آمد آمد چمن اجڑا کوئی پھر ہم نفس کیا

شمع حسرت جلا گئے آنسو رونق دل بڑھا گئے آنسو
ضبط غم کی شکستگی مت پوچھ اُن کی آنکھوں میں آ گئے آنسو
آ گئی کام دل کی بے تابی خلش غم بڑھا گئے آنسو
تھم گئے جب فراق میں نالے دل میں طوفاں اُٹھا گئے آنسو
جس کو دل سے لگا کے رکھا تھا وہ خزانہ لٹا گئے آنسو
کیا قیامت تھی پردہ دارئ غم مسکراتے ہی آ گئے آنسو

منظومات

ملکہ صبح

آ رہی ہے صبح کی ملکہ وہ بل کھاتی ہوئی
صبح کا خاموش نغمہ زیر لب گاتی ہوئی
نور کے زرّیں سمندر میں ڈبوتی کائنات
آ رہی ہے صبح، رُخ سے زلف سرکاتی ہوئی
جھاڑیوں سے جھانکتی، شاخوں سے اٹھلاتی ہوئی
آ رہی ہے تاج پہنے صبح بل کھاتی ہوئی
ہر شجر کی چوٹیوں کو جگمگاتی، جھومتی
آ رہی ہے صبح سیمیں، نور پھیلاتی ہوئی
نہر کی خوابیدہ موجوں کو جگاتی، چھیڑتی
آ رہی ہے صبح، دل کلیوں کے چٹکاتی ہوئی
نہر سے آنکھیں لڑاتی، تھر تھراتی، کودتی
آ رہی ہے ہر قدم پر ناز فرماتی ہوئی

اہل عالم کو پیام زندگی دیتی ہوئی
نا امیدوں کو خوشی کے خواب دکھلاتی ہوئی
محفلِ گلشن کو دیتی صبح بیداری کا حکم
قطرۂ شبنم کو ضو سے اپنی جھلکاتی ہوئی
کھیتیوں پر برق کی سی لہر دوڑاتی ہوئی
ولولے دل میں اٹھاتی زیر لب گاتی ہوئی
خامشی کا تار ٹوٹا چھڑ گئے نغمے نئے
محفل صحرا میں آئی صبح، بل کھاتی ہوئی
لہر موسیقی اٹھاتی گلشن خاموش میں
آ رہی ہے صبح راگ زندگی گاتی ہوئی

جھاڑیوں سے مسکراتی آ گئی صبح بہار
پھر ''شمیم'' مبتلا کی روح چونکاتی ہوئی

برسات کی چاندنی رات

یہ برشگال کی برسی ہوئی سنہری رات
یہ بوئے عود سے مہکی ہوئی سنہری رات
یہ چاندنی، یہ فضائیں یہ وادیوں کی بہار
کہاں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار
یہ زرنگار فضائیں یہ جوش نکہت و نور
زمیں ہے وجد میں، طاری ہے آسماں پہ سرور
یہ چاندنی یہ چٹکتے ہوئے سبک غنچے
یہ بوئے عود سے مہکے ہوئے خنک جھونکے
جبین ناز ہے روشن عروس فطرت کی
ہوائیں چلتی ہیں گلشن میں باغِ جنت کی

یہ جوش حسن، فروغ بہار، کیا کہنا
یہ چاندنی یہ لب جوئے بار کیا کہنا

نعرۂ مومن

مرے بازو میں ہے زور خدائی غرور خواجگی میری گدائی
مرے سینے میں روشن شمع عرفاں مری ہستی فروغ بزمِ ایماں

فراز آدمیّت میری منزل مری ہیبت سے شق ہے قلب باطل
مری ہستی چراغ بزم آدم مرے آئینے میں حسن دو عالم
مرا نقش قدم راہ سعادت میں نور آگہی، صبح حقیقت
مری دنیا ھجوم برق و باراں مری ہر سانس موج جوش و طوفاں
فلک پر جھومتا ابر رواں ہوں زمیں پر موج بحر بیکراں ہوں
مجھے حاصل حیات جاودانی مری ٹھوکر میں فتح و کامرانی
مزاج آب و گِل تولا ہے میں نے نقاب زندگی کھولا ہے میں نے

سراپا سوز و ساز عاشقی ہوں
امانت دار نورِ آگہی ہوں

شاعرہ کی موت

زیست میری جب فنا کی گود میں سو جائے گی
جب متاع زندگی اے ہمنشیں کھو جائے گی
موت کے ھاتھوں اُجڑ جائے گا جب باغ حیات
روح غم دنیا کے اندیشوں سے پائے گی نجات
منہ پہ جب احساس کے پڑ جائے گی کالی نقاب
آرزوؤں کا مری جب ٹوٹ جائے گا رباب
سانس کا جب ٹوٹ جائے گا یہ رنگیں سلسلہ
قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

انجمن پھولوں کی ہوگی نوحہ خواں میرے بغیر
ہوگی دیوی صبح کی حسرت فشاں میرے بغیر
ہر خس و خاشاک میں جب تازگی آ جائے گی
عارض قدرت پہ مایوسی سی اک چھا جائے گی
یاس آ گیں راگنی تالاب کی ہو جائے گی
ہنسنے والی ہر کلی مایوس سی ہو جائے گی
چشم باراں خوں کے آنسو شب کو جب ٹپکائے گی
روح میری آسمانوں پر بہت گھبرائے گی

نور سا روئے شفق کا دیکھنا اُڑ جائے گا
میرے بِن کوئل کا دل گھبرائے گا اکتائے گا

صبح کی چڑیاں جگانے کو بہت چلّائیں گی
دیکھ کر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی

پھول فرقت میں مری ہو جائیں گے خستہ خراب
کھائے گی ہر شاخ میرے نام پر یوں پیچ و تاب

چاک دامانی کرے گی میرے بِن حورِ نسیم
خاک اُڑائے گی مری فرقت میں پھولوں کی شمیم

جستجو میں میری آوارہ پھرے گا ماھتاب
میرے بِن تارے فلک پر ہوں گے غرق اضطراب

روئیں گی شبنم کی لڑیاں میرے غم میں زار زار
ذکر سے میرے نگار شب کو ہوگا اضطرار

قبر پر میری عجب دھومیں مچیں گی صبح و شام
گائیں گے بیدار کرنے کو طیور خوش کلام

میری فرقت میں دوانی تتلیاں ہو جائیں گی
منتشر فرش زمیں پر تتلیاں ہو جائیں گی

سسکیاں لیں گی مری تربت پہ زندہ حسرتیں
روئیں گی فرقت میں میری گلشنوں کی رونقیں

جب بھری برکھا میں سب مل کر ترانے گائیں گی
شوخیاں میری بہت سکھیوں کو یاد آ جائیں گی

میری اُلفت خیز باتوں کو بہت ترسیں گے کان
پر نہ پائے گا کوئی میری محبت کا نشان

باغ سے آئے گی جب غمگیں پپیہے کی پکار
یاد آ جائے گی سکھیوں کو مری، بے اختیار

جب کہانی ہوگی جاڑوں کی سنہری رات میں
یاد کر لیں گی مری سکھیاں مجھے ہر بات میں

جشن رنگیں ہوں گے جب دھومیں مچیں گی بے پناہ
یاد میں میری نکل جائے گی سب کے منہ سے "آہ"

موسم باراں میں ہر سو حسن جب چھا جائے گا
ساتھ اشکوں کے مرا سب کو خیال آ جائے گا

نوحہ خواں بزم صحافت ہوگی میرے ہجر میں
ہوگا اک طوفاں بپا ہندوستاں کے بحر میں
سبزۂ علم و ادب کچھ زرد سا ہو جائے گا
شاعری کا کچھ دنوں جیسے مزا کھو جائے گا
پر الم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر
مشرقی بہنیں مری فرقت میں ہوں گی نوحہ گر
ذکر میرا جب کبھی بزم سخن میں آئے گا
ایک نشتر سا دلوں میں دفعتاً چبھ جائے گا
شاعری کی بزم ہو جائے گی غمگیں، بے قرار
لکھنوی بہنیں مری فرقت میں ہونگی سوگوار
آئیں گے جب آسماں پر بادلوں کے قافلے
یاد اہل ذوق کو آئیں گے میرے زمزمے
ہوگی فطرت غرق گریہ نوحہ خواں میرے لئے
کچھ دنوں تک روئے گا ہندوستاں میرے لئے
ایک دن پھر من چلی دنیا کو صبر آ جائے گا
قصر امیدوں کا اک تازہ بنایا جائے گا

رباعیات

دل وقت کے دھارے میں بہا جاتا ہے
ماضی کا ہر اک نقش مٹا جاتا ہے
رنگینئی فطرت سے ہر اک لمحۂ زیست
فردوس کا اک خواب ہوا جاتا ہے

کیوں درد کو درماں سے نہ بڑھ کر سمجھوں
کیوں اشک تمنا کو نہ گوہر سمجھوں
یہ لذت روح ہے وہ تسکین حیات
کیوں غم کو مسرت سے نہ بہتر سمجھوں

اٹھ دولت عزّ و جاہ مل جائے گی
منزل گہہ مہر و ماہ مل جائے گی
کر اوج نگاہ و دل میں پیدا غافل
عرفان خودی کی راہ مل جائے گی

کج فہموں پہ یہ لطف و عنایت یا رب
ہو علم پہ جہل کی حکومت یا رب
فاقوں سے زبوں حال ہوں اہل دانش
نا اہلوں پہ یہ بارش دولت یا رب

کیا عقدۂ شعر کھول سکتا ہے کوئی
دربار سخن میں بول سکتا ہے کوئی
نقاد سخن سے کوئی جا کر پوچھے
کیا بوئے سمن کو تول سکتا ہے کوئی ؟

جو بات یہاں ہوئی مدلل نہ ہوئی
مجمل ہی رہی کبھی مفصل نہ ہوئی
دنیا نے ہزار رنگ بدلے، لیکن
تصویر یہاں کوئی مکمل نہ ہوئی

ہر ذرے کی حسرت ہے قمر بن جاؤں
ہر شب کی تمنا ہے سحر بن جاؤں
اللہ رے اضطراب قلب گیتی
ہر قطرے کو ارماں ہے گہر بن جاؤں

اٹھی وہ گھٹا، باد بہاری آئی
پھر آئی، وہ فصل بے قراری آئی
لائی ہے صبا نکہت زلف جاناں
آنکھوں کو نوید اشکباری آئی

جدید شعرائے اردو

اُردو شاعری کے ابتدائی دَور سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک ہماری شاعری کا محور محبوب کے لب و رُخسار ہی رہے۔ غالب نے اگرچہ اس میں نئی نئی راہیں نکالیں لیکن جدید اُردو شاعری کی بُنیاد **مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی** کے ہاتھوں رکھی گئی۔ حالی نے قومی شاعری کی اور مولانا آزاد نے ایک بُلند پایہ اِنشا پرداز ہونے کے ساتھ نیچرل شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ ہماری شاعری اب تک اِس سے متاثر چلی آ رہی ہے۔

آج ہماری شاعری برائے شاعری نہیں، بلکہ برائے زندگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اِس دَور میں کچھ نئے موڑ بھی آئے اور طبائع ان سے اثر پذیر بھی ہوئیں۔ مغربی تاثر قبول کیا گیا نظمِ معرّیٰ اور بے قافیہ و ردیف نظمیں لکھی جانے لگیں۔ لیکن ان سب میں وہی تیر و نشتر موجود ہیں جو ہماری روزمرّہ زندگی کو صحیح زندگی بنانے کے ضامن ہیں۔

جدید شعرائے اردو

ہماری شاعری کی ایک ایسی تاریخی داستان ہے جس کے مطالعے سے اُردو شعرا کے تدریجی ذہنی ارتقا کا اندازہ ہو سکے گا۔

کتاب کو، غیر معمولی ضخامت کے پیشِ نظر، چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- مُتقدّمین
- مُتوسّطین
- مُتاخّرین
- نئی پود

اور ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمّل اور سیر حاصل مواد مطالعہ پیش کرتا ہے۔